رسائل و مسائل

حصہ ہشتم

مولانا عبدالمالک

ادارہ معارف اسلامی

رسائل و مسائل

حصہ ہشتم

شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک

ادارہ معارف اسلامی
منصورہ — لاہور

فہرست

عرض ناشر	۹
پیش لفظ	۱۲

باب اوّل: تفسیرِ آیات وتاویلِ احادیث

قرآن میں لفظ قصہ	۱۸
آیتِ تطہیر اور آیتِ مودّہ	۱۹
لفظِ نحر کے معنی	۲۵
عقیق کی انگوٹھی	۲۷
'ولو بالصین' کی تحقیق	۲۸
حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح	۲۹

باب دوم: عقائد وایمانیات

لفظِ خدا کی شرعی حیثیت	۳۳
الوہیت وعبدیت	۳۹
'محمد' نام رکھنا	۴۳
حقیقتِ محمدیہ	۴۷
گناہ اور مغفرت	۴۸
عہد نامہ	۵۶
مرزا قادیانی کے دعوے	۶۰
اسلامی تصوّرِ معرفت	۶۴
امام مہدی	۶۸

باب سوم: نماز

سفر میں نمازِ قصر	۷۱
وطنِ اصلی یا وطنِ اقامت	۷۱
شمالی یورپ میں نماز روزے کا مسئلہ	۷۲
فجر کی سنتیں	۷۳
مسجد میں نماز جنازہ	۷۴
احناف کا مسلک	۷۵
فوت شدہ نمازوں کی قضا	۷۶
تراویح کی رکعات	۷۶
تراویح اور تہجد کا فرق	۷۸
قنوتِ نازلہ	۷۹
بریلوی مسلک کے امام کے پیچھے نماز	۸۱
بے داڑھی شخص کی امامت	۸۲
صحیح قرآن نہ پڑھنے والے امام کے پیچھے نماز	۸۵
مشرک کے پیچھے نماز	۸۶
نماز کی قضا	۸۸
صلوٰۃ التسبیح باجماعت	۸۹
نماز میں گریہ وزاری اور ریا	۹۰
مجبوری کی بنا پر جمع بین الصلاتین	۹۳
غائبانہ نماز جنازہ	۹۵
صاحبِ ترتیب کی قضا نماز	۹۵
نماز میں سورتوں کی ترتیب	۹۶

باب چہارم: روزہ

رؤیتِ ہلال	۹۸
روزے میں اِن ہیلر کا استعمال	۱۰۰
انجکشن کا مسئلہ	۱۰۰

ہفتے کے دن روزہ رکھنا ۱۰۱
روزے کا فدیہ ۱۰۲

باب پنجم: حج و قربانی

بالغ بچے کا حج ۱۰۴
حج بدل، جہاد فنڈ یا خدمتِ خلق ۱۰۴
فریضۂ حج اور حجِ بدل ۱۰۶
حالتِ عدت میں حج ۱۰۷
غیر محرم کے ساتھ حج ۱۰۸
سرکاری خرچ پر حج ۱۰۹
قربانی کے جانوروں کی عمریں ۱۱۲
اجتماعی قربانی میں نیت کا مسئلہ ۱۱۶
قربانی کی کھالیں اور خدمتِ خلق ۱۱۸
قربانی کا گوشت ۱۱۹
قربانی کا وجوب ۱۲۰
عورت کا قربانی کرنا ۱۲۱

باب ششم: زکوٰۃ

زکوٰۃ کے بعض مسائل ۱۲۳
مصارفِ زکوٰۃ ۱۲۴
ائمۂ اربعہ کا مسلک ۱۲۵
زکوٰۃ اور تاوان کی ادائیگی ۱۲۷
چند مسائلِ زکوٰۃ ۱۲۸
طویل عرصے کی زکوٰۃ کا تعین ۱۳۰
زکوٰۃ سے 'آئی کیمپ' کا انعقاد ۱۳۱
زکوٰۃ کی رقم سے سرمایہ کاری ۱۳۳
بنک سے زکوٰۃ کی ادائیگی ۱۳۳
زکوٰۃ میں رشتہ داروں کا حق ۱۳۵
عشر کے جدید مسائل ۱۳۷
مزید وضاحت ۱۳۹
کرایے کے مکان پر زکوٰۃ ۱۴۱
زیور کی زکوٰۃ ۱۴۲

باب ہفتم: معاشی مسائل

سودی قرضے ۱۴۴
سیونگ سرٹیفیکیٹ کا سود ۱۴۵
بنک کا سود ۱۴۶
متعین منافع ۱۴۷
قسطوں پر خرید و فروخت ۱۴۸
روپے کی قیمت میں کمی بیشی اور ادائیگیِ قرض ۱۴۹
منافع یا سود! ۱۵۰
حرام مال کا اصل مصرف ۱۵۱
بانڈز کی شرعی حیثیت ۱۵۲
بنک میں شراکتی کھاتہ ۱۵۳
سود کی مجبوری ۱۵۴
مقروض کا صدقہ ۱۵۵
سود سے پاک قرض اسکیم ۱۵۶
نقد اور ادھار قیمت میں فرق ۱۵۸
مکان کی خریداری پر سود ۱۵۹
ٹریکٹر کے لیے بنک سے قرض ۱۶۰
بولی والی کمیٹی ۱۶۲
کرنسیوں کا اختلاف اور ادائیگیِ قرض ۱۶۳
سود اور مجبوری کی حالت ۱۶۵
سودی ادارے میں مُلازمت ۱۶۸
قرضِ متبادل پر مبنی سکیم ۱۶۹
بنک ملازمت ۱۷۱
زرسالانہ کی پیشگی وصولی ۱۷۲

رشوت اور مسئلۂ اضطرار ۱۷۳
کم قیمت پر جبراً خریداری ۱۷۶

باب ہشتم: معاشرتی مسائل

ایک گھریلو الجھن ۱۷۸
جہیز کی مسنون صورت ۱۸۰
رسومات میں غیر اسلامی امور ۱۸۲
مشترکہ خاندانی نظام ۱۸۴
جہیز اور وراثت ۱۸۷
مہر کا استحقاق ۱۸۹
تنسیخ نکاح ۱۹۰
مسئلۂ طلاق ۱۹۱
ناروا پابندیاں اور طلاق ۱۹۳
لے پالک بچے کی ولدیت ۱۹۵
ازدواجی زندگی اور اولاد ۱۹۶
بچیوں کا رشتہ اور دعائیں ۱۹۹

باب نہم: عالمِ نسواں

خواتین کو لکھائی سکھانا ۲۰۱
خواتین سے ضروری رابطہ ۲۰۴
قریبی اعزہ سے پردہ ۲۰۵
پردے میں غلو ۲۰۷
رشتوں میں تاخیر ۲۰۸
لڑکی کی رضامندی ۲۱۳
لڑکی کی رضامندی: ایک وضاحت ۲۱۶
رشتے میں حسب نسب کا لحاظ ۲۱۷
خواتین اور سفر ۲۲۰
خواتین اور جینز کا استعمال ۲۲۲
نماز با جماعت میں شرکت ۲۲۶
عورت کی امامت ۲۲۹
خواتین کے لیے شہادت کا درجہ ۲۳۱
بیوٹی پارلر کا کاروبار ۲۳۳
خواتین، گھریلو فرائض اور تحریکی ذمہ داریاں ۲۳۴
جنت کی نعمتیں اور خواتین ۲۳۷
عورتوں کا قبرستان میں جانا ۲۴۱
بالوں کی چٹیا اور غسل ۲۴۲
مصنوعی بالوں کی پیوند کاری ۲۴۳
خواتین کے چند مسائل ۲۴۵

باب دہم: متفرق مسائل

نماز میں لفظ اللہ کو مرکزِ توجہ بنانا ۲۴۷
جانور کی حلت و حرمت اور ذبح ۲۴۸
درود میں آل کا لفظ ۲۴۹
استخارے کی شرعی حیثیت ۲۵۰
بدری صحابہ کا مقام و مرتبہ ۲۵۴
تعلیمِ قرآن اور جنسی مسائل ۲۵۶
دعائے ختم القرآن ۲۵۷
حاجات کے لیے اجتماعی ورد ۲۵۸
ختم قرآن پر کھانا ۲۵۹
قرآن سنانے پر معاوضہ ۲۶۱
ایصالِ ثواب ۲۶۴
تنگ دستی میں ایصالِ ثواب ۲۶۵
درس قرآن دینے کا طریقہ ۲۶۶
ویران مسجد کا انہدام ۲۶۷
حرام کمائی سے مسجد کی تعمیر ۲۶۹
مسجد کی تزیین و آرائش ۲۶۹
شہید کی تدفین ۲۷۲

موت فوت کی رسوم ۲۷۴
تدفین سے پہلے فاتحہ خوانی ۲۷۷
لاؤڈ سپیکر پر تلاوت اور اعلانات وغیرہ ۲۷۹
داڑھی کی شرعی حیثیت ۲۸۰
زنانہ مریضوں کی تیمارداری ۲۸۵
انتقالِ خون میں مرد وعورت کی تمیز ۲۸۶
اسلام اور وکالت ۲۸۷
بائبل پڑھنے سے پہلے تسمیہ ۲۸۸
اذان سے پہلے صلاۃ وسلام ۲۸۹
تقریر وتحریر میں قسم اٹھانا ۲۹۴
وی سی آر اور ڈش انٹینے کا کاروبار ۲۹۶
انٹرنیٹ کیفے ۲۹۷
شطرنج کھیلنا ۲۹۹
قتل کا جھوٹا الزام ۳۰۰
جادو سے قتل ۳۰۱
دارالکفر اور حدود کا مسئلہ ۳۰۳
شعائرِ اسلام اور غیر مسلم ۳۰۷
غیر مسلم ممالک سے ہجرت ۳۰۸
فرقوں کی حیثیت ۳۱۰
تحقیقِ دلائل، تقلید ائمہ اور عام آدمی ۳۱۳
کون سا فقہی مسلک ۳۱۶
غیر مسلم کا قتل ۳۱۷
ٹیلی وژن دیکھنا ۳۱۸
مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان ۳۱۸
میراث اور ہبہ ۳۱۹
قصاص اور اخروی سزا ۳۱۹
متفرق سوالات ۳۲۱
متعہ ۳۲۲

باب یازدہم: دعوت وتحریک

نظام اسلامی کی جدوجہد ۳۲۴
سمع وطاعت کی شرعی حیثیت ۳۳۲
اقامتِ دین اور نظم جماعت ۳۳۶
مکمل اسلام ۳۳۹
عہد رکنیت کی خلاف ورزی پر کفارہ! ۳۴۰
نماز جمعہ سے پہلے مسجد میں اجتماع ۳۴۷
خانقاہ کو مرکز ہدایت بنائیے ۳۴۸
خانقاہ کی شرعی حیثیت ۳۵۱
تقرب اور ذکر الٰہی ۳۵۳

مقالات

اجماع امت ۳۵۷
حجیت ۳۶۴
امتیازی نام ۳۷۲
اقسام ۳۷۶
مختلف مسالک پر عمل ۳۸۵
خلافت کا استحقاق ۳۹۴
جہاد ۴۰۲
جہاد کے اساسیات ۴۰۲
نفیر عام ۴۰۶
حق آزادی کی حفاظت ۴۱۰
عہدِ حاضر اور جہاد ۴۱۱
رکنِ اسلام ۴۱۳

عرضِ ناشر

'رسائل ومسائل'، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور کا وہ علمی وفکری سلسلہ ہے، جس کا آغاز مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا تھا۔ مولانا مودودیؒ کے بعد اس سلسلے کو اُن کے علمی جانشین جسٹس ملک غلام علی مرحوم نے جاری رکھا۔ ان کے بعد رسائل ومسائل میں جن حضرات نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں اُن میں حضرت مولانا گوہر رحمانؒ، جناب خرم مرادؒ، جناب نعیم صدیقیؒ، ڈاکٹر انیس احمد اور حضرت مولانا عبدالمالک کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا عبدالمالک صاحب کا حصہ البتہ اس لحاظ سے باقی حضرات سے زیادہ ہے کہ انھیں ملک صاحب مرحوم کی زندگی میں بھی شعبہ استفسارات میں خدمات انجام دینی پڑیں اور پھر ان کی وفات سے لے کر اب تک وہی اس شعبے کو چلا رہے ہیں۔

مولانا عبدالمالک صاحب کی شخصیت علمی وتحریکی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ ایک طرف میدانِ علم کے شہسوار ہیں تو دوسری طرف عملی میدان میں بھی اُن کے کارنامے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ وہ بیک وقت جامعہ مرکز علوم اسلامیہ، منصورہ کے شیخ الحدیث، رابطۃ المدارس الاسلامیہ پاکستان کے روح رواں جمعیت اتحاد العلماء پاکستان کے صدر، ادارہ معارف اسلامی، لاہور کے شعبۂ استفسارات کے نگران اور مجلسِ علمی کے رکن، اور ممبر قومی اسمبلی پاکستان ہیں۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے مؤثر شخصیت سے نوازا ہے اور انھیں دوسروں کو اپنی بات کا قائل کرنے کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا ہے، اور یہ بات بلاشبہ گہرے علم وبصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ زیرِ نظر کتاب مولانا کے اُن استفسارات اور مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس مجموعے کے انتخاب اور ابتدائی ترتیب پر کام کرنے کا اعزاز مولانا عبدالمالک صاحب کے ہونہار شاگرد مولانا عبدالودود (حال مقیم برطانیہ) کو حاصل ہوا، تاہم ابھی مسودہ قابلِ اشاعت نہ تھا۔ اس دوران مولانا عبدالودود برطانیہ چلے گئے تو اس اہم کام کی ذمہ داری ادارہ معارف اسلامی کے محقق اور معروف عالمِ دین مولانا گل زادہ شیر پاؤ

صاحب کے سپرد کی گئی۔ گل زادہ صاحب نے بلاشبہ اس مسودے کو علمی خطوط اور تحقیقی اصولوں کے مطابق بہترین انداز میں مرتب کیا۔ اس دوران ہماری باہمی مشاورت بھی ہوتی رہی۔

ہمارے فاضل بھائی نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ان کے اپنے قول کے مطابق جو امور پیشِ نظر رکھے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

۱- بعض مقامات پر سوالات کی عبارت بہت زیادہ لمبی تھی، جسے حسبِ ضرورت مختصر کیا گیا اور سوال کا خلاصہ پیش کر کے جواب دے دیا گیا ہے۔

۲- بعض سوالات کسی خاص پس منظر میں تھے جس کی وجہ سے اس کا خطاب محدود ہو گیا تھا۔ کوشش کی گئی ہے کہ جہاں ضروری ہو ضمائر تبدیل یا حذف کر کے خطاب کو عام بنایا جائے۔

۳- بعض مقامات پر آیات و احادیث کی عبارت کے ساتھ ترجمہ نہیں دیا گیا تھا۔ گل زادہ صاحب نے کوشش کی ہے کہ ہر آیت اور حدیث بلکہ ہر عربی عبارت کے ساتھ ترجمہ ضرور دیا جائے۔ وہ اس کام میں بحسن و خوبی کامیاب ہوئے ہیں۔

۴- چند ایک مقامات ایسے بھی تھے جہاں آیت یا حدیث کا ترجمہ دیا گیا تھا مگر عبارت نہیں تھی وہاں فاضل مرتب نے عبارت کا اضافہ کر دیا ہے۔

۵- مسودے میں آیات و احادیث کے حوالہ جات کا خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا، الحمدللہ گل زادہ صاحب کی محنت سے یہ کام بھی ممکن ہو گیا کہ کوئی آیت یا حدیث بغیر حوالے کے نہ رہ جائے۔

۶- دیگر ماخذ و مراجع کے حوالے دینے کی بھی بڑی کامیاب اور لائقِ تحسین کوشش کی گئی ہے۔

۷- ایک اہم بات یہ کہ مسودے میں رسائل و مسائل کے دوسرے مجموعوں کی طرح ہر استفسار کے آخر میں ترجمان القرآن کا حوالہ درج نہیں تھا۔ مرتب نے انھیں تلاش کر کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ صرف ایک استفسار "مکمل اسلام" ایسا ہے جو ترجمان القرآن میں شائع شدہ نہیں ملا۔

۸- عربی عبارتوں پر اعراب کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا جس کی وجہ سے عام قارئین کے لیے دقت

۹- بعض استفسارات ایسے تھے جن میں مختلف موضوعات پر کئی سوالات تھے جنھیں متفرقات میں شامل کیا گیا تھا۔ ان تمام سوالات کو الگ الگ کر کے موضوع سے متعلق مقام پر دے دیا گیا ہے۔

۱۰- مقالات کے ضمن میں 'اجماع' کے عنوان سے مقالہ جو ترجمان القرآن ۱۹۸۵ء کے تین شماروں میں شائع ہوا ہے، اور 'مختلف مسالک پر عمل' کے عنوان سے مقالہ جو جون ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا، طبع زاد مقالے ہیں۔ باقی دو مقالات یعنی 'خلافت کا استحقاق' اور 'جہاد' مختلف استفسارات کے جواب ہیں جو زیادہ طویل ہونے یا ایک موضوع سے متعلق ہونے کی وجہ سے مقالات میں ایک عنوان کے تحت شامل کیے گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گل زادہ صاحب کی اس کاوش نے اس اہم کتاب کے مرتب کرنے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ رسائل و مسائل کے دوسرے مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی اردو دان طبقے کے لیے اور خاص طور پر تحریکی حلقوں کے لیے رہنما ثابت ہو۔ (آمین)

آخر میں ہم مولانا عبدالمالک مدظلہ العالی اور مولانا گل زادہ شیرپاؤ حفظہ اللہ کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل اور فیوض و خیر میں اضافہ فرمائے اور وہ امتِ مسلمہ کی علمی، فکری اور فقہی راہ نمائی کا کام بطریق احسن سرانجام دیتے رہیں۔

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر

ادارہ معارف اسلامی، لاہور

۱۵ر جولائی ۲۰۰۷ء

پیش لفظ

نحمدہ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم۔اما بعد

مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ وہ بہ یک وقت مفسر، محدّث، فقیہ، مؤرخ، داعی، سیاست دان، مربی اور مرشد تھے۔ زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے استفسارات کے جواب دیتے تھے۔ وہ ہر صفت میں امام کا درجہ رکھتے تھے، انھوں نے سیاست اور فقاہت دونوں میدانوں میں مدبرانہ اور باوقار انداز اختیار کیا۔

ان کے نام ہر مہینے ہزاروں استفسارات آتے اور وہ خود ان کا جواب تحریر فرماتے۔ بعض سوالات کو جوابات کے لیے اپنے معاونِ خصوصی ملک غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد فرما دیتے۔ ملک غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ذہانت و فطانت اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کے نتیجے میں فقاہت میں بلند مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان کی نظر بھی تفسیر، حدیث، تاریخ اور فقہی ذخیرے پر وسیع اور گہری تھی۔ ۱۳۹۹ھ (۱۹۷۹ء) میں مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد یہ شعبہ مستقل طور پر ان کے سپرد ہو گیا۔

جسٹس ملک غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بھی سیکڑوں استفسارات ہر ماہ موصول ہوتے اور وہ ان کے جوابات تحریر فرماتے۔ ۱۹۷۹ء میں ادارہ معارف اسلامی لاہور کا قیام عمل میں آیا تو یہ شعبہ ادارہ معارف اسلامی میں منتقل ہو گیا اور محترم ملک غلام علی رحمۃ اللہ علیہ ادارہ معارف اسلامی ہی میں بیٹھ کر جوابات تحریر فرماتے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات اور جناب ملک غلام علی صاحب کے جوابات رسائل و مسائل کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور دنیا بھر کے اہلِ علم اور عوام ان سے بڑے پیمانے پر استفادہ کر رہے ہیں۔

محرم الحرام ۱۴۰۱ھ میں منصورہ لاہور میں جامعہ مرکز علوم اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا اور مجھے جامعہ مرکز علوم اسلامیہ میں تعلیم و تدریس کے لیے بلایا گیا۔ میں اپنے ساتھ

جلیل القدر عالمِ دین جناب مولانا عبدالرزاق خلیق رحمۃ اللہ علیہ کو بھی لے آیا۔

جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ لاہور میں التخصص فی الفقہ الاسلامی کے شعبے کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کا ایک نصاب جلیل القدر علماے دین حضرت مولانا محمد چراغ ؒ، حضرت مولانا مفتی سید سیاح الدین کاکاخیلؒ، حضرت مولانا معین الدین خٹکؒ، حضرت مولانا گوہر رحمٰنؒ، جناب ملک غلام علیؒ، جناب مولانا خلیل احمد حامدیؒ، جناب مولانا خان محمد ربانیؒ اور اس ناچیز نے باہمی مشاورت سے طے کیا۔ جناب مولانا فتح محمد کو جامعہ مرکز علوم اسلامیہ کا مہتمم بنا دیا گیا اور اس سب سے وہ بھی مشاورت میں شریک تھے۔ جب محترم ملک غلام علی صاحب ۷رجون ۱۹۸۱ء کو وفاقی شرعی عدالت میں جج کے منصب پر فائز ہو کر اسلام آباد چلے گئے تو اس کے بعد شعبۂ استفسارات ادارہ معارف اسلامی بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔ جب تک محترم ملک صاحب وفاقی شرعی عدالت میں جج کے منصب پر فائز رہے اس وقت تک یہ شعبہ میرے سپرد رہا۔ اس دوران میں بھی حسبِ سابق استفسارات کا تانتا بندھا رہا اور میں اپنی توفیق کے مطابق مختصر اور مفصل جوابات دیتا رہا۔

چار سال تک جج کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد جب محترم ملک صاحب فارغ ہو کر منصورہ تشریف لائے تو دوبارہ اس شعبے میں کام شروع کیا اور اب وہ بھی ادارہ معارف اسلامی کے شعبہ استفسارات میں موصول ہونے والے استفسارات کے جوابات دیتے۔ اس طرح یہ شعبہ محترم جناب ملک صاحب اور میری مشترکہ ذمہ داری میں آ گیا۔ بعض استفسارات کے جوابات کے لیے ہم آپس میں مشاورت بھی کرتے۔ اس وقت محترم جناب مولانا نعیم صدیقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترجمان القرآن کے مدیر تھے اور ادارہ معارف اسلامی میں کام کرتے تھے۔ وہ بھی ہماری راہنمائی کرتے۔ ان کے نام جو استفسارات آتے ان کے جواب زیادہ تر تو ہم دیتے لیکن بعض اوقات وہ بھی ہمارے ساتھ اپنا حصہ ڈالتے۔ اس دوران میں میرے جو جوابات ترجمان القرآن میں شائع ہوئے، ان میں کئی مقامات پر جناب محترم نعیم صدیقی صاحب نے اضافے فرمائے۔

ادارہ معارف اسلامی کے بزرگوں اور احباب نے حکم دیا کہ میں ان جوابات کو، جو ترجمان القرآن میں شائع ہو چکے ہیں، کتابی شکل میں مرتب کردوں تاکہ ادارہ معارف اسلامی اس کی اشاعت کا اہتمام کرے۔

اس سے پہلے مفتی سید سیاح الدین کاکاخیلؒ کے فتاویٰ کو میں نے تفہیم الاحکام کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کیا اور ادارہ معارف اسلامی نے اسے شائع کیا۔ چونکہ مفتی سیاح الدین کاکاخیل رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میری زندگی کا ایک طویل عرصہ گزرا ہے اور مجھے ان سے اور انھیں مجھ سے والہانہ اور گہری محبت تھی، اس لیے دوستوں نے مشورہ دیا کہ ان جوابات کو تفہیم الاحکام کا نام دیا جائے تاکہ یہ حضرت مفتی صاحب سے محبت اور لگاؤ کا اظہار بھی ہو اور انھی کے فتاویٰ کا تسلسل ہو۔

[ادارہ معارف اسلامی کی مجلسِ منتظمہ کے اجلاس منعقدہ ۴؍اپریل ۲۰۰۷ء میں اس نام پر تفصیلی گفت گو ہوئی تو مجلس نے طے کیا کہ نام حسبِ سابق رسائل ومسائل ہی رکھا جائے تاکہ اس سلسلۃ الذہب کا تسلسل قائم رہے جو سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہوا اور جس کی اتباع کی توفیق اللہ نے ملک غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کو دی۔ اس فیصلے کی روشنی میں اب اس مجموعے کا نام رسائل ومسائل حصہ ہشتم ہوگا۔ یہاں یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسائل ومسائل کے پہلے پانچ حصے مولانا مودودیؒ کے جوابات پر مشتمل ہیں جن میں سے چار حصے اسلامک پبلی کیشنز، لاہور سے، جبکہ ایک، ادارہ معارف اسلامی، لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ چھٹا اور ساتواں حصہ ملک غلام علی مرحوم کے جوابات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کی اشاعت کا اعزاز بھی ادارہ معارف اسلامی کو حاصل ہے۔ (ادارہ)]

اللہ کے فضل وکرم سے یہ مجموعہ اب قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ اہلِ علم سے گزارش ہے کہ اس میں اگر کوئی لغزش پائیں تو مجھے مطلع کریں تاکہ اگلی اشاعت میں اصلاح ہو سکے۔

میں جناب چودھری محمد اسلم سلیمی صاحب سابق ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی، نائب امیر

جماعتِ اسلامی پاکستان، جناب حافظ محمد ادریس صاحب ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی، نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان، جناب محمد انور گوندل صاحب ناظمِ ادارہ معارف اسلامی اور محترم جناب رفیع الدین ہاشمی صاحب ریسرچ اسکالر ادارہ معارف اسلامی کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری سر پرستی فرمائی اور بار بار اس مجموعے کی ترتیب کی طرف متوجہ فرماتے رہے۔ جامعہ مرکز علوم اسلامیہ کے کارکنان واساتذۂ کرام مولانا عبدالودود (حال یو کے اسلامک مشن، لندن)، مولانا گل زادہ شیر پاؤ، مولانا محمد احمد واسطی اور نعیم اللہ دیروی نے ترتیب، کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں میرے ساتھ تعاون کیا ہے میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

ان شاء اللہ پہلے مجموعے کے بعد دوسرے مجموعے جلد مرتب ہو کر سامنے آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس مجموعے کو اپنی جناب میں قبول و منظور فرمائے، اس سے زیادہ سے زیادہ مسلمان استفادہ کریں اور اللہ تعالیٰ ادارہ معارف اسلامی، جامعہ مرکز علوم اسلامیہ اور اس کے ذمہ داران واساتذۂ کرام کو دنیا وآخرت میں اپنی برکات اور اجرِ عظیم سے نوازے۔ آمین

عبدالمالک

مدیر شعبۂ استفسارات

ادارہ معارف اسلامی، لاہور

بابِ اوّل

تفسیرِ آیات وتاویلِ احادیث

قرآن میں لفظِ قصّہ کے معنیٰ

سوال: مجھے تفہیم القرآن کی دوسری جلد پڑھنے کی سعادت ملی۔ اس میں بہت سے مقامات کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ وہاں پچھلے واقعات کو واقعہ لکھنے کے بجائے 'قصہ' کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں اردو زبان میں قصہ اس کہانی کو کہتے ہیں جس کی حیثیت واقعے کی طرح یقینی نہ ہو، بلکہ مشکوک ہو۔ اب اگر قرآن پاک پر ہمارا ایمان ہے تو لازماً وہ تمام واقعات جو پچھلی قوموں پر گزر چکے ہیں، ان کو واقعات کی بجائے 'قصے' سے تعبیر کرنا اصولی طور پر اردو پڑھنے والوں کے ایمان کو متزلزل کرنے کے مترادف ہوگا۔ اگرچہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نادانستہ طور پر ہوا ہوگا۔ آپ براہِ مہربانی چند ماہر عالموں سے اس موضوع پر مشورہ کر لیں اور ترجمے میں ترمیم فرما کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

جواب: ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اپنے مطالعے کے نتیجے میں ایک تجویز بھی ارسال فرمائی ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی یہ کاوش قابلِ قدر ہے۔ تاہم ہمیں آپ کی تجویز سے اتفاق نہیں۔

اولاً: اس لیے کہ قرآن پاک خود اپنے آپ کو 'احسن القصص' قرار دیتا ہے: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ۔ (یوسف ۱۲:۳) اے نبیؐ! ہم اس قرآن کو تمھاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایے میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں۔

ثانیاً: اس لیے کہ اس آیت کے ترجمے میں 'قصہ' کے معنی مولانا مودودیؒ نے حقائق اور واقعات کر دیے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا کے نزدیک 'قصہ' کے معنی حقیقتِ واقعیہ کے ہیں۔ لہٰذا اصولاً خود مصنف کی تحقیق کو دوسرے لوگوں کی تحقیقات پر فوقیت دی جائے گی۔

ثالثاً: اس لیے کہ اہلِ لغت 'قصہ' کے معنی یہ بیان کرتے ہیں: حال، خبر، کار، سخن، کہانی،

حکایت، بیان، تبصرہ۔[1]

اہلِ لغت میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ قصہ اس کہانی کو کہا جاتا ہے جس کی حیثیت ٹھوس نہ ہو، بلکہ مشکوک ہو۔ اس سلسلے میں آپ کو غلط فہمی لاحق ہوئی ہے۔ آپ کتبِ لغت سے اس لفظ کی تحقیقِ مزید کریں۔ قابلِ غور یہ بھی ہے کہ مولانا مودودیؒ کی طرح اردو اور عربی تفاسیر کے تمام مفسرین، قصہ اور واقعہ کو ایک قرار دے کر واقعہ کے لیے قصہ کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے آپ کی تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہوئے تفہیم القرآن ہی کی ایک جلد کے بیس مقامات کی اصلاح نہیں کرنا ہوگی، بلکہ اردو عربی کی تمام تفاسیر میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں کرنا ہوں گی جو کسی طرح ممکن اور مناسب نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۸۳ء)

آیتِ تطہیر اور آیتِ مودّہ

سوال: مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی چند کتب و رسائل کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ بلاشبہ مولانا عظیم اہلِ علم اور اہلِ نظر علما میں سے ہیں لیکن یار لوگ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مولانا صاحب ناصبی خیالات رکھتے تھے اور ابن تیمیہؒ کے پیرو تھے۔ آپ میری یہ الجھن دور فرمائیں کہ ان دو آیات کی مولانا صاحب نے تفہیم القرآن میں کیا تفسیر فرمائی ہے:

۱- آیتِ تطہیر [یعنی]: اللہ ارادہ رکھتا ہے اے محمدؐ! آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو پاک کرنے کا، جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔

۲- دوسری یہ آیت: اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ میں رسالت کی اجرت تم سے کوئی نہیں مانگتا۔ ماسوائے اس کے کہ میری اہل بیت کی محبت و اطاعت کرو۔

۱- نور اللغات۔

بعض علما کہتے ہیں کہ مولانا صاحب نے یہ بات آیات کی تفسیر میں گول مول کر دی ہے، واضح لکھا ہی نہیں، جو کہ بد نیتی پر مبنی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ مولانا نے یہ غلط تفسیر کی ہے۔ لوگ بلکہ علما تک پروپیگنڈا کرتے ہیں اور بڑے یقین سے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ! مولانا مودودیؒ صاحب میں تو انحرافِ اہلِ بیت وآلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پایا جاتا ہے بلکہ لوگ مولانا کو ناصبی کہتے ہیں اور تقاریر میں کہتے ہیں کہ ان کا ترجمۂ قرآن ہرگز نہ پڑھنا ورنہ مسلمان ہی نہ رہو گے۔

جواب: یہ حقیقت ہے کہ مختلف گروہوں نے مولانا کے خلاف مختلف قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں تا کہ اپنے گروہ کے افراد کو مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کے مطالعے سے روکا جا سکے، اہلِ سنت کے متوسلین نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ مولانا مودودیؒ شیعہ ہیں، شیعوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ مولانا مودودیؒ ناصبی ہیں، بعض نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ مولانا خلفاے راشدین کی توہین کرتے ہیں اور بعض نے یہ کہا کہ مولانا اہلِ بیت کی توہین کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب (شعوری یا غیر شعوری طور پر) جھوٹا پروپیگنڈا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے گروہی عصبیتوں سے ہٹ کر اسلام کی صحیح صحیح ترجمانی کی ہے اور جو شخص بھی، خواہ اس کا کسی بھی مذہبی گروہ سے تعلق ہو، آپ کی طرح گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر مولانا کے لٹریچر کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اصل حقیقت کو پالیتا ہے۔ مولانا مودودیؒ اہلِ بیت سے بھی اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خلفاے راشدین سے۔ 'حدیثِ ثقلین' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کتاب اللہ اس لیے بھاری چیز ہے کہ وہی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور اسے چھوڑنا یا اس سے منحرف ہونا تباہی وضلالت کا موجب ہے۔ اور اہلِ بیت کو بھاری اس لیے فرمایا کہ ہمیشہ اکابرِ نوعِ انسانی کے اہلِ بیت ان کے پیروؤں کے لیے سخت وجۂ آزمائش ثابت ہوئے ہیں۔ کسی نے ان کے حق میں افراط کی ہے اور غلو کر کے پیرزادوں کو معبود بنا ڈالا ہے اور کسی نے ان کے حق میں تفریط کی ہے اور ان پر ظلم وستم ڈھائے ہیں تا کہ امت کو جو فطری عقیدت اپنے رہبر اور ہادی کے خاندان والوں سے ہوتی

ہے اس کو زبردستی دبادیا جائے۔ اسی غرض کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اہلِ بیت کے معاملے میں تمھیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔ یعنی ان کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور افراط وتفریط کے پہلو اختیار کرنے سے بچو۔[1]

رہی یہ بات کہ فلاں آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس آیت سے بھی صرف محبتِ اہلِ بیت ثابت کی ہے یا نہیں تو اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ محبتِ اہلِ بیت کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں ہے کہ کسی متعین آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بھی اسے اہلِ بیت کے ساتھ مختص کردیا جائے۔ سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ جس کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنھن کے ساتھ خاندان کے دیگر افراد حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنؓ و حسینؓ کو بھی اس کا مصداق قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ اہل البیت کا لفظ صرف ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس میں دوسرا کوئی داخل نہیں ہوسکتا تو یہ بات غلط ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ 'گھر والوں' کے لفظ میں آدمی کے سب اہل وعیال شامل ہوتے ہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ بھی شامل ہیں۔ ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

تَسْأَلُنِیْ عَنْ رَجُلٍ کَانَ اَحَبَّ النَّاسِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ وَکَانَتْ تَحْتَهٗ اِبْنَتُهٗ وَاَحَبُّ النَّاسِ اِلَیْهِ۔ تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو، جو رسول اللہؐ کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بیٹی تھی جو آپ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی۔

اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ واقعہ سنایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَآءِ اَهْلُ بَیْتِیْ فَاَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِیْرًا۔ خدایا یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے گندگی دور کردے اور انھیں پاک کردے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: میں بھی تو آپ کے اہلِ بیت میں سے ہوں (یعنی مجھے بھی اس کپڑے میں داخل کرکے دعا فرمایئے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم

۱- رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۳۸۔

الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی۔[1]

مولانا نے یہ بات گول مول نہیں کی لیکن بعض شیعہ حضرات کو یہ بات پسند نہیں کہ اہل البیت کا مصداق ازواجِ مطہرات کو بھی قرار دیا جائے۔ اس لیے وہ اس سے ناراض ہو کر اسے گول مول قرار دے رہے ہیں۔ اسی طرح بعض اہلِ سنت حضرت علی، حضرت فاطمہ حضرت حسن، حضرت حسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس آیت کا مصداق نہ قرار دینے پر مُصر ہیں اس لیے وہ بھی ناراض ہیں۔ لیکن مولانا نے دلائل سے انصاف اور اعتدال کی بات کہی ہے آپ خود مولانا کی تفسیر حاصل کر کے متعلقہ مقام کا مطالعہ کریں تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ انصاف کی بات وہی ہے جو مولانا نے کی ہے۔[2]

سورۂ شوریٰ کی آیت ۲۳ میں اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے وہ معنی صحیح نہیں ہیں جو آپ نے سمجھ لیے ہیں اس لیے کہ مکہ مکرمہ میں مسئلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا تھا۔ آپؐ کو مختلف قسم کی ایذائیں پہنچائی جا رہی تھیں۔ 'قرابت کا لحاظ' بھی ختم ہو گیا تھا حالانکہ یہ چیز عربوں کی ایک معروف روایت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے یہی مطالبہ کیا کہ میں تم سے کسی

۱- تفہیم القرآن، چہارم، ص ۹۳، الاحزاب حاشیہ ۵۰۔

۲- دینی حقائق جب مختلف فرقوں کے پیشواؤں کے ہاتھوں تاویلات کے خراد پر چڑھتے ہیں تو ایک سیدھی صاف بات کو سمجھنا بھی عام آدمی کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ جناب مستفسر آیتِ متذکرہ کو قرآن میں نکالیں اور ذاکروں اور مناظرہ کیش مولویوں کے تمام فرمودات کو ایک طرف رکھ کر ارشادِ الٰہی کو دیکھیں۔ معاملہ ایک آیت کا نہیں، پورا رکوع ایک ہی سلسلۂ بیان میں ہے، خصوصاً آیات ۳۲، ۳۳ اور ۳۴ کے درمیان واؤ عطفی اہم ہے۔ یعنی سلسلۂ کلام ایک ہی ہے۔ آغاز ہوتا ہے یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ سے اور اختتام ہے لِیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا پر، یہاں احکام یہ ہیں:

(۱) لَاتَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ (۲) قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳) وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ (۴) لَاتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (۵) اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ (۶) اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ (۷) اَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ان احکام کے خاتمے پر فرمایا گیا ہے کہ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ سوال یہ ہے کہ رجس کو دور کرنے اور مرتبہ تطہیر پر لانے کے لیے جو اعمال بتائے گئے، ان کا خطاب تو نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ لیکن آخر میں جب ان اعمال کے نتائج سے بہرہ مند کرنے کے لیے اہلِ بیت کے الفاظ استعمال کیے گئے تو نساء النبی سے روئے سخن ہٹ گیا۔ یہ بات عام سطح کی عقل میں سما سکتی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اہلِ بیت کا دائرہ ذرا وسیع ہے۔ (نعیم صدیقی)

اجر کا مطالبہ نہیں کرتا لیکن قرابت کی بنیاد پر عدل وانصاف، محبت ورعایت کا لحاظ چاہتا ہوں۔ جو حق خود تمھارے عرف میں بنتا ہے تم نے اسے بھی پامال کیا ہے۔ آیات کے سیاق وسباق اور پیش آمدہ صورتِ حال دونوں کے پیشِ نظر اس بات کا دور دور تک بھی امکان نہیں جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ مکہ مکرمہ میں اہلِ بیت اور اس کی محبت کا مسئلہ کبھی پیش ہی نہیں آیا۔ تمام مفسرین نے اس تفسیر کو راجح قرار دیا ہے اور سیاق وسباق سے یہی تفسیر متبادر ہے۔ مولانا مودودیؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ آپ نے جو ترجمہ لکھا ہے اس میں اطاعت کا اضافہ اپنی طرف سے کیا ہے اور 'قربیٰ' کو اہلِ بیت کے معنی میں لیا ہے جو قطعاً غلط اور سیاق وسباق اور مکہ مکرمہ کی صورتِ حال سے مطابقت نہیں رکھتا۔ وہاں معروف معنی میں اہلِ بیت کا وجود نہ تھا اور اگر وجود ہوتا تب بھی کفار سے یہ مطالبہ کرنا کہ میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتا صرف رشتہ داروں کے ساتھ محبت کا طلب گار ہوں، انتہائی نامعقول بات ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس مقام پر مختلف تفاسیر نقل کر کے راجح تفسیر بیان کر دی ہے اور باقی پیش کی گئی تفسیر کو ذکر کرنے کے بعد ان کی مدلل تردید کی ہے۔ انھوں نے آپ کی تفسیر کو دلائل کی بنیاد پر رد کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> اصل الفاظ ہیں الا المودة فی القربیٰ یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر 'قربیٰ' کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔ اس لفظ 'قربیٰ' کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔
>
> ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ 'میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہل قریش) کم از کم اس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تل گئے ہو'۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالے سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدی، ابو مالک، عبدالمالک بن یزید بن اسلم، ضحاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے بھی بیان کی ہے۔
>
> دوسرا گروہ 'قربیٰ' کو قرب اور تقرب کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ 'میں

تم سے اس کام پر کوئی اجر، اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمھارے اندر اللہ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے'۔ یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حسن بصری سے منقول ہے، اور ایک قول قتادہ سے بھی اس کی تائید میں نقل ہوا ہے بلکہ طبرانی کی روایت میں ابن عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۔ (الفرقان ۲۵:۵۷) ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

تیسرا گروہ 'قربیٰ' کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ 'میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو'۔ پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمطلب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علی، فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جبیر اور عمرو بن شعیب سے منقول ہے، اور بعض روایات میں یہی تفسیر ابن عباسؓ اور حضرت علی بن حسین (زین العابدین) کی طرف منسوب کی گئی ہے لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اوّل تو جس وقت مکہ معظمہ میں سورۂ شوریٰ نازل ہوئی ہے اس وقت حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمطلب بھی سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ ان میں سے بعض کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھی تھے اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے آپؐ کی والدہ ماجدہ، آپؐ کے والد ماجد اور آپؐ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپؐ کی رشتہ داریاں تھیں اور ان سب گھرانوں میں آپؐ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اقربا میں سے آپؐ صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبۂ محبت کو انھی کے لیے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات جو ان سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے اس مقام سے اس کارِ عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ 'تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو' اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ قرآن مجید میں انبیا علیہ السلام کے جو قصے آئے ہیں ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اٹھ

کہ اپنی قوم سے کہا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے (یونس ۱۰:۷۲، ہود ۱۱:۲۹-۵۱ اور الشعراء ۲۶:۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰) سورہ یٰسٓ میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے (۳۶:۲۱) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآنِ پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں (الانعام ۶:۹۰، یوسف ۱۲:۱۰۴، المومنون ۲۳:۷۲، الفرقان ۲۵:۵۷، سبا ۳۴:۴۷، صٓ ۳۸:۸۶، الطور ۵۲:۴۰، القلم ۶۸:۴۶)۔ اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ میں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اوپر سے ساری تقریر انھی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے، اور آگے بھی رُوئے سخن انھی کی طرف ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو ان لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے ان کے لیے انجام دیا ہو کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپؐ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمھاری انجام دی ہے اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا۔ وہ تو الٹا اسے جرم سمجھ رہے تھے اور اس کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے۔[1]

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۸۳ء)

لفظِ نحر کے معنی

سوال: سورۃ الکوثر کی تفسیر میں اشکال پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر نحر کے معنی میں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد آزمائشوں میں ڈٹ جانا ہے، جب کہ یہ مفہوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت درپیش حالات کے قریب بھی ہے۔ یہاں نحر کے معنی قربانی کرنا محلِ نظر لگتا ہے، وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: سورۃ الکوثر کی تفسیر میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ مشرکینِ مکہ غیر اللہ کی بندگی کرتے

۱- تفہیم القرآن چہارم ص ۵۰۱-۵۰۲، الشوریٰ، حاشیہ ۴۱۔

تھے، غیر اللہ کے آگے سر جھکاتے، سجدہ ریز ہوتے، ان سے دعائیں کرتے، انھیں حاجت روا، مشکل کشا اور فریاد رس سمجھتے تھے اور غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ کی عبادت، اس کی حاکمیت اور اسی کے نام پر نذر و نیاز کے لیے بلاتے تھے تو یہ چیز انھیں عجیب و غریب نظر آتی تھی اور وہ آپؐ کی تحریک کو اپنے مذہبی اور سیاسی نظام پر زبردست حملہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آپؐ کی مخالفت پر تل گئے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ آپؐ کو قتل کر دیا جائے اور آپؐ کی تحریک کو دفن کر دیا جائے۔ وہ کہتے تھے: بَتَرَ مُحَمَّدٌ (محمد کی جڑ کٹ گئی) نعوذ باللہ۔ اس پر آپؐ کو تسلی دی گئی کہ آپؐ اپنی تحریک جاری رکھیے، اللہ کے لیے نماز پڑھیے اور اسی کے نام پر قربانی دیجیے، آپؐ کی تحریک کامیاب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کوثر یعنی خیرِ کثیر عطا کیا ہے۔ آپؐ کے دشمن جڑ کٹے ہیں، یعنی ان کی نسل ختم ہوگی۔

نحر کے معنی آزمایشوں میں ڈٹ جانا اور تکلیفیں برداشت کرنا نہیں آتے بلکہ اس کے معنی اونٹ یا جانور ذبح کرنے کے ہیں۔ سورۂ کوثر کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

> یہ حکم اس ماحول میں دیا گیا تھا جب مشرکین قریش ہی نہیں تمام عرب کے مشرکین اور دنیا بھر کے مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے تھے اور انھی کے آستانوں پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ پس حکم کا منشا یہ ہے کہ مشرکین کے برعکس تم اپنے اس رویے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو، تاکہ تمھاری نماز بھی اللہ ہی کے لیے ہو اور قربانی بھی اسی کے لیے ہو۔[۱]

مقصد اس کا یہ ہے کہ جب بھی آپؐ جانور ذبح کریں، اللہ کے نام پر ذبح کریں، غیر اللہ کے نام پر نہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور بعد کے ادوار میں اہلِ ایمان اللہ کے نام پر جانوروں کو ذبح کرتے تھے۔ یہ مضمون دوسری مکی سورتوں کا بھی ہے، صرف سورۃ الکوثر کا نہیں۔ سورۂ انعام، سورۂ نحل وغیرہ میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ اسی لیے سورۂ کوثر میں وَانْحَرْ کے وہی معنی مراد لینے مناسب ہیں جو دوسری سورتوں میں بیان کردہ مضمون سے مناسبت رکھتے ہوں۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۹ء)

۱- تفہیم القرآن، ششم، ص ۴۹۶، الکوثر، حاشیہ ۱۔

عقیق کی انگوٹھی

سوال: میں نے ایک چھوٹے سے کتابچے (غالباً قرشی دواخانہ کی جنتری) میں ایک حدیث پڑھی ذہن میں شک سا گزر رہا ہے۔ اسی شک کو رفع کرنے کے لیے آنجناب کو زحمت دیتا ہوں۔ حدیث کچھ یوں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص عقیق (پتھر) کی انگوٹھی پہنے گا، خدا اس کی حاجتیں پوری فرمائے گا۔ اس حدیث کے بارے میں رہنمائی فرمائیں۔

جواب: یہ روایت اصولِ شرعیہ سے متصادم ہے اور اس کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ حاجتوں کے پورا ہونے کے سلسلے میں جو اصول شریعت سے معلوم ہوتے ہیں ان میں اسبابِ مادیہ، اعمالِ صالحہ اور دعائیں شامل ہیں۔ کسی چیز کی انگوٹھی پہننا حاجتوں کے پورا ہونے کا سبب صرف اسی طرح بن سکتا ہے کہ اسے بیچ کر حاجت پوری کی جائے یا پھر اس طرح کہ اس میں بعض امراض کو دفع کرنے کی طبی تاثیر اور خصوصیت پائی جائے۔ اور اس سے ایسی حاجات، پوری ہونا مراد ہو، جن کا تعلق صحت سے ہو، جس طرح عام دواؤں سے یہ حاجات پوری ہوتی ہیں۔ لیکن کسی انگوٹھی میں ایسی خصوصیت ماننا جو دائرۂ اسباب سے بالاتر ہو، درست نہیں ہے۔ اسی طرح انگوٹھی پہننا ایسا عملِ صالح بھی نہیں ہے جس پر کچھ دنیوی اثرات ظاہر ہوں۔ علامہ سخاوی المقاصد الحسنہ میں لکھتے ہیں: حَدِیْثُ تَخَتَّمُوا الْعَقِیْقَ، لَهٗ طُرُقٌ کُلُّهَا وَاهِیَةٌ[1] عقیق کی انگوٹھی پہنو کے سلسلے میں جو حدیث آئی ہے اس کی تمام سندیں کمزور ہیں۔

جن علما نے اس حدیث کو اپنی کسی کتاب میں درج کر دیا ہے انھوں نے اسے ایسے معنی میں لے کر درج کیا ہے جس کے لحاظ سے یہ حدیث قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ چنانچہ علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

وَیُرْوٰی فِیْ اِتِّخَاذِ الْخَاتَمِ الَّذِیْ فَصُّهٗ مِنْ یَاقُوْتٍ لَا یَصِحُّ اَیْضًا۔ قَالَ ابْنُ الْاَثِیْرِ: یُرِیْدُ اَنَّهٗ اِذَا ذَهَبَ مَالُهٗ بَاعَ خَاتَمَهٗ فَوَجَدَ بِهٖ حَاجَتَهٗ وَ قَالَ غَیْرُهٗ بَلِ الْاَشْبَهُ اِنَّ

۱- المقاصد الحسنۃ، حرف التا، المثناۃ، ص ۱۴۷۔

صَحَّ الْحَدِيْثُ اَنْ يَّكُوْنَ لِخَاصِيَّةٍ فِيْهِ كَمَا اَنَّ النَّارَ لَاتُؤَثِّرُ فِيْهِ وَلَا تُغَيِّرُهٗ وَ اِنَّ مَنْ تَخَتَّمَ بِهٖ اَمِنَ الطَّاعُوْنَ......... وَ كُلُّ هٰذَا يُمْكِنُ قَوْلُهٗ فِي الْعَقِيْقِ اِنْ ثَبَتَ ایسی انگوٹھی، جس کا نگینہ یاقوت کا ہو، کے بارے میں جو روایات ہیں، وہ بھی صحیح نہیں۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ اگر حدیث صحیح ہو، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایسا شخص جس نے یہ انگوٹھی پہنی ہو، بے مال ہونے کی صورت میں اسے بیچ کر اپنی حاجت پوری کرے گا۔ کچھ دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ دل کو لگنے والی توجیہ یہ ہے کہ آپ کا فرمان اس انگوٹھی میں کسی مخصوص طبعی خاصیت کی بنا پر ہو جیسے یہ کہ آگ اس میں اثر نہیں کرتی اور یہ کہ اس کا پہننے والا طاعون کی بیماری سے بچا رہتا ہے۔ اسی طرح کی توجیہ عقیق کی روایت کے بارے میں بھی درست ہے بشرطیکہ وہ صحیح ہو۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۸۳ء)

'ولو بالصین' کی تحقیق

سوال: روایت اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْکَانَ بِالصِّيْنِ کے بارے میں محدثین کی کیا رائے ہے؟ روایت صحیح ہے یا موضوع ہے؟ اگر صحیح ہے تو کس درجے کی اور موضوع ہے تو کس درجے کی؟ امید ہے کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں گے۔

جواب: یہ حدیث موضوع ہے، اس کا راوی احمد بن عبداللہ بن خالد الجویباری ہے۔ ہرات کا ایک قصبہ جویبار یا جوبار ہے اس کی طرف یہ منسوب ہے۔ یہ شخص احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ كَانَ يَضَعُ الْحَدِيْثَ لِابْنِ كِرَامٍ مَايُرِيْدُهٗ فَكَانَ اِبْنُ كِرَامٍ يُخْرِجُهٗ فِيْ كُتُبِهٖ عَنْهُ (ابن عدی) [یہ ابن کرام کے لیے اس کی مرضی کی احادیث وضع کرتا تھا۔ پھر ابن کرام ان کو اپنی کتابوں میں نقل کرتا تھا] اس کی سند یہ ہے کہ اِبْنُ كِرَامٍ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ عَنِ الْفَضْلِ بْنِ مُوْسٰى عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ۔[1] ابن کرام کہتا ہے کہ ہمیں حدیث سنائی احمد بن فضل

۱- میزان الاعتدال ج۱، ص۱۰۶-۱۰۷

بن موسیٰ نے، محمد بن عمر سے، اور انھوں نے اس کی روایت کی ہے ابو سلمہ اور انھوں نے ابو ہریرہؓ سے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم طلب کرو خواہ چین میں ہو۔

قَالَ الْبَيْهَقِيُّ: مَتْنُهُ مَشْهُورٌ اِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ وَقَدْ رُوِيَ مِنْ اَوْجُهٍ كُلُّهَا ضَعِيفَةٌ وَقَالَ الْمِزِّيُّ: لَهُ طُرُقٌ رُبَمَا يَصِلُ مَجْمُوعُهَا اِلَى الْحَسَنِ[1] [امام بیہقی ”فرماتے ہیں کہ اس کا متن تو مشہور ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ یہ کئی طریقوں سے روایت ہوئی ہے مگر وہ سب ضعیف ہیں۔ البتہ علامہ مزی فرماتے ہیں کہ اس کی کئی سندیں ہیں جن کو اگر جمع کیا جائے تو مجموعہ حسن کے درجے تک پہنچتا ہے]۔

پس یہ حدیث موضوع ہے۔ بعض نے اسے ضعیف بھی قرار دیا ہے اور بعض نے حسن، لیکن راجح یہی ہے کہ یہ موضوع ہے۔ جیسے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے رائے دی ہے کہ یہ شخص ابن کرام اور دوسرے لوگوں کو احادیث وضع کر کے دیتا تھا اور وہ اپنی کتابوں میں اسے ذکر کرتے تھے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۳ء)

حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح

سوال: حال ہی میں ایک کتابچے بعنوان 'حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر' پر ماہنامہ بلاغ القرآن لاہور [مئی ۱۹۸۱ء] میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو پمفلٹ کے ملنے کا پتہ 'احمدی بلڈنگس لاہور' درج ہے۔ دوسری طرف قابلِ توجہ امر یہ بھی ہے کہ ماہنامہ بلاغ القرآن کے تبصرے ہی سے واضح ہے کہ یہ جریدہ منکرین سنت کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر تیسرا کمال یہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ایک مسلّمہ حقیقت کے خلاف کوئی نامور صاحبِ تحقیق ایک اختلافی آواز نہیں اٹھا رہا بلکہ اتنی بڑی انحرافی مہم کے لیے کوئی غیر معروف صاحب ابو طاہر عرفانی

۱- فیض القدیر، ج۱، ص۵۴۲

ایک کتابچہ لکھ کرائے ہیں۔

کتابچہ تو میرے پاس فی الحال نہیں ہے، اس پر شائع شدہ تبصرہ روانۂ خدمت ہے اس کے متعلق آپ کچھ ارشاد کریں تو ہمارے لیے باعث تقویت ہوگا۔

جواب: تہذیبِ مغرب سے متاثر ہو کر اسلام سے ناواقف ایک طبقے نے اسلام کی انتشار انگیز ترجمانی کا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ یہ طبقہ اسلام کے نام سے مغربی تہذیب کو اسلام کا جامہ پہنا رہا ہے ان مغرب گزیدہ مفتیوں نے جہاں اور بہت سے فتاویٰ جاری کیے ہیں ان میں سے ایک فتویٰ یہ بھی ہے کہ نوعمری کی شادی کی اسلام میں اجازت نہیں ہے اور شادی کے لیے ہم عمر ہونا شرط ہے۔ اس سلسلے میں جب قرآن وحدیث اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے عملی نمونے پیش کیے جاتے ہیں اور تاریخی حقائق سامنے لائے جاتے ہیں تو یہ لوگ بے دھڑک ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ابوطاہر عرفانی نام کے ایک گم نام شخص نے ایک کتابچہ 'حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عمر' لکھ کر یہ ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کی ہے کہ ان کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے وقت ۱۸، ۱۹ سال تھی۔ اس کتابچے پر منکرینِ سنت کے چکڑالوی گروپ کے ماہنامہ بلاغ القرآن میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرہ نگار نے ابوطاہر عرفانی کی کوشش کی تعریف کی ہے اور اسے اس لحاظ سے قابلِ قدر قرار دیا ہے کہ اس سے کتبِ احادیث بخاری، مسلم وغیرہ کی قدرومنزلت میں کمی آجائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بلاغ القرآن کا مفتی، ابوطاہر عرفانی صاحب پر بھی اعتراض کرتا ہے کہ 'روایات سے جس طرح یہ ثابت ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۶ یا ۷ برس تھی اور رخصتی کے وقت ۹ برس، ابوطاہر عرفانی صاحب اس کے مقابلے میں ۱۸، ۱۹ برس کے دعویٰ پر صریح روایت نہیں پیش کر سکے۔' اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود بلاغ القرآن کے تبصرہ نگار کو ابوطاہر عرفانی کی کوشش سے خوشی ہوئی ہے کہ اس سے بہرحال کتبِ حدیث کی حیثیت تو مجروح ہوگی۔

تبصرہ نگار کے نزدیک شادی کے لیے ہم عمر ہونا شرط ہے اس لیے اس کا مقصد اور اس کی

خواہش یہ ہے کہ احادیث وروایات کی بنیاد پر سرے سے گفتگو ہی نہ کی جائے بلکہ کتبِ احادیث و تواریخ کو دریا برد کر کے اپنی آزادرائے کی بنیاد پر سارے فتاویٰ جاری کیے جائیں۔

تبصرہ نگار کی یہ جاہلانہ جسارت دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کی جاسکتی ہے لیکن وہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے اس بات کو بنیاد بنا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریضاً توہین کرتا ہے کہ آپ کی شادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھاپے میں ہوئی۔ لکھتا ہے:

مگر افسوس ہے بخاری شریف کی صحت کو پایۂ اعتبار سے گرانے کے باوجود عرفانی صاحب نے جو خدمت انجام دی ہے، ہے تو قابل قدر، مگر اس کے سوا نہیں ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عائشہؓ کے ساتھ شادی ۵۴ برس کی عمر میں ہوئی آپ کا وصال ۶۳ برس کی عمر میں ہوا ہے۔ اور اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑھاپا نہیں آیا تھا۔ آپ نے جو عظیم انقلاب برپا کیا، سرزمینِ عرب کو اسلام کے زیرِ نگین کیا اور اس کے بعد قیصر و کسریٰ کو چیلنج کیا، یہ سارے کام ۵۴ برس کی عمر کے بعد کی کوششوں اور مجاہدانہ کارروائیوں، بدر، احد، احزاب، فتحِ مکہ، حنین اور تبوک کے نتیجے میں سرانجام پائے۔

لیکن بلاغ القرآن کا بے لگام اور گستاخ تبصرہ نگار آپ کو ۵۴ برس میں بوڑھا قرار دے کر اس بنیاد پر مذکورہ دل آزار جملے لکھ جاتا ہے۔ فقہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس انداز سے تعریضاً غیر شعوری طور پر بوڑھا کہنے کو بھی کفر قرار دیا ہے۔[۱]

اس بات کی ضرورت ہے کہ اس طرح کے دریدہ دہن اور آوارہ منش لوگوں کو لگام دی جائے اور ان پر توہینِ رسالت کے ارتکاب پر عدالت کے ذریعے حد جاری کرائی جائے۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۸۲ء)

☆.....☆.....☆

۱- دیکھیے: فتاویٰ عالمگیری۔

باب دوم

عقائد وایمانیات

لفظ خدا کی شرعی حیثیت

سوال: گذشتہ حج پر سعودی حکومت کی طرف سے رسالہ توعیہ اسلامیہ حاجیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں ایک مضمون 'کیا اللہ کو خدا کہنا صحیح ہے؟' نظر سے گزرا، جو بہت سے احباب کے لیے الجھن کا سبب بن گیا ہے۔ براہ کرم ہماری رہنمائی فرمائیں۔ رسالہ توعبہ اسلامیہ ارسال خدمت ہے۔

جواب: اس طرح کے اہم، دقیق اور نازک مسائل میں رائے دینے کے لیے کتاب و سنت کا وسیع اور گہرا علم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ ایسا شخص جو نہ محدث ہے، نہ مفسر ہے نہ فقیہ ہے نہ مفتی، اہلیت نہ رکھتے ہوئے فتویٰ جاری کر دیتا ہے اور اسے توعیہ سلامیہ جیسے رسالے میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ صرف فکری انتشار کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ جس کے لیے توعیہ اسلامیہ جیسے رسالے کو استعمال کرنے کی کسی طرح اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

جہاں تک نفسِ مسئلہ کا تعلق ہے تو اس بارے میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ 'خدا' کا استعمال شروع سے آج تک ہر دور اور ہر علاقے [عجمی] میں علما کے ہاں جائز رہا ہے۔ کسی کو بھی اس کے جواز کے بارے میں تردد نہیں ہوا۔ بالخصوص ہندو پاک کے ایسے مجددین اور مصلحین جنھوں نے فارسی زبان کو اظہار مافی الضمیر کا ذریعہ بنایا ہے اور اس زبان کی باریکیوں پر اچھی طرح عبور رکھتے تھے، انھوں نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے بعد دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے ائمہ نے اسے استعمال کیا ہے۔ اگر اس لفظ کے استعمال میں کوئی خرابی ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ عرصۂ دراز تک اس لفظ کا بلا نکیر استعمال ہوتا رہتا اور یہ 'منکر' جاری رہتا۔ قرآنِ پاک اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس امت کا گمراہی پر مجتمع ہونا کسی بھی دور میں اور کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ۲:۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تمھیں امت وسط بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر حق کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ بنے۔

لفظ 'خدا' کے بارے میں امت نے اپنے عمل سے آج تک یہی گواہی دی ہے کہ اس کا استعمال صحیح اور درست ہے۔اب امت کی اس گواہی کے مقابلے میں کسی ایک شخص کی رائے کا کیا وزن رہ جاتا ہے۔

اگر مضمون نگار کے زعم کے مطابق یہ بات ضروری ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو عربی زبان میں ہیں اور جن کا ذکر کتاب وسنت میں آیا ہے تو ضروری تھا کہ عجمیوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ان کو اس سلسلے میں خصوصی ہدایات جاری کی جاتیں اور یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہو جاتی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے دوسری زبانوں میں پائے جانے والے ناموں کا استعمال درست نہیں ہے۔اس طرح دوسری زبانوں میں استعمال ہونے والے نام اولاً تو ختم ہی ہو جاتے یا باقی رہتے تو صرف چند جاہل عوام میں۔ اہلِ علم میں ان کا استعمال سرے سے نہ پایا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جن ناموں کا استعمال اہلِ علم کے ہاں رائج رہا ہے ان کا استعمال شرعاً جائز ہے۔اسی بنا پر اہلِ علم نے اللہ کے اسما کو توقیفی قرار دیا ہے۔

مضمون نگار نے توقیفی ہونے کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس کا ذکر کتاب وسنت میں ہوا ہو حالانکہ اس میں کتاب وسنت کے ساتھ اجماع بھی شامل ہے۔ جو نام اجماع سے ثابت ہوں ان کا استعمال بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح کتاب وسنت سے ثابت ناموں کا استعمال جائز ہے۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

لَا يَصِحُّ وَضْعُ اِسْمِ اللّٰهِ بِنَظَرٍ اِلَّا بِتَوْقِيْفٍ مِّنَ الْقُرْآنِ اَوِ الْحَدِيْثِ اَوِ الْاِجْمَاعِ[1] اللہ تعالیٰ کے لیے [اپنی طرف سے] نام مقرر کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن یا حدیث،

۱- الجامع لاحکام القرآن، جلد ۹-۱۰، ص: ۳۴۳۔

یا اجماع سے اس کا ثابت ہونا ضروری ہے۔

ہمارے علم کے مطابق یہ مسئلہ اجماعی ہے اور ہر دور کے اہلِ علم اس کے استعمال پر متفق رہے ہیں۔ چند اہم بزرگوں کا کلام بطور نمونہ درج ہے:

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ فرماتے ہیں: باید دانست کہ اسماءِ الٰہی توقیفی اند[۱]۔ جاننا چاہیے کہ اسمائے الٰہی توقیفی ہیں۔

اسمائے الٰہی پر گفتگو کرنے اور اس کے بارے میں مذکورہ اصول کو بیان کرنے کے بعد متصلاً فرماتے ہیں: وکلام لفظی را نفی کردن وکلام خدا ناگفتن کفر است[۲]۔ کلام لفظی کی نفی کر دینا اور اسے خدا کا کلام نہ کہنا کفر ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بسم اللہ الرحمان الرحیم کا ترجمہ یہ کیا ہے: بنام خدائے بخشایندہ مہربان۔[۳]

انھوں نے الحمد للہ رب العالمین کا ترجمہ یہ کیا ہے: ستایشِ خدا است پروردگارِ عالمہا۔[۴]

اور ان الحکم الا للہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے: نیست حکم مگر خدا را۔[۵]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں: وایں قسم نیرنگہا از عجائبات معاملات خدا است[۶]۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: خدا خدا ہست و بندہ بندۂ او[۷] خدا خدا ہے اور بندے کا کام اس کی بندگی کرنا ہے۔

۱- مکتوبات مجدد، دفتر دوم حصہ ہفتم، مکتوب ۶۷ ص: ۴۲۔

۲- مکتوبات مجدد، دفتر دوم حصہ ہفتم، مکتوب ۶۷ ص: ۴۲۔

۳- قرآن پاک ترجمہ فارسی از شاہ ولی اللہ دہلویؒ، طبع تاج کمپنی کراچی، لاہور۔

۴- ایضاً۔

۵- ایضاً۔

۶- فتاویٰ عزیزی جلد ۱، ص ۲۲۔

۷- شیخ عبدالحق محدث دہلوی بحوالہ فتاویٰ نذیریہ جلد ۱، ص ۹۵۔

مولانا مودودیؒ لَآاِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ لَـهُ الْاَسْمَـآءُ الْحُسْنٰی کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اس کے بہترین نام ہیں۔[۱]

مضمون نگار کی یہ بات درست ہے کہ کسی نام کا ترجمہ نام نہیں ہوتا اور نہ کسی نام کا ترجمہ نام کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ کسی کے متعدد نام ہوں تو ایک نام کو دوسرے کی تشریح کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ لغت کا ایک عام اور معروف و مسلمہ اصول ہے جس سے لغت کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

امام ترمذی بـاب فـضل يوم الجمعة میں ابوالاشعث صنعانی کی روایت نقل کرتے ہیں اور پھر ابوالاشعث کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں: واشـعـث الـصنعاني اسمه شرحبيل بن آده اشعث کا نام شرحبیل بن آدہ ہے۔ اس طرح اشعث اور شرحبیل ایک شخص کے دو نام، ایک دوسرے کی تشریح میں ذکر کیے جائیں تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

اسی اصول کے پیشِ نظر حضرت علیؓ کے لیے 'حیدر کرار' اور 'ابوتراب' کے دو نام عام طور پر لفظ 'علی' ذکر کیے بغیر بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور حیدر کرار کی تشریح کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔

لفظِ خدا کی لغوی تحقیق پیش کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں: فارسی زبان [بولنے] والے اسم الٰہی کا ترجمہ 'خدا' کر کے تشریح یوں کرتے ہیں کہ خدا وہ ہے جس نے خود بخود ظہور فرمایا ہے، جیسے خودرو پیداوار۔

'جیسے خودرو پیداوار' مضمون نگار کا اپنا گستاخانہ اضافہ ہے۔ 'جس نے خود بخود ظہور فرمایا' میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے، بلکہ یہ تو بعینہٖ 'الظاہر' کا ترجمہ ہے، جو قرآن پاک میں وارد ہے۔ هُـوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِـرُ وَالـظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (الحدید۵۷:۳) وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور مخفی بھی۔

ہماری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خود بخود ظاہر ہونے میں کوئی اعتراض کا

۱۔ تفہیم القرآن جلد۳، سورۃ طٰہٰ:۸۔

پہلو ہو۔ چنداں ضرورت تو نہ تھی کہ لفظِ خدا کی کوئی مزید وضاحت، پیش کی جائے تاہم شرحِ صدر کے لیے فارسی کی دو معتبر لغات کی درج ذیل تشریحات ملاحظہ ہوں:

خدا: خدائے بضمۂ اوّل نام ذات باری تعالیٰ است ہمچو الہ واللہ۔[1] خدا، خدائے، پہلے حرف کے ضمہ کے ساتھ ذات باری تعالیٰ کا نام ہے جیسے الہ اور اللہ۔

خدا: مالک، صاحب، خود آنے والا۔ اس صورت میں یہ لفظ کلمہ 'خود' اور کلمہ 'آ' سے مرکب ہے، اس لیے کہ حق تعالیٰ اپنے ظہور میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ لفظ مطلق ہوتا ہے تو سوائے ذات باری تعالیٰ کے کسی دوسرے پر اطلاق نہیں ہوتا۔[2]

مضمون نگار نے 'خداوند' کے معنی 'مثیلِ خدا' کے کیے ہیں۔ یہ لغت نہیں بلکہ ان کا ذاتی اختراع ہے۔ اسی طرح اگر ایک لفظ 'مقید' ہو کر اللہ کے سوا دوسروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ 'مطلق' ہونے کی صورت میں اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے درست نہ ہوگا۔ لفظ رب، رحیم اور دوسرے بے شمار نام اللہ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور غیر اللہ کے لیے بھی، البتہ لفظ 'خدا' جب مطلق ہو تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔[3]

لغاتِ کشوری کی دی گئی تشریح کے مطابق لفظ 'خدا' لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس جس طرح اللہ کو لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کہنا درست ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ اسی طرح خدا کہنا بھی درست ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ نام جمعہ کی [قبولیت دعا کے لیے خاص] گھڑی کی طرح قرآن وسنت میں مخفی رکھ دیے گئے ہیں انھیں وہاں سے تلاش کیا جائے۔

اسی طرح ابن عربیؒ، ابن تیمیہؒ اور دوسرے تمام محققین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ ترمذی کی ایک روایت میں اور بعض دیگر روایات میں جن ننانوے ناموں کی تعیین کی گئی ہے یہ نبی صلی اللہ

۱- برہان قاطع

۲- لغات کشوری

۳- لغات کشوری

علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کے لیے ان ۹۹ ناموں کے علاوہ اور بہت سے نام بھی ہیں، البتہ جنت کا وعدہ ۹۹ ناموں کے ساتھ متعلق ہے۔[1]

اس لیے مضمون نگار کا ۹۹ ناموں کو متعین کر کے ان کے علاوہ باقی ناموں کی نفی کرنا بھی اس مسئلے سے اس کی جہالت کی دلیل ہے۔

ابن عربی نے کتاب وسنت سے ان مخفی ناموں کی تلاش کرتے ہوئے تیسرے نمبر پر 'الکائن' کے نام کا ذکر کیا ہے۔ جس کا بہترین معنی صرف 'خدا' ہوسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

اَلْکَائِنُ وَھُوَالْمَوْجُوْدُ قَبْلَ کُلِّ شَیْءٍ وَبَعْدَ کُلِّ شَیْءٍ[2] ایک نام الکائن ہے اور اس کا مطلب ہے: ہر چیز سے پہلے اور ہر چیز کے بعد موجود رہنے والا۔

مضمون نگار نے سورۂ اعراف کی آیت [۱۸۰] کی روشنی میں لفظ 'خدا' کے استعمال کو الحاد قرار دیا ہے۔ حالانکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لے کر مولانا مودودیؒ تک متعدد مترجمین نے خود اس آیت کے ترجمے میں بھی لفظ 'خدا' کا استعمال کیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مضمون نگار اس مسئلے کے بارے میں کتنی معلومات رکھتے ہیں اور ان کا مبلغِ علم کیا ہے۔

اگر بقولِ مضمون نگار اللہ تعالیٰ کے لیے دوسری زبانوں کے ایسے ناموں کا استعمال بھی الحاد میں شامل ہے جس کے استعمال پر تعاملِ امت رہا ہے تو پھر مضمون نگار کے علاوہ ساری امت کو نعوذ باللہ ملحد ماننا پڑے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح ہر شخص کو کسی مریض کا آپریشن کرنے کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جاسکتی جب تک وہ اس فن میں ماہر نہ ہو، اسی طرح اسلام کے کسی مسئلے کے بارے میں بھی مطلوبہ اہلیت کے بغیر کسی کو رائے زنی کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔ خصوصاً توعیہ اسلامیہ [کی انتظامیہ] کو اس مضمون کی اشاعت پر اس بات کا نوٹس لینا چاہیے کہ ایک ایسا آدمی جس کی رائے اس مضمون پر کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اسے رسالے میں کیونکر جگہ دی گئی؟

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۸۳ء)

۱۔ فتاویٰ ابن تیمیہ ج۶ ص۳۸۰-۳۸۲

۲۔ احکام القرآن: ج۲، ۸-۹

الوہیت وعبدیت

سوال: میں آپ کی توجہ ایم۔اے کے لیے لکھی گئی کتاب بعنوان مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ (مؤلفہ: غلام رسول ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی، گورنمنٹ کالج لاہور، شائع کردہ علمی کتب خانہ اردو بازار، لاہور) کی ایک عبارت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

مؤلف کتابِ مذکور کے ص۶۳۴ پر خصائصِ نبوت [علی صاحبہا الصلاۃ والسلام] کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپؐ کی ایک صفت 'الوہیت کا مظہرِ اتم' بیان کرتا ہے۔وہ کہتا ہے:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مظہرِ اتمِ الوہیت ہیں۔ان کا کلام خدا کا کلام، ان کا ظہور خدا کا ظہور، ان کا آنا خدا کا آنا ہے۔قرآن مجید میں آیا ہے: قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ، اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱) حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل نے بھاگنا تھا۔

حق سے مراد اللہ تعالیٰ، قرآن کریم اور رسول کریم ہیں۔پھر فرمایا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم ۵۳:۳-۴) اور وہ ہوائے نفس سے بات نہیں کرتے، ان کی بات نہیں ہے مگر وہ وحی ہے جو اسے کی جاتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایک اور آیت میں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح ۴۸:۱۰) اے نبیؐ! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مجازی طور پر اپنی ذات قرار دے دیا ہے۔اس طرح ایک اور آیت ہے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (الانفال ۸:۱۷) [تُو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا]

میں نے پوری دیانت داری سے مکمل پیراگراف نقل کر دیا ہے۔مذکورہ خیالات کے بارے

میں آپ کی کیا رائے ہے؟ نیز آیاتِ مذکورہ کی صحیح تاویل کیا ہے؟

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ مؤلف کتابِ ہذا کے ص ۴۸۳ تا ۴۸۹ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت یا مظہرِ الوہیت کی پرزور تردید کرتا ہے۔ آپ کو بشر ثابت کرتا ہے حالانکہ یہی دلائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔ کتابِ مذکور کے صفحہ ۱۸۳ پر 'فلسفہ ویدانت کے اثرات' کے تحت مؤلف رقم طراز ہے:

''اس فلسفہ نے صرف ہندوؤں کے ذہنوں اور عقلوں کو متاثر نہیں کیا بلکہ یہ فلسفہ مسلمانوں کے صوفی طبقے پر [بھی] اثر انداز ہوا ہے۔ وہ طبقہ وجودی صوفیا کہلاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوالحسین حلاج ہندوستان آئے جہاں جوگیوں کی صحبت میں رہے اور اس فلسفے کے اثرات لے کر یہاں سے گئے۔ اسی فلسفے کے سرخیل شیخ محی الدین ابن عربی فصوص الحکم کے کلمۂ اسماعیلیہ میں فرماتے ہیں:

فلا تنظر الی الحق وتعربه عن الخلق
ولا تنظر الی الحق وتكسوه سوی الخلق
ونزهه وشبّهه وكن في مقعدالصدق
وكن في الجمع ان شئت وان شئت ففي الفرق
ولا يلقی عليك الوحی
وفی غيره لاتلق

[یعنی خدا کو مخلوق سے الگ کر کے مت دیکھو۔ نہ خدا کو لباس غیریت پہنا کر دیکھو۔ اس کی صفات تشبیہی اور تنزیہی پر ایمان رکھو اور مقام صدق پر کھڑے ہو جاؤ۔ اور اگر تم چاہو تو مقام جمع میں ہو جاؤ یا مقام تفریق پر۔ اگر تو اس کا غیر ہے تو نہ تجھ پر اس کی وحی آ سکتی ہے اور نہ اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔]

ہمارے وجودی صوفیا نے صفاتِ الٰہیہ سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خواہ

روحانیت کے کتنے بلند مقام پر پہنچ جائے وہ عبدیت کی آلائش سے پاک نہیں ہوسکتا ہے۔''
پیراگراف اول اور دوم میں ایک وسیع تناقض نظر آتا ہے۔ مصنف کے دونوں خیالات میں کس طرح تطبیق ہوسکتی ہے؟

ایم۔اے کے اکثر طالب علم یہ کتاب پڑھتے ہیں اور یہ کتاب نہ صرف بہت سی الجھنیں پیدا کرتی ہے، بلکہ گمراہ کن نظریات کی اشاعت بھی کرتی ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں بلکہ اگر ممکن ہو تو اس مصنف سے رابطہ قائم کر کے ان کی توجہ ان تضادات کی طرف مبذول کرائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہوسکے۔ یہ بھی نہی عن المنکر کے ضمن میں آتا ہے اور اجر و ثواب کا موجب ہے۔

جواب: آپ نے غلام رسول ایم۔اے کی کتاب مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ سے جو اقتباسات نقل کر کے بھیجے ہیں انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا ذہن صاف نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کے لیے 'الوہیت کا مظہرِ اتم' کا عنوان قائم کر کے جو تشریح کی گئی ہے اس میں وہی انداز ہے جو عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اختیار کرتے ہیں یا پھر مرزا غلام احمد قادیانی نے عیسائی لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد بزعم خود نبوت کے منصب پر فائز ہونے کی خاطر اپنایا ہے۔ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱)[اعلان کردو کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا]۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال ۸:۱۷)[اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا]۔ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ (الفتح ۴۸:۱۰)[اے نبی! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے] اور دیگر آیات کی تشریح میں یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مجازی طور پر اپنی ذات قرار دیا ہے، قرآن پاک کی تحریف ہے اور اس کا مقصد غالباً یہی ہے کہ طلبہ کو غیر محسوس طریقے پر اس بات کا قائل کرلیا جائے کہ جس طرح رسول مجازی طور پر خدا ہوسکتا ہے

اسی طرح کوئی اور شخص مجازی، ظلّی اور بروزی طور پر نبی بن سکتا ہے۔ ان آیات کی صحیح تفسیر مکمل طور پر آپ تفہیم القرآن اور دیگر تفاسیر سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مختصر طور پر اس کی تشریح یہ ہے کہ قل جاء الحق میں حق سے نظام حق اور باطل سے نظام باطل مراد ہے اور وما رمیت کا معنی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر کفار پر اللہ کے حکم سے اپنی مٹھی میں مٹی لے کر پھینکی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے کفار کی آنکھوں میں پہنچا دیا تھا، اسی کو آیت مذکورہ میں اس انداز سے بیان کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے اللہ کے اذن سے جو مٹی پھینکی تھی، اس کا پھینکنا تو آپ کا کام تھا، لیکن کفار کی آنکھوں میں پہنچانا اللہ تعالیٰ کا فعل تھا، آپ کا فعل نہ تھا۔ اسی طرح جن لوگوں نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی، ان کی اس بیعت کو اللہ کے ہاتھ پر بیعت بایں معنی قرار دیا گیا کہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کا وسیلہ اور ذریعہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا تھا۔ اس مدعا کو اسی حدیث پاک کی روشنی میں سمجھنا چاہیے جس میں آپ نے فرمایا: فَمَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہ (بخاری) جس نے میری اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا ہی کی اطاعت کی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو خدا ہی کے احکام وفرامین پر عمل کرنے اور کرانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

مناسب ہوگا کہ محکمہ تعلیم اور حکومت سے ایسی عبارات کو تبدیل کرانے کا پرزور مطالبہ کیا جائے۔ نیز زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اسلامی اعتقادات واحکام کی وضاحت اور تقابلِ ادیان کے موضوعات پر سنجیدہ، مستند اور عوام کا اعتماد رکھنے والے حضرات سے کتابیں لکھوائی جائیں یا کم از کم ان سے نظر ثانی کرائی جائے۔

(ترجمان القرآن: نومبر ۱۹۸۲ء)

'محمد' نام رکھنا

سوال: پاکستان کے سکولوں میں پڑھائے جانے والے عربی نصاب میں نامِ محمد کو عام فقروں میں استعمال کیا گیا ہے اور کئی جگہوں پر ساتھ تصویر بھی بنائی گئی ہے میرے خیال میں یہ طرز عمل درست نہیں اور اس پر میرے پاس درج ذیل دلائل قابل غور ہیں:

۱- جیسے اللہ کریم کا ذاتی نام اللہ ہے ویسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نام محمد ہے جو نہ کسی دوسرے کی پہچان ہے اور نہ کسی اور کو اس نام سے پکارا جا سکتا ہے۔

۲- قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اے مومنو! تم آپس میں جس طرح ایک دوسرے کا نام لے کر اور چیخ چیخ کر پکارتے ہو اس طرح میرے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارنا۔ اگر ایسا کرو گے تو تمھارے اعمال ضائع کر دیے جائیں گے: لَاتَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (النور۲۴:۶۳) لَاتَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (الحجرات۴۹:۲)

۳- کوئی مسلمان اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ماں باپ، اولاد، جان و مال اور ہر چیز سے زیادہ عزیز نہ سمجھے: لَايُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔[1]

۴- وہ مسلمان بڑا ہی بد بخت ہے جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔

۵- ایک جگہ ارشاد ہوا کہ تم اپنے لڑکے کا نام محمد رکھو تو اس کی عزت کرو، اس کا ادب کرو، وہ آئے تو اس کے لیے مجلس میں جگہ کشادہ کرو، اس کی طرف برائی کی نسبت نہ کرو۔ اس کے لیے برائی کی دعا نہ کرو بلاشبہ اسی کا نام ادب ہے۔[2]

۱- التاریخ الکبیر للبخاری، ج۷، ص۲۲۵۔

۲- اس کے بعد سائل نے اپنے دلائل کی لمبی تشریح کی ہے جسے اس مجموعے میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جواب میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ (مرتب)

جواب: آپ کا مطبوعہ استفسار ملا جسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کو 'محمدؐ' کے مبارک نام کے بارے میں بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے اور آپ اس کے استعمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں سمجھتے۔ جس طرح لفظ 'اللہ' کا استعمال کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں اسی طرح آپ کے بقول لفظ 'محمدؐ' کا استعمال بھی کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں۔

مزید برآں آپ نے اپنے استفسار کا عنوان وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ درج کر کے اس آیت سے بھی یہ غلط مفہوم لیا ہے کہ محمد نام صرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ حالانکہ آیت کا مقصد یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف اللہ کے رسول ہیں اور آپ کی ذات میں رسالت کی صفات پائی جاتی ہیں نہ کہ خدائی صفات۔

اس کے بعد آپ نے آیت لاتجعلوا دعاء الرسول آیت لاترفعوا اصواتکم اور حدیث لایومن احدکم ذکر کی جن میں ذات رسولؐ کے آداب کا ذکر ہے، اسے آپ نے لفظ 'محمدؐ' کا ادب سمجھ لیا ہے۔ پھر یہ حدیث کہ 'وہ شخص بڑا ہی بد بخت ہے جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے' کا تعلق بھی لفظ 'محمدؐ' سے نہیں بلکہ ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اسی لیے حدیث میں 'میرا نام لیا جائے' کے الفاظ آئے ہیں 'لفظ محمد بولا جائے' کے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ نے اسے بھی لفظ 'محمدؐ' کے بولنے کا حکم بنا دیا۔

آپ نے پانچویں نمبر پر جو دلیل دی ہے اگر آپ نے اس کے ان الفاظ پر غور کر لیا ہوتا تو آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے کہ لفظ محمد نہ کسی دوسرے کی پہچان ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کسی دوسرے کی پہچان نہیں اور اس نام سے کسی دوسرے کو پکارا بھی نہیں جا سکتا تو اس بات کا کیا مطلب ہوگا کہ 'تم اپنے لڑکے کا نام محمد رکھو' کیا نام پہچان کے لیے اور پکارنے کے لیے نہیں ہوتا؟ اگر نام ان اغراض کے لیے نہیں ہوتا تو نام رکھنے کی اور کیا غرض ہوتی ہے۔ اور اگر یہ نام کسی کے لیے پہچان نہیں ہے تو پھر اس نام کی بنا پر اس کے لیے ادب اور لحاظ کس بنا پر ہے؟

آپ نے اس سلسلے میں، کہ جن لوگوں کے نام محمد رکھے گئے انھیں ان کی ولدیت کے

بغیر کبھی نہیں پکارا گیا، جو مغالطہ کھایا ہے وہ بھی عجیب وغریب قسم کا مغالطہ ہے۔اصل بات یہ ہے کہ جب بہت سے لوگ ایک نام میں شریک ہوں تو ان کے تعارف کے وقت ان کی نسبت ذکر کی جاتی ہے۔مثلاً جب تاریخ میں اس کا ذکر کیا جائے گا یا راوی کی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا جائے گا تو اس کی نسبت کا تذکرہ ضروری ہوگا۔ایسی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ بھی نسبت کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور 'محمد بن عبداللہ' کہا جاتا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باپ اپنے اس بیٹے کو ولدیت کے ذکر کے بغیر نہ پکارے جس کا نام محمد ہو اور وہ بھی اسے 'یا محمد' نہ کہے بلکہ 'یا محمد بن فلاں' کہے اور اس وقت بھی اس نام کے ساتھ درود پڑھے۔کنیت کا جو رواج قرون اولیٰ اور بعد تک رہا، وہ اب بدل گیا ہے۔اب بہت سی دوسری نسبتیں امتیاز کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔مثلاً اصغر گونڈوی، علامہ اقبال، احسن فاروقی، کمال سید، جگر مراد آبادی، درد ٹونکی، عباس باوزیری وغیرہ۔

اس سلسلے میں اصل حکم یہ ہے کہ محمد نام رکھنا جائز ہے۔'یا محمد' کہہ کر اس شخص کو پکارنا جائز ہے جس کا نام محمد ہو۔اس نام کا شخص دوسرے لوگوں کی طرح احکام وقوانین کا پابند ہوگا۔اگر وہ چھوٹوں پر شفقت کرے گا، بڑوں کا ادب کرے گا، باپ اور استاد کی خدمت کرے گا، نیک کام کرے گا تو اس پر اجر کا مستحق ہوگا، برا کام کرے گا تو اس پر اسے سزا دی جائے گی۔

حدیث میں محمد کے نام کی وجہ سے جس ادب کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی حد اتنی ہے جتنی عام اچھے ناموں کے لیے رکھی گئی ہے۔یہ لامحدود نہیں ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نام کی بدولت انسان تمام پابندیوں سے بالاتر ہو گیا ہے۔دراصل جب بچے کا نام رکھا جاتا ہے تو اس میں اچھی توقعات کو بنیاد بنا کر کوئی اچھا نام رکھا جاتا ہے اور نام ان توقعات کا اظہار کرتا ہے۔بعض اوقات اونچے درجے پانے والے شخص کے نام کو لے لیا جاتا ہے تاکہ اس نام کا آدمی بھی ان معانی کا مصداق بنے۔لیکن یہ ماں باپ اور نام رکھنے والے کی آرزوئیں ہوتی ہیں۔رہی یہ بات کہ اس نام کا شخص لازماً ایسا ہو کہ نام رکھنے والوں کی آرزوئیں اونچے، متوسط یا ادنیٰ درجے میں پوری

ہوں، ضروری نہیں ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنے نام کے بالکل برعکس نکلے۔ مختصراً یہ کہ نام ایک وجہ ہے جو رعایت کا مطالبہ کرتی ہے۔ حدیث میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اگر کام رعایت کو ختم کر دینے کا تقاضا کرتا ہو تو اس وقت نام اور کام دونوں کے تقاضے پورے کیے جائیں گے اور اس شخص کی اتنی ہی رعایت کی جائے گی جس کا وہ مستحق ہے اور سرے سے رعایت کا مستحق نہ رہے تو کوئی رعایت نہ کی جائے گی۔

اس تمہید کی روشنی میں عربی کتاب کے بارے میں آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں 'محمد' سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد نہیں ہیں اس لیے یا محمد ماھذا وغیرہ کے کلمات بلا کراہت جائز ہیں۔ البتہ بہتر تھا کہ عنوان میں 'محمد' کی ولدیت یا کوئی نسبت خاص ذکر کر دی جاتی تا کہ اس بات کی قطعی صراحت ہو جاتی کہ یہاں 'محمد' سے فلاں شخص مراد ہے لیکن ایسا کرنا اولیٰ تھا، ضروری نہیں۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر 'حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کا عنوان نہ ہو تو اس سے خود بخود بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں محمد سے آپؐ نہیں بلکہ کوئی دوسرا شخص مراد ہے۔

آپ نے اچھا کیا کہ اہلِ علم سے استصواب و استفسار کے لیے مراسلہ جاری کیا۔ اس طرح کے باریک مسائل کے لیے قرآن و حدیث اور فقہ کے گہرے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان علوم میں مہارت کے بغیر کسی بھی شخص کو محض اپنے ذہن میں ایک خیال کو نہیں بٹھا لینا چاہیے۔ اور اس کی بنیاد پر جائز و ناجائز، حلال و حرام کے فتوے دینا تو انتہائی خطرناک راستہ ہے، جس سے بہرحال اجتناب کرنا چاہیے۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۸۵ء)

حقیقتِ محمدیہ ؐ

سوال: علامہ ابوالخیر اسدی کی ایک تحریر ارسال خدمت ہے۔ براہِ کرم اس کا جائزہ لے کر اس کے بارے میں ذرا مفصل عالمانہ،محققانہ اظہار رائے فرمائیں۔توقع ہے کہ جانچ پڑتال کر کے مسلکِ اعتدال واضح فرمائیں گے۔

جواب: علامہ ابوالخیر اسدی کی علمی آرا کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ہم اس طرح کی فلسفیانہ بحثوں میں نفیاً یا اثباتاً الجھنے کے قائل نہیں۔حقیقتِ محمدیہؐ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بالذات اور دوسرے انبیا کی نبوت بالعرض،ختمِ نبوت مرتبی اور زمانی کی کسی ایک تعبیر وتشریح کو فیصلہ کن اور اصل قرار دے کر اس کی تائید وتردید میں لگ جانا، ہمارے نزدیک تضیع اوقات ہے۔ ان اصطلاحات سے ہٹ کر مثبت انداز میں اسلامی افکار ونظریات کی اشاعت کی جا سکتی ہے۔ آپ 'حقیقت محمدیہؐ' کی اصطلاح کو زیر بحث لائے بغیر بھی کہہ سکتے ہیں کہ'یہ کائنات اپنی خلق اور بقا میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے اور یہ کہ اللہ کی طرف اس احتیاج میں دوسری مخلوق کی طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں'۔'نبوت بالذات اور بالعرض' کا حوالہ دیے بغیر تمام انبیا پر ایمان اور لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ کے عقیدے کی دعوت وتبلیغ کی جاسکتی ہے۔ختم نبوت مرتبی اور زمانی کی بحث میں الجھے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔جب حقیقتِ محمدیہؐ ختمِ نبوت 'مرتبی' اور 'زمانی' کے اربابِ اصطلاح خود اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ کائنات اپنی بقا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہے اور آپؐ کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے تو آپ ان پر اپنی تحقیق کی بنیاد پر ان اصطلاحات سے انھی مفاہیم کو کیونکر لازم کرتے ہیں۔ہوسکتا ہے کہ آپ کی تحقیق کے مطابق یہ اصطلاحات انھی مفاہیم کو مستلزم ہوں اور اس کے قائلین کی تحقیق کے مطابق یہ ان مفاہیم کو مستلزم نہ ہوسکیں،البتہ ہدایت وگمراہی کا مدار بنائے بغیر علمی بحث کے طور پر ہر عالم حق رکھتا ہے کہ وہ ان اصطلاحات کے بارے میں اپنی رائے پیش کرے اور اسے علمی دائرے تک محدود رکھتے ہوئے اپنی رائے کو دعوت وتبلیغ کا مسئلہ نہ بنائے۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۸۴ء)

گناہ اور مغفرت

سوال: ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ افراد کے ایک سنجیدہ حلقے میں یہ بحث چھڑی کہ گناہ گار مسلمان کیا اپنے گناہوں کی سزا پائیں گے یا نہیں؟ اگر انھیں گناہوں کی سزا ملی تو کیا وہ دوزخ ہی کے کسی حصے میں دی جائے گی یا دوزخ سے جدا کسی اور مقام پر؟ کیا دوزخ والے اہلِ ایمان کا وہاں قیام ہمیشہ ہوگا یا عارضی طور پر؟ اس بحث میں دینی علوم سے بہرہ مند افراد سے رجوع کیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں سعودی مشن کے ایک فاضل ممبر کو خصوصی طور پر بلایا گیا۔ خیال تھا کہ وہ کافی وشافی جواب فراہم کریں گے مگر ان کے خطاب نے خود احادیث نبوی کے بارے ذہنوں میں کئی سوالیہ نشان پیدا کر دیے ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان گناہ گاروں کو بخش نہیں دے گا وہ گویا تعلیماتِ اسلام کی توہین کر رہا ہے، انھوں نے بعض ایسی احادیث پیش کیں جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات اپنا ہاتھ دراز کر دیتا ہے کہ دن بھر شرک کے علاوہ جملہ گناہ کرنے والے اشخاص مغفرت طلب کریں اسی طرح ہر صبح اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے کہ رات بھر گناہ وعصیان کا ارتکاب کرنے والے اس کے نیچے پناہ گزین ہو جائیں اور وہ انھیں بخش دے۔ انھوں نے وہ حدیث بھی سنائی جس میں محض ایک کتے کو پانی پلا دینے والی عورت کو بخشش کا پروانہ مل گیا اور فقط ایک بلی کو ہلاک کر دینے والی صالحہ وعابدہ کو جہنم میں ڈال دیا گیا۔ انھوں نے یہ حدیث بھی پیش کی کہ اگر تم لوگوں نے گناہ نہ کیے تو اللہ تعالیٰ تمھیں فنا کر کے اور مٹا کر نئی امت پیدا کر دے گا اور ان سے گناہ کرائے گا۔ (الفاظ قابل غور ہیں) جب وہ گناہ کریں گے تو انھیں کہے گا کہ بخشش مانگو تو پھر انھیں مغفرت سے نوازے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مبین میں بندوں سے کیسے رویے کا مطالبہ کرتا ہے؟ گناہ ونافرمانی کا یا اطاعت وفرماں برداری کا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی

تقاضا یہی ہے کہ تمام انسان خدا اور اس کے رسول کی اطاعت اختیار کریں۔ پھر کتاب وسنت کی معروف تعلیم یہی ہے کہ خدا کی زمین پر ظلم وعصیان، فتنہ وفساد، بغاوت اور سرکشی کی روش کا مومن مقابلہ کریں۔ انسانیت کو گندے اور شیطانی ماحول سے نجات دلانے کے لیے جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں، خدا کی زمین کو اشرار شیاطین اور طواغیت کے غلبے سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔ ایسے کام کرنے والوں کا اجر کتاب حکیم اور احادیث میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مومنانہ روش کے علی الرغم ایسا طرز عمل اپنانے والوں کے انجام کی خبر بھی پوری تفصیلات کے ساتھ قرآن وحدیث میں آئی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ مذکورہ عالم دین کے مذکورہ فتویٰ سے حق کا کام کرنے والوں کے لیے جیسی فضا پیدا ہونے کا امکان ہوسکتا ہے اور گناہوں کے معاملے میں بے باکی عام ہو جانے کا احتمال ہوسکتا ہے، اسی نے مجبور کیا ہے کہ آپ کو خط لکھ کر متوازن رائے لی جائے، اب آپ سے بالاختصار جن سوالات کے جواب مطلوب ہیں وہ یہ ہیں:

۱- شرک سے محفوظ لیکن باقی گناہوں میں ملوث مسلمان کیا دوزخ میں جاسکتے ہیں؟

۲- کیا دوزخ میں انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈالا جائے گا یا کسی محدود مدت کے لیے؟

۳- اعمال اور احساس دونوں میں کوئی تطابق وتعلق ہے یا ایک برے اعمال رکھنے والا شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کی آس لگالے تو یہ امید وآس کیا اس کے اعمال کو دھودے گی؟

۴- اللہ تعالیٰ کے نزدیک اطاعت کی اہمیت زیادہ ہے یا گناہ کے ساتھ احساسِ ندامت کی؟

۵- متذکرہ بالا ایک حدیث اگر صحیح ہے کہ 'اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بصورت گناہ نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ تمھیں مٹا کر ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے گناہ کرائے گا اور پھر انھیں مغفرت سے نوازے گا'۔ تو پھر شیطان گویا اللہ تعالیٰ کا منشا ہی تو پورا کر رہا ہے۔ اسے مطعون کرنا یا خدا کے نافرمانوں میں اصلاح وتعمیر کی کوشش کرنا بے معنی وفضول ہے بلکہ خدا کے منشا کے خلاف ہے۔ (العیاذ باللہ)

براہ مہربانی مناسب ومتوازن نکتہ نظر سے قرآن وحدیث اور علمائے امت کی آرا کے حوالوں کے ساتھ آگاہ فرمائیں، ممنون ہوں گا۔اس بحث میں شریک تمام لوگ تحریک اسلامی کے متفق نہیں ہیں،لیکن مولانا مودودیؒ کا اس سلسلے میں جو موقف ہے وہ بھی مکمل آجائے تو تسلی کے لیے کافی ہوگا۔

جواب: آپ کے تمام سوالوں کا دوٹوک اور مختصر جواب قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں آجاتا ہے:

قُلْ يَـا عِبَـادِيَ الَّـذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ o وَاَنِيْبُوْآ اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ. (الزمر ۳۹:۵۳-۵۴) اے نبی! کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفور اور رحیم ہے۔ پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع ہو جاؤ اس کے، قبل اس کے کہ تم پر عذاب آجائے پھر کہیں سے تمھیں مدد نہ مل سکے۔

۱- ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بندگی اور اطاعت کی طرف پلٹ آنے سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ آیت میں پیش کردہ اسی اصول کی بنیاد پر کفار و مشرکین کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے۔ کفر اور شرک سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا جب توبہ اور اطاعت کی طرف پلٹ آنے سے کفر و شرک معاف ہو جاتے ہیں تو باقی گناہ بدرجہ اولیٰ توبہ اور انابت سے معاف ہو سکتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ آیا توبہ و انابت کے بغیر بھی گناہ معاف ہو سکتے ہیں یا نہیں تو اس سلسلے میں سورۃ النساء کی یہ آیت روشنی ڈالتی ہے:

اِنَّ اللّٰـهَ لَا يَـغْـفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا. (النساء ۴:۴۸) اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے

ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

اس آیت میں شرک کی عدمِ مغفرت اور شرک کے ماسوا گناہوں کی بخشش کو تحت المشیت قرار دیا گیا ہے۔ اس تقابل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں زیرِ بحث مغفرت وہ ہے جو توبہ کے بغیر ہو۔ اس لیے کہ توبہ کے ساتھ تو شرک کی مغفرت بھی ہو جاتی ہے لیکن یغفر مادون ذٰلك کے الفاظ کے ساتھ لمن یشاء کی قید ہے۔ یعنی اللہ چاہے گا تو بخشش کرے گا، نہیں چاہے گا تو بخشش نہیں ہوگی۔

قرآن و حدیث سے جو اصول ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت الل ٹپ نہیں ہوتی بلکہ کسی قاعدے اور ضابطے کے تحت ہوتی ہے۔ لہٰذا آیت سے تو اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ شرک اور کفر کے سوا باقی تمام گناہ قابلِ معافی ہیں۔ رہی یہ بات کہ کن کے لیے معافی ہے اور کن کے لیے نہیں تو یہ اللہ کی مشیت کے سپرد ہے۔ لیکن اللہ کی مشیت بغیر کسی استحقاق کے نہیں ہوتی اس لیے جو لوگ بخشش کے مستحق ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کی بخشش کرے گا اور جو مستحق نہ ہوں گے، ان کی بخشش نہیں کرے گا۔

بخشش کے استحقاق کے لیے جو اصول اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان میں ایک اصول توبہ و استغفار کا ہے، جس سے ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے بشرطیکہ توبہ و استغفار حقیقی ہو اور اللہ تعالیٰ اسے قبول بھی کر لے۔ لہٰذا کفر و شرک کے علاوہ بھی جس گناہ سے کسی نے مقبول توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرما دے گا۔

۲۔ نیکیوں اور برائیوں کا موازنہ کرنے کے بعد نیکیوں کے غلبے کی وجہ سے معافی ہوگی وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا۔ (الانبیاء ۲۱:۴۷) ہم قیامت کے روز انصاف کے ترازو لگا دیں گے اس لیے کسی نفس پر ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔ (الزلزال ۹۹:۸۔۷) جس نے ذرہ برابر نیکی کی اسے وہ دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی اسے بھی دیکھے گا۔

وَوُضِعَ الۡكِتَابُ فَتَرَى الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡهِ وَیَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَا لِهٰذَا الۡكِتَابِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَةً وَّلَا كَبِیۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصَاهَا وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا وَلَا یَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا۔ (کہف ۱۸:۴۹) اور کتاب عمل سامنے لا کر رکھ دی جائے گی۔ پھر یہ منظر آپ کے سامنے آئے گا کہ مجرمین اس کے مندرجات سے کانپ رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی، اس کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نے کسی بھی چھوٹی بڑی چیز کو نہیں چھوڑا لوگ اپنے اعمال کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

۳۔ بعض نیکیاں اس قدر وزنی ہوں گی اور مقبول ہو جائیں گی کہ وہ پچھلے باقی گناہوں پر غالب آ جائیں گی اور ان گناہوں سے توبہ کی توفیق کا سبب بن جائیں گی۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدری صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: لَعَلَّ اللّٰهَ اِطَّلَعَ عَلٰی اَهۡلِ بَدۡرٍ فَقَالَ اعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ فَقَدۡ غَفَرۡتُ لَكُمۡ۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب فضل من شہد بدراً۔۳۹۷۲) تمھیں معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو دیکھ لیا اور فرمایا: 'تم جو چاہو کرو میں نے تمھاری مغفرت فرما دی'۔

اہل بدر کی اس مغفرت کا یہ مطلب نہیں کہ اب ان کو اطاعت سے آزادی مل گئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت کا حال اللہ کو معلوم ہو گیا ہے اور وہ امتحان میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جو کچھ ان کے بارے میں اسے معلوم کرنا تھا وہ اسے معلوم ہو گیا ہے۔ اس لیے اب وہ اطاعت پر رہیں گے، اگر بشری کمزوری کی وجہ سے کوئی گناہ ان سے سرزد ہو گیا تو وہ توبہ و استغفار کے ذریعے اپنی تلافی کر لیں گے۔

۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے متعلق بظاہر ایک معمولی کام کی وجہ سے مغفرت کی خبر

دے دی ہو وہ اپنی جگہ درست ہے۔ وہ بظاہر معمولی کام حقیقتاً بہت بڑا کام ہوتا ہے لیکن ہماری نظر میں وہ معمولی ہوتا ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ ایک ہی کام مختلف افراد کے لحاظ سے معمولی اور غیر معمولی قرار پاتا ہے۔ جس بدکار عورت کو ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر بخش دیا گیا۔[۱] اس کا یہ کام اس کے اعتبار سے اور اس کے قلبی جذبات و احساسات اور اخلاص کے لحاظ سے بڑی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر بدکار کے لیے ایسا کرنے سے گناہ معاف ہو جائیں گے بلکہ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی گناہ گار کا ایسا کام اسی عمل کی طرح وزنی ہو جائے جس طرح اس بدکار عورت کا عمل وزنی ہو گیا تھا۔

اس سے یہ چیز واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ جو شخص محض اس بنا پر، کہ شرک کے علاوہ باقی گناہوں کی معافی کی گنجایش موجود ہے، اپنے لیے واقعی معافی کے ہم معنی قرار دے کر گناہوں میں منہمک رہے تو وہ شیطان کے دھوکے اور غرورِ نفس کا شکار ہے۔ اسے جتنی جلد ممکن ہو اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔

۵۔ اگر کسی کا گناہ معاف نہ ہوا اور اسے اس کی سزا بھگتنا پڑی تو کفر و شرک کے علاوہ کسی بھی گناہ کی سزا خلود فی النار نہیں ہے۔ ایسا شخص اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد اپنے ایمان کی جزا بھی پائے گا اور گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ایمان کی جزا دائمی ہو گی۔ اس چیز کو حدیث میں یوں واضح فرمایا گیا:

يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ۔ (بخاری، کتاب الایمان باب ۱۵، حدیث ۲۲، باختلافِ الالفاظ) جہنم سے ہر اس آدمی کو نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا۔

حدیث: اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ کسی ایسی امت کو پیدا کرے گا جو گناہ کرے،[۲] کا مطلب

۱۔ بخاری، کتاب بدء الخلق باب ۱۷، حدیث ۳۳۲۱

۲۔ ترمذی، کتاب الدعوات، باب ۹۹، حدیث ۳۵۳۹

گناہوں کی ترغیب نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان سے گناہ سرزد ہو ہی جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے ہر چھوٹے بڑے گناہ پر پوری سزا دینا چاہے تو پھر کسی بھی انسان کا سزا سے بچنا مشکل ہے۔ اور دوسری مخلوق پیدا کرنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلافت فی الارض ایسی مخلوق ہی کو دیتا ہے جس میں نیکی کے ساتھ بدی کی صلاحیت بھی ہو جیسے فرشتوں نے کہا تھا: اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۔ (البقرہ۲:۳۰) [کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟]

ان تمہیدی کلمات کے بعد آپ کے سوالوں کا بالترتیب جواب یہ ہے۔

۱- شرک سے محفوظ لیکن باقی گناہوں میں ملوث مسلمان اپنے گناہوں کی سزا پانے کے لیے دوزخ میں جائیں گے، بشرطیکہ وفات سے پہلے انھوں نے اپنے گناہوں سے سچی توبہ نہ کرلی ہو، جسے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت مل گئی ہو یا ان کی نیکیاں ان کے گناہوں پر کمّاً یا کیفاً (تعداد اور کیفیت کے لحاظ سے) بھاری اور غالب نہ ہو گئی ہوں۔

۲- ہمیشہ جہنم میں رہنا صرف کفر و شرک کی سزا ہے۔ باقی کسی گناہ کی سزا ہمیشہ جہنم میں رہنا نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ مومن کو اس کے گناہ کی سزا تو ملے لیکن ایمان کی جزا سے وہ محروم ہی رہے اور یہ انصاف کے منافی ہے۔ اور فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ (الزلزال ۹۹:۷) [جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا] کے بھی منافی ہے۔

۳- ایک شخص بغیر کسی سبب کے اللہ کی رحمت اور مغفرت کی آس لگائے رکھے تو یہ اس کی جہالت ہے۔ اسبابِ رحمت و مغفرت کو عمل میں لانے کے بعد ہی مغفرت کی آس لگانا معقول ہے۔

۴- اہمیت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی ہی کو حاصل ہے، گناہ سے پہلے بھی اور گناہ کے بعد بھی۔ گناہ سے پہلے اطاعت یہ ہے کہ گناہ سے بچنے کی جدوجہد کرے اور گناہ کے بعد اطاعت

یہ ہے کہ اس سے توبہ کرے۔ معافی سے مایوسی کا شکار ہو کر گناہ میں گرفتار نہ رہے۔ گناہ کے بعد توبہ اور انکساری اور آہ وزاری بڑا مقام رکھتی ہے لیکن اس کے حصول کے لیے عمداً گناہ کرنا انتہائی جہالت ہے اور ایسے شخص کے متعلق خطرہ ہے کہ اسے توبہ کی توفیق ہی نہ ملے۔

یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے یہی اہل اسلام کا نظریہ ہے سوائے معتزلہ اور خوارج کے، کہ ان کے نزدیک 'گناہ کبیرہ' کی معافی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ گناہ گار اس سے توبہ کر لے اور توبہ نہ کر سکے تو اس کی سزا اور کفر کی سزا میں فرق نہیں ہوگا۔ دونوں کی سزا جہنم میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ لیکن یہ نظریہ کتاب وسنت اور سلفِ صالحین کی آرا اور عقلِ سلیم سے متصادم ہے۔ اس طرح آپ نے جس صاحب کا حوالہ دیا ہے اس نے جس انداز سے اس مسئلے کو بیان کیا ہے وہ انداز بھی درست نہیں ہے۔ اس سے سلف صالحین کے مسلک کی صحیح طور سے ترجمانی نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ ان سطور سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔[۱]

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۸۳ء)

۱- ایک وضاحت: مولانا عبدالمالک محترم نے نہایت ہی مدلل اور خوبصورت جوابی تحریر لکھی ہے۔ اس کے بعد ایک سلیم الطبع آدمی کو گناہ اور مغفرت کے بارے میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ مجھے یہاں محض ایک چھوٹی سی بات اور بیان کرنی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی سلطنت' کائنات اور گوناگوں مخلوق کا نظام چلانے کے لیے جابجا ایسی آیات ذکر فرمائی ہیں جن کا اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ سلطنت کائنات کا دستور کیا ہے۔ مثلاً لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ، حَرَّمۡتُ عَلٰى نَفۡسِىۡ الظُّلۡمَ (حدیث قدسی) یا اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ، تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ۔ یہی حالت گناہ گاروں کی سزا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی برتر اتھارٹی کو واضح کر دیا کہ يَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ۔ ان آیات کو جب قانونِ مغفرت کی آیات سے گڈمڈ کر دیا جاتا ہے تو پڑھنے والا الجھ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ سلطنتِ الٰہیہ کے دستور کو مرتب کر لیا جائے۔ (نعیم صدیقی)

عہد نامہ

سوال: ایک عہد نامہ ارسال خدمت ہے۔ اس میں جو احادیث دی ہوئی ہیں ان کی کیا حیثیت ہے اور اس عہد نامے کو کن نظریات کے حامل افراد نے کس مقصد کے لیے اس قدر عام کر دیا ہے کہ ملک کی اکثر آبادی نماز سے زیادہ اسے ترجیح دینے لگی ہے اور اسے قبروں میں رکھنا ضروری سمجھتی ہے؟ ہمیں امید ہے کہ آپ ضرور اس سلسلے میں ہماری مدد کریں گے۔

مجاہد کمپنی اردو بازار لاہور کے مطبوعہ عہد نامے کی عبارت درج ذیل ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر کبیر اور مدارک التنزیل میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم اس بات سے عاجز ہو کہ صبح وشام اللہ تعالیٰ سے عہد کر لیا کرو؟ عرض کیا گیا: کیسے؟ فرمایا: جو ہر صبح وشام اس (عہد نامے) کو پڑھے گا ایک فرشتہ اس پر مہر لگا کر عرش معلّٰی کے نیچے رکھ دے گا اور بروزِ قیامت منادی ندا کرے گا: وہ لوگ کہاں ہیں جن کے لیے اللہ کے پاس عہد ہے؟ تو وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

دوسری روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ہے جس کو ابن ابی شیبہ، حاتم، طبرانی اور حاکم نے بتصحیح اور ابن مردویہ نے روایت کیا، یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا۔ (مریم۱۹:۸۷) [اس وقت لوگ کوئی سفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے بجز اس کے جس نے رحمان کے حضور سے پروانہ حاصل کر لیا ہو] پڑھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: جس شخص کا میرے پاس عہد ہے وہ کھڑا ہو جائے تو سوائے اس دعا (عہد نامہ) کے پڑھنے والے کے کوئی کھڑا نہ ہوگا۔

تیسری روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے جس کو حاکم اور ترمذی نے روایت کیا۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہر نماز کے سلام

کے بعد یہ کلمات پڑھے گا ایک فرشتہ اس کو کاغذ پر لکھ کر مہر لگا کر رکھے گا۔ جب بندہ اپنی قبر سے اٹھے گا وہ فرشتہ اس نوشتے کو لائے گا اور ندا کرے گا کہ عہد والے لوگ کہاں ہیں حتیٰ کہ وہ (عہد کیا ہوا) ان کو دے گا۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انھوں نے ان کلمات کو اپنے کفن پر لکھنے کا حکم دیا جو لکھے گئے۔[۱]

امام صفار نے ذکر کیا ہے کہ اگر میت کی پیشانی یا عمامہ یا کفن پر عہد نامہ لکھا جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میت کو بخش دے اور عذابِ قبر سے مامون فرمائے۔

نصیر فرماتے ہیں کہ اس کے جواز کے لیے یہ روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے اصطبل کے گھوڑوں کے رانوں پر لکھا ہوا تھا: خُمُسٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی ۔ایسے ہی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے قول الجمیل میں درد زہ کے دفعیہ کے لیے آیۂ کریمہ وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ کو لکھ کر عورت کی ران پر باندھنے کو فرمایا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں عہد نامہ لکھنے کے جواز میں فتویٰ دیا اور فرمایا کہ اس دعا کے لیے اصل ہے۔ ابن عجیل فقیہ اس کے لیے حکم کیا کرتے تھے مگر کلمہ کی انگلی سے لکھیں روشنائی سے نہ لکھیں۔[۲]

شجرہ یا عہد نامہ قبر میں رکھنا جائز ہے اور بہتر یہ ہے کہ میت کے منہ کے سامنے قبلے کی جانب طاق کھود کر اس میں رکھیں۔ بہار شریعت وفتاویٰ افریقہ۔[۳] اور حصن حصین میں بحوالہ احمد روایت ہے: کہ اس حدیث کے راوی سہیل نے براویت قاسم وعوف کہا کہ ہمارے گھر والوں میں سے خورد وکلاں سب اس دعا (عہد نامہ) کو پڑھتے تھے۔[۴]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعْهَدُ اِلَيْكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا بِاَنِّیْ اَشْهَدُ اَنْ لَا

۱- درمنثور جلد۴ ص۲۸۶۔

۲- درمختار، رد المحتار، غایة

۳- رسالہ فیض عالم: شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ص ۳۷۔

۴- ظفر جلیل ترجمہ حصن حصین ملخصا ص۱۳۵۔

اِلٰـهَ اِلَّا اَنْـتَ وَحْـدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَ رَسُوْلُكَ فَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ فَاِنَّكَ اِنْ تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ تُقَرِّبْنِیْ اِلَی الشَّرِّ وَتُبَاعِدْنِیْ مِنَ الْـخَيْـرِ وَاِنِّیْ لَا اَتَّكِلُ اِلَّا بِرَحْمَتِكَ فَاجْعَلْ لِیْ عِنْدَكَ عَهْدًا تُوَفِّيْهِ اِلٰی يَـوْمِ الْـقِيٰـمَةِ اِنَّكَ لَا تُـخْـلِفُ الْـمِيْـعَـادَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَo بِرَحْمَتِكَ يَاارْحَمَ الرّٰ حِمِيْنَo

جواب: اس عہد نامے کا مضمون کتاب وسنت کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے ذریعے انسانوں سے اپنی بندگی کا عہد لیا ہے اور قیامت کے روز بھی انسانوں سے پوچھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے عہد کا انھوں نے ایفا کیا یا نہیں۔ اور مطبوعہ عہد نامے میں بندگیِ رب کے اسی عہد کو یاد کیا جاتا ہے اور قرآنِ پاک میں اس عہد کا جگہ جگہ ذکر ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں ہے: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ۔ (یٰسٓ ۳۶:۶۰) اے بنی آدم! میں نے تم سے کہہ نہ دیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا۔

اس عہد کو ایفا کرنے کی صورت ایمان اور عملِ صالح کو قرار دیا گیا ہے اور قرآن پاک میں جگہ جگہ ایمان وعملِ صالح پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُـمْ يَـحْـزَنُـوْنَ۔ (البقرۃ ۲:۱۱۲) کیوں نہیں؟ جس نے اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کر دیا درآں حالیکہ وہ نیک سیرت تھا تو اس کے لیے اس کے رب کے ہاں اس کا اجر ہے۔ اور ایسے لوگوں پر کوئی خوف اور غم نہیں۔

اِنَّ الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا وَعَـمِـلُـوا الـصّٰـلِـحٰـتِ كَـانَـتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِـرْدَوْسِ نُــــزُلًا۔ (الکہف ۱۸:۱۰۷) یقیناً جن لوگوں نے ایمان لایا اور عملِ صالح کیے ان کے لیے فردوس کی جنتوں میں مہمانی ہوگی۔

وَالْـعَصْرِo اِنَّ الْاِنْسَـانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَـوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o (العصر ۱۰۳:۱-۳) قسم ہے زمانے کی، تمام انسان

۸ خسارے میں ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔

لَا یَمْلِکُونَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًا (مریم۱۹:۸۷) اس وقت لوگ سفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے بجز اس کے جس نے رحمٰن کے حضور سے پروانہ حاصل کرلیا ہو۔

اس کی تفسیر کرتے ہوئے امام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں کہ اس عہد سے توحید اور نبوت پر ایمان مراد ہے۔ وَالتَّقْدِیْرُ اَنَّ ھٰؤُلَاءِ لَایَسْتَحِقُّوْنَ اَنْ یَّشْفَعَ لَھُمْ غَیْرُھُمْ اِلَّا اِذَا کَانُوْا قَدِ اتَّخَذُوْا عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًابِالتَّوْحِیْدِ وَالنَّبُوَّۃِ[1] یعنی ان لوگوں کی اس وقت تک سفارش نہ ہو سکے گی جب تک توحید اور نبوت پر ایمان کے ذریعے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے استحقاقِ سفارش کا عہد نہ حاصل کرلیا ہو۔

اس کے بعد انھوں نے مذکورہ عہد نامے کی عبارت بطورِ وضاحت نقل کی ہے۔

اسی طرح علامہ قرطبیؒ نے عہد کی تفسیر یوں کی ہے:

وَھُوَ لَفْظٌ جَامِعٌ لِلْاِیْمَانِ وَجَمِیْعِ الْاَعْمَالِ الصَّالِحَۃِ الَّتِیْ یَصِلُ بِھَا صَاحِبُھَا حِیَزَ مَنْ یَّشْفَعُ۔[2] یہ لفظ ایمان اور تمام اعمالِ صالحہ کے لیے جامع ہے جس کے ذریعے ایک شخص اس مقام تک پہنچتا ہے کہ اس کی شفاعت کی جائے، یا وہ شفاعت کرے۔

اس کے بعد اس عہد نامے کی عبارت نقل کی گئی ہے۔

اس عہد نامے کے مضمون سے بھی مذکورہ آیاتِ قرآنی کی طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جنت کا عہد ایسے ہی شخص سے ہے جس کے اندر یہ صفات پائی جاتی ہوں جن کا عہد نامے میں ذکر ہے۔

رہی یہ بات کہ کسی شخص میں یہ صفات تو نہ پائی جاتی ہوں لیکن وہ اس عہد نامے کا ورد کرتا ہو یا اسے قبر میں اپنے سرہانے یا قبلے کی جانب رکھوا دے تو خطرہ ہے کہ یہ اس کی مغفرت کا موجب ہونے کے بجائے الٹا اس کے عذاب کا موجب ہوگا۔ اس لیے کہ وہ ایک بات کو زبان سے تو ادا کرتا رہا لیکن اس کے مطابق اس نے عمل نہ کیا۔ لیکن وہ شخص جس نے اس عہد نامے کے

۱- تفسیر کبیر، ج۲۱،ص۲۵۳۔

۲- تفسیر قرطبی، ج۱۱،ص۱۵۴۔

مطابق اپنی زندگی گزاری اس پر اللہ تعالیٰ ضرور فضل فرمائے گا۔ اگر چہ وہ اس کا وردنہ بھی کرتا رہا ہو اور نہ ہی قبر میں اپنے ساتھ اس طرح کی کسی چیز کو رکھوایا ہو۔ نیز قبر میں مطبوعہ عہد نامے کے ساتھ اسے رکھوانے کی جو روایات نقل کی گئی ہیں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رد المحتار میں لکھتے ہیں:

فَالْمَنْعُ هٰهُنَا اَوْلٰى مَالَمْ يَثْبُتْ عَنِ الْمُجْتَهِدِ اَوْيَنْقُلُ فِيْهِ حَدِيْثٌ ثَابِتٌ[1] یہاں بدرجہ اولیٰ منع ہے جب تک کہ کسی مجتہد سے اس کا ثبوت نہ ملے یا کوئی صحیح حدیث اس کے بارے میں نہ پیش کردی جائے۔

یعنی نہ کسی مجتہد سے ثابت ہے اور نہ ہی اس بارے میں کوئی صحیح حدیث وارد ہوئی ہے۔ مطبوعہ پمفلٹ میں اس عہد نامے کو کفن پر لکھنے کے بارے میں جو اقوال نقل کیے گئے ہیں، علامہ شامیؒ نے ان کی تردید کی ہے لیکن یہ بات بڑی عجیب وغریب ہے کہ انھی علامہ شامیؒ ہی کے حوالے سے یہ بات لکھی گئی ہے کہ اس کا کفن وغیرہ پر لکھنا جائز ہے جو صراحتاً غلط بیانی اور دھوکہ دہی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے بارے میں اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت فرمائے۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۸۵ء)

مرزا قادیانی کے دعوے

سوال: جماعت احمدیہ ربوہ نے دو رسالے شائع کیے ہیں، (۱) 'چودھویں اور پندرھویں صدی کا سنگھم' اور (۲) 'چودھویں صدی کی اہمیت وغیرہ'

ان رسالوں میں جماعت کے سابقہ بزرگوں کے کشف، الہامات اور پیشین گوئیاں درج ہیں، جن سے ثابت کیا گیا ہے کہ ''چودھویں صدی کے مجدد امام مہدی اور مسیح علیہ السلام کا اسی زمانہ کے اندر آنا ضروری تھا۔ چونکہ حضرت میرزا صاحب کے سوا کسی نے مجدد، امام

۱- رد المختار: ج۲، ص۲۴۶۔

مہدی اور مثیل مسیح علیہ السلام کا دعویٰ نہیں کیا لہٰذا وہ سچے ہیں۔اور اگر یہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں اور کوئی نہیں آیا ہے تو پھر احادیث اور بزرگوں کے کشف اور الہامات جھوٹے ہیں اور چودہ سو سالوں سے امام مہدی اور مسیح ابن مریم علیہ السلام کا انتظار محض جھوٹ پر مبنی تھا اور امت کو دھوکا اور فریب دیا گیا ہے۔حدیثِ مجدّ د مشہور حدیث ہے۔امت کے اختلافات دور کرنے کا ایک ہی علاج بتایا گیا تھا، وہ بھی نہ آیا۔

موجودہ وقت میں پاکستان کے جملہ علمائے کرام، پیرزادگان اور سجادہ نشین نفاذ شریعت کے خواہاں ہیں، مگر ۷۲ فرقوں نے ۷۲ سیاسی پارٹیاں بنائی ہیں۔یہ سب ایک خدا، ایک قرآن کریم، ایک رسولؐ کو مانتے ہوئے متفق کیوں نہیں ہوتے؟

قرآن کریم میں سابقہ انبیائے کرام کے زمانوں میں جن خرابیوں کا ذکر ہے وہ تمام خرابیاں مجموعی طور پر مسلمانوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔مسلم ممالک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ایک جگہ نہیں، ہر ملک میں ذلیل وخوار ہیں۔ایک کافر کے مقابلے میں ہزار مسلمان شکست خوردہ ہیں۔قرآن کریم اور احادیثِ رسولؐ میں مسلمان کی جو خوبیاں بیان ہوئی ہیں ان کی جگہ برائیوں نے لے لی ہے۔بچوں اور عورتوں کے اغوا، زنا کاری کے کارنامے، حفاظ اور ائمہ مساجد کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔جاسوس، سمگلر، فسادات، ہڑتال، رشوت خوری، قتل و غارت گری کی خبریں جلی عنوانات سے شائع ہوتی ہیں۔علمائے کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہونے کے دعوے دار ہیں، منبروں کو چھوڑ کر سیاست اور سرکاری کرسی کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں۔اگر علما مساجد میں پاک کردار ادا کرتے ہوئے وعظ ونصیحت کریں تو معاشرہ یقینی طور پر جنت نما ہو سکتا ہے۔شہر لاہور کی مساجد میں دیکھا گیا ہے کہ جمعہ کے خطبوں اور صبح کی نماز کے بعد درسِ قرآن میں بذریعہ لاؤڈ اسپیکر گندی سے گندی گالیاں دی جاتی ہیں۔ان چیزوں کا اخبارات میں بھی ذکر آتا رہتا ہے''۔

براہِ کرم احمدیوں کے ان دو رسالوں کا ایک تسلی بخش جواب شائع فرما کر مسلمانوں کو مطمئن

کریں۔ اگر یہ دونوں رسالے حقیقت پر مبنی نہ ہوں تو حکومت کے ذریعے بند کروائے جائیں اور تادیبی کاروائی کی جائے۔

اگر جماعت اسلامی کے اکابرین بمشورہ صدر ضیاء الحق صاحب احمدیوں کے ساتھ 'مباہلہ' کا اعلان کر دیں تو یقینی طور پر بڑے بڑے علما، اولیا، صلحا اور صوفیا آپ کے ساتھ شامل ہونے کو سعادت دارین جانیں گے۔

جواب: قادیانیوں کے جن کتابچوں کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ تو ہماری نظر سے نہیں گذرے، البتہ ان کے جن مندرجات کا آپ نے تذکرہ کیا ہے ان میں نہ کوئی جان ہے کہ ان کی تردید شائع کی جائے، نہ یہ باتیں ان کی طرف سے پہلی بار منظر عام پر آئی ہیں۔

۱- کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ تقریباً سو سے زیادہ متواتر احادیث میں حضرت مسیح بن مریم کے نزول کا ذکر ہے ان کی تصریحات کو نظر انداز کر دیا جائے اور ایک فاتر العقل جھوٹے اور دین کی ابجد سے ناواقف شخص کو محض اس بنا پر کہ اس نے مسیح ابن مریم کا مصداق اور مثیل ہونے کا مجنونانہ دعویٰ کیا ہے، مسیح موعود مان لیا جائے۔ اگر دعویٰ کرنا ہی دلیل ہے تو اگر ۵ سال پہلے کوئی شخص [یہ] دعویٰ کر دیتا تو اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا لازم ہو جاتا۔

۲- قادیانیوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی مسیحیت اور نبوت کو ثابت کرنے کے لیے کئی باتیں گھڑ کر مشہور کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے تو یہ بات مشہور کی گئی کہ چودھویں صدی آخری صدی ہے لہٰذا اس صدی میں مسیح موعود کا آنا لازمی ہے اور چونکہ غلام احمد قادیانی نے اس بات کا دعوی کر دیا ہے لہٰذا یہی مسیح موعود ہے۔ اب چونکہ چودھویں صدی ختم ہو چکی ہے تو پندرھویں صدی کو بھی ساتھ میں شامل کر لیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس حدیث میں چودھویں صدی کا بطور خاص ذکر آیا ہے کہ اس میں مسیح موعود کو آنا ہے؟ اس کا کوئی جواب قادیانیوں کے پاس نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر صدی میں تجدیدِ دین کے کام کے لیے کچھ لوگوں کو اٹھائے جانے کا ذکر احادیث میں آتا ہے لیکن اس کا فیصلہ

تو کسی آدمی کے کام کو دیکھ کر ہی کیا جائے گا کہ اس نے دین کی کیا تجدید کی ہے۔غلام احمد قادیانی کی عمر بھر کی جدوجہد مسلمان علما کو گالیاں دینے، اپنے اوپر ایمان لانے اور انگریزوں کی غلامی کی تلقین اور جہاد کی مخالفت کرنے میں گذری، کیا یہی تجدیدی کام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کسی کو اٹھاتا ہے؟ تجدیدی کام تو ان لوگوں نے کیا ہے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، اسلامی نظام کے غلبے کو دورِ حاضر کا مسئلہ بنایا اور مسلمانوں کو اس کے لیے متحرک کیا۔

بعض علما کی عاقبت نااندیشی اور فتویٰ بازی مرزا غلام کی صداقت کی دلیل نہیں بن سکتی۔ یہ ایک کمزوری ہے جسے رفع کرنے کے لیے تحریک اسلامی سرگرم عمل ہے۔ان شاءاللہ اسلامی نظام کے قیام کے ساتھ یہ چھوٹے موٹے مسائل حل ہو جائیں گے۔تاہم یہ حضرات تو دائرہ اسلام میں رہ کر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، لیکن مرزا غلام احمد قادیانی نے اس حد سے بڑھ کر دائرہ اسلام سے ہی خروج کر لیا اور ان کی تکفیر کی اور ان کو گالیاں دیں تب یہ بات کیسے معقول ہوسکتی ہے کہ دائرہ اسلام سے نکلنے کے جرم کا ارتکاب کرنے والا دائرہ اسلام میں رہ کر ایک دوسرے سے اختلاف کرنے والوں پر طعن و تشنیع کرے۔[1]

'مباہلوں' سے اس دنیا میں حق و باطل کے فیصلے نہیں ہوتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر میں صرف ایک بار متعصب مخالفین کو 'مباہلہ' کا چیلنج دیا ہے اور وہ بھی وحیِ الٰہی کے تحت۔اس خاص اور استثنائی مثال کی بنیاد پر ہر کسی کو مباہلہ کا عام حق نہیں مل جاتا، نہ اللہ تعالیٰ نے اس کو غلبۂ حق کا ذریعہ بنانے کی ہدایت دی ہے۔اس لیے یہ کام تحریکِ اسلامی کے کرنے کا نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۸۳ء)

۱- ملت اسلامیہ میں کئی صدیوں سے فرقہ بندی اور دین وسیاست کی تفریق اور مختلف حوادث کے زیر اثر جو عام اخلاقی انحطاط واقع ہوا ہے، اور جس کی اصلاح کی مساعی بھی جاری رہی ہیں، اسے اگر کوئی شخص اپنے مہدی اور مسیح موعود ہونے کے دعوے کی دلیل بنائے تو پھر یہ دلیل تو صدیوں پہلے بھی موجود تھی اور آج قادیانیت کے کارناموں کے بعد بھی موجود ہے اور آئندہ بھی موجود رہ سکتی ہے تو کیا پھر نت نئے افراد مہدی اور مسیح موعود کا دعویٰ کرتے رہیں گے؟ (نعیم صدیقی)

اسلامی تصوّرِ معرفت

سوال: مسلمانوں کا ایک گمراہ فرقہ 'معرفت' کے نام پر قرآنِ کریم کی ان تعلیمات کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس لائے، ہندو دیو مالا کے پنڈتوں کے احوال کے مماثل ثابت کر رہا ہے۔ ہم اس بات کو دین اسلام کی اہانت قرار دیتے ہیں۔

حدیث نبوی کے ان الفاظ کی بنا پر کہ اَلْاَوَّلُ لِلدِّیْنِ الْمَعْرِفَةُ (دین کا سب سے پہلا فرض معرفت ہے) ان افراد کے گروہ نے اسلام کی فرض قرار دی ہوئی روزمرہ کی پنج گانہ نماز کی ادائیگی کی بہ نسبت زیادہ اہمیت، مقامِ معرفت کے حصول کو دے رکھی ہے۔

یہ فرقہ کسی ایسے شیخ کو اپنا دینی مرشد مانتا ہے جس سے یہ قول منسوب ہے مَنْ لَّمْ یَکُنْ لَهٗ شَیْخٌ فَشَیْخُهٗ شَیْطَانٌ۔ جس کا کوئی شیخ نہ ہو تو اس کا شیخ شیطان ہے۔

حصولِ معرفت کی راہ میں یہ گروہ اس قول کو اپنے لیے زادِ راہ بنا رہا ہے۔

ہمیں بڑی مسرت ہوگی اگر آپ کرم فرمائی کر کے معرفت کے موضوع پر کچھ روشنی ڈال سکیں اور ہمیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جنھیں اس راہ کے سالک بننے کا حق حاصل ہے نیز یہ واضح کریں کہ انسان کب اور کیوں کر منزلِ معرفت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، اور اس منزل پر پہنچنے کی غایت کیا ہے؟ ہم اس باب میں تفصیلی وضاحت کا خیر مقدم کریں گے تا کہ ہم اس گمراہ فرقے کو قائل کر کے صراطِ مستقیم پر لاسکیں اور ایسے بر خود غلط مرشدوں کی باتوں پر کان دھرنے سے روک سکیں جو اغراض کے بندے ہیں۔

جواب: 'معرفت' کا لغوی معنیٰ پہچان ہے۔ یہ علم کا ابتدائی درجہ ہے۔ کائنات اور اس کے عجیب و غریب اور مستحکم نظام کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کے وجود، علم، قدرت اور حکمت کا علم ہوتا ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنی زبردست قدرت والا ہے کہ وہ بلاشرکتِ غیرے اس کائنات کو وجود دینے والا اور اس کے نظام کو چلانے والا ہے۔ وہی کائنات اور اس کے

اقتدار کا مالک ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلت سے دوچار کر دیتا ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں بھلائیاں ہیں:

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ٥ (آل عمران ۳:۲۶) کہو: خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس معرفت کے نتیجے میں انسان کے دل میں خالقِ کائنات کے لیے عظمت اور محبت پیدا ہوتی ہے دوسری تمام چیزوں کو اس کی قدرت کا کرشمہ سمجھ کر مخلوق ہونے میں مساوات کا احساس ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے سمیت سب کو اللہ کا غلام دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی فطرت اللہ تعالیٰ کے احکام کی طلب کرتی ہے۔ اس کی فطری طلب کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'رسالت و نبوت' کے نظام سے دیا گیا ہے۔ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے اپنے احکام اپنے بندوں تک بھیجے تاکہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام ۶:۵۷) [حکمرانی کا حق صرف اللہ کے لیے ہے] اور اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف ۷:۵۴) [سنو! وہی پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے لیے حکمرانی ہے] کے مطابق انسانی زندگی کا نظام استوار ہو۔

انسان کا اپنی اور کائنات کی اس حقیقت کو سمجھنا اور اپنے اور کائنات کی چیزوں کے مقام کو پہچاننا اور کائنات کے خالق اور اس کی صفات کا ادراک اور اس کے نتیجے میں بندگیِ رب کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا معرفت ہے۔ اس معرفت کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و حواس کی نعمتوں سے نوازا اور کائنات کو ایک کتابِ معرفت بنایا۔ لیکن اس نے کمالِ رحمت سے مزید انعام یہ فرمایا کہ انسانوں میں سے بعض برگزیدہ شخصیات کو انسانوں کی رہنمائی کے لیے منتخب فرما کر اپنے احکام کا حامل بنایا۔ ان کے ذریعے انسانوں کو 'کائنات کی کتابِ معرفت' کی طرف متوجہ فرمایا اور بندگیِ رب کا وہ نظام ان کے ذریعے عطا فرمایا جس سے انسان کے فطری جذبۂ عبادت کی تسکین ہوئی۔

مذکورہ تصورات اور حقائق کے جاننے کا نام معرفت ہے لیکن محض معرفت ذریعۂ نجات نہیں، ذریعۂ نجات معرفت سے اوپر کا درجہ ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے بشرطیکہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح شامل ہو۔

انسانوں کے لیے جس قسم کے مرشد کی ضرورت تھی اس کا ذکر مذکورۂ بالا سطور میں آپ کے سامنے آ گیا ہے کہ وہ ایسی شخصیت ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے احکام کا حامل بناتا ہے اور وہ وحی کے ذریعے تعلیم دیتا ہے۔ اس کی یہ تعلیم خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اس پر نازل کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے معرفت اور ایمان کا انتظام اس طرح فرمایا ہے کہ ایک طرف انھیں عقل وحواس کی نعمتوں سے نوازا، تاکہ وہ عقل وفکر اور حواس سے کام لے کر اس کائنات کے اسرار ورموز کو معلوم کرلیں اور پھر انبیا علیہم السلام کے ذریعے ان کی مزید رہنمائی فرمائی۔

اس سلسلے کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے کیا گیا اور اس کا اختتام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب وسنت کی شکل میں علم ومعرفت کے سارے اسرار رموز اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائے۔ اب علم ومعرفت کا راستہ صرف اللہ کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس معرفت کے حصول کے لیے سب سے پہلی شرط تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم حاصل کرنا ہے اور دوسرا کام اس نظام کو اپنانا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے پاس لے کر آئے ہیں۔

جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم نہیں رکھتا، فرائض کو اختیار نہیں کرتا اور منہیات سے نہیں بچتا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے فرائض کا تارک ہے اور منکرات کا ارتکاب کرتا ہے وہ معرفت سے کوسوں دور ہے، جاہل ہے، اور اس کا 'شیخ' شیطان ہے۔ یہ لوگ ایسی معرفت کے نام پر، جس کی حقیقت کو وہ واضح نہیں کر سکتے، لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، نماز، روزہ اور دیگر ارکانِ اسلام اور فرائض سے دور کرتے ہیں اور برائیوں کے عادی بناتے ہیں یہ شیطان کے ایجنٹ ہیں۔

لیکن جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور سیرت کو اپنے لیے نمونہ بنایا اس کا شیخ وہ مقدس ہستی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے مبعوث فرمایا ہے کہ لوگ اس کی اتباع اور اطاعت کریں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (آل عمران۳:۳۱) اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ٥ (الاحزاب۳۳:۲۱) درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ٥ (النساء۴:۸۰) جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی تو یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ٥ (النساء۴:۵۹) اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔

یہ آیاتِ قرآنیہ اسی ہادی اور رسول کی اتباع و اطاعت کو لازم کرتی ہیں جسے اللہ نے اس منصب پر فائز کیا ہے اور پھر اس کی اتباع کو لازم کرتی ہے جس کی اتباع میں اللہ کے رسول کی اتباع ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت فرمایا:

تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَاكِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ۔ (المؤطا) میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سنت۔

جو لوگ کسی اور طریقے کی تلاش میں کسی کو اپنا شیخ بناتے ہیں وہ دراصل شیطان کے جال میں گرفتار

ہیں اور ان پر یہ بات صادق آتی ہے کہ فَمَنْ لَمْ یَکُنْ لَہٗ شَیْخٌ فَشَیْخُہٗ شَیْطَانٌ یعنی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے اسوۂ حسنہ اور نظامِ زندگی کو چھوڑ دیا تو اس کا شیخ اور مرشد شیطان ہے۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۸۴ء)

امام مہدی

سوال: آج کل میں ایسی جگہ آ گیا ہوں جہاں ایک خاص فرقے کے لوگوں کی کثرت ہے۔ یہ لوگ مسجد میں نماز پڑھنے نہیں آتے، بلکہ ان کے بچے نمازیوں سے تمسخر کرتے ہیں۔ یہاں اہلِ سنت والجماعت بہت کم ہیں۔ مسجدوں میں صرف غیر سعودی ہی نظر آتے ہیں۔ مقامی لوگ بہت کم ہیں۔

یہاں مہدی علیہ السلام کا اکثر ذکر ہوا کرتا ہے کوئی کہتا ہے کہ مہدی علیہ السلام کب کے ظاہر ہو چکے ہیں، اور کوئی کہتا ہے کہ ابھی ظہور نہیں ہوا۔ میں نے بھی قرآن مجید میں یہ پڑھا تھا کہ قیامت سے قبل عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ آپ میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب: لوگوں نے امام مہدی کے متعلق یہ تصور اپنے ذہنوں میں قائم کیا ہوا ہے کہ وہ کسی نبی کی طرح ظہور کرے گا، مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا، اپنے دعوے کے ثبوت میں کچھ کرامات دکھلائے گا اور لوگ اسے مہدی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے وغیرہ، لیکن حقیقت میں ان چیزوں میں سے کوئی بھی چیز درست نہیں ہے۔ امام مہدی بھی مسلمانوں کے راہنماؤں کی طرح ایک عظیم راہنما ہوں گے۔ صاحبِ علم وفضل اور متصف بہ جرأت وشجاعت ہوں گے۔ لوگ ان کے علم وفضل اور کام سے متاثر ہو کر اقامتِ دین کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں گے اور وہ زبردست جہاد کے ذریعے زمین سے طاغوتی قوتوں کے اقتدار کو ختم کر کے 'حکومتِ الٰہیہ' کا نظام قائم کریں گے۔ احادیث میں اس طرح کے امام مہدی کے بارے میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اس کا مصداق وہی شخص ہوگا جس کی قیادت میں مسلمان اللہ کے دین کو تمام باطل ادیان پر غالب

کریں گے۔ اور اس کام کے ہوجانے کے بعد ہی یقینی طور پر کہا جا سکے گا کہ اس امام مہدی کا ظہور ہوگیا یا نہیں جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔

اس امام مہدی سے پہلے اقامتِ دین کی تحریک برپا کرنے والے قائدین بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔ احادیث میں ان کے فضائل بھی بیان کیے گئے ہیں لیکن 'مہدیِ اعظم' ایک ہی ہوں گے اور وہ چالیس سال تک امتِ مسلمہ کی قیادت کرتے رہیں گے۔ ان کے آنے کے ۳۰، ۳۵ سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ امام مہدی کے آخری دور میں دجال کا ظہور ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے قتل کریں گے۔ اس کے بعد پانچ یا سات سال تک امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں زندہ رہیں گے۔ پھر امام مہدی فوت ہوجائیں گے۔ اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں زندہ رہیں گے۔ ان دنوں کی خصوصیت یہ ہوگی کہ پوری زمین پر عدل وانصاف کی حکومت ہوگی۔ زمین اپنی برکات اور خزانے نکال دے گی۔ کوئی فقیر ومحتاج نہ رہے گا۔ لوگوں کے درمیان آپس میں بغض وعداوت قطعاً نہ رہے گی۔ ہاں، مہدیِ اعظم کے آخری زمانے میں دجالِ اکبر کا فتنہ مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور کوہِ طور کے سوا سارے عالم پر چھا جائے گا اور یہ فتنہ دنیا کے تمام فتنوں سے عظیم ہوگا۔

دجال کا قیام اور فساد صرف چالیس دن رہے گا اور عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں یاجوج ماجوج کا ظہور ہوگا اور پھر وہ عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے بیماری کی وبا سے ہلاک ہوجائیں گے۔ دجال اور یاجوج ماجوج کے فتنوں کے دنوں کے سوا مہدی اور عیسیٰ علیہ السلام کا دور رحمت وبرکت اور عدل وانصاف اور خوشحالی کا دور ہوگا۔[۱]

مزید معلومات کے لیے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب تجدید واحیاے دین کا مطالعہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ اطمینان ہوجائے گا۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

۱- ماخوذ از معارف القرآن، ج ۵، ص ۲۳۵-۲۳۶

تیسرا باب

نماز

سفر میں نمازِ قصر

سوال: ہمارے کالج میں ایک مسئلہ کھڑا ہوا ہے۔اس میں راہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔
ہم طالب علم دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے ہیں، ہمارے کورس کی مدت ۹ ماہ ہے لیکن
ہم ہر ہفتے واپس گھر چلے جاتے ہیں۔کیا ہم نمازِ قصر ادا کریں یا مکمل۔؟
جس آدمی پر نمازِ قصر واجب ہے وہ اگر مکمل نماز ادا کرے تو گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

جواب: آپ لوگ مقامی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی کوشش کریں تاکہ سرے سے یہ مسئلہ نہ پیدا ہو کہ آپ نے پوری نماز پڑھنی ہے یا قصر کرنا ہے۔اگر اتفاقاً نماز باجماعت نہ ملے تو ایسے طلبا جن کے گھر کالج سے اڑتالیس میل (۴۸) کے فاصلہ پر ہیں اور ہر ہفتہ گھر جاتے ہیں تو وہ قصر کریں۔اور جنھوں نے پندرہ دن بعد گھر جانا ہو وہ پوری نماز پڑھیں۔کیونکہ وہ مقیم شمار ہوں گے اور ہر ہفتہ گھروں کو جانے والے کالج کے ہاسٹل میں مسافر شمار ہوں گے۔

جس آدمی پر قصر نماز واجب ہے وہ قصر پڑھے۔مقصد تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے۔رہی عبادت تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ فرضوں کی رکعات میں اضافہ کیا جائے۔نوافل پڑھے جاسکتے ہیں جن کو عبادت کا زیادہ شوق ہو وہ تہجد، اشراق، اوابین، صلوٰۃِ تسبیح پڑھ لیا کریں۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۸۷ء)

وطنِ اصلی یا وطنِ اقامت

سوال: میں اپنے والدین کے ہمراہ اپنے آبائی گاؤں سے نقل مکانی کر کے گوجرانوالہ شہر میں پچھلے
چار سال سے مستقل رہائش پذیر ہوں۔میں اپنے گھر سے تقریباً ۱۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر
کھیوڑہ میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور ہفتے یا دو ہفتے بعد گھر لوٹتا ہوں۔میری بیوی

میرے والدین کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس صورت میں مجھے ملازمت' پیدائش یا رہائش کے مقام میں سے کس مقام پر نمازِ قصر ادا کرنا ہوگی؟

جواب: آدمی جس جگہ مستقل طور پر رہائش پذیر ہو وہ اس کا 'وطنِ اصلی' کہلاتا ہے۔ ایک آدمی کے دو 'وطنِ اصلی' بھی ہو سکتے ہیں۔ گوجرانوالہ میں آپ اپنے والدین کے ساتھ مستقل رہائش پذیر ہیں، اور یہاں پر اپنا مکان بنا کر اسی جگہ رہنے کا ارادہ کر لیا ہے تو یہ آپ کا 'وطنِ اصلی' ہے اور مقامِ پیدائش کو اگر بالکل ترک نہیں کیا، وہاں بھی زمین ہے یا مکان ہے تو وہ بھی 'وطنِ اصلی' ہے۔ ان دونوں وطنوں میں جب آپ جائیں گے تو تھوڑا وقت رہیں یا زیادہ، ایک دن رہیں یا دس دن، پوری نماز پڑھنا ہوگی۔ اگر کھیوڑہ میں جائیں اور وہاں پندرہ دن سے کم مدت رہنے کا ارادہ ہو تو وہاں نمازِ قصر کریں کیوں کہ وہ آپ کا 'وطنِ اقامت' ہے۔ اور اگر پندرہ دن یا زیادہ رہنا ہو تو پھر پوری نماز پڑھیں۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۹ء)

شمالی یورپ میں نماز روزے کا مسئلہ

سوال: میں سویڈن کے شمالی علاقے لولیو میں رہ رہا ہوں، یہاں مئی، جون میں رات سمٹ کر دو تین گھنٹے ہو جاتی ہے اور نومبر، دسمبر میں راتیں لمبی ہو جاتی ہیں۔ جب کہ دن دو تین گھنٹے تک چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں سحر و افطار اور نمازوں کے اوقات کا تعین کیسے کیا جائے؟

جواب: آپ روزہ طلوع و غروب اور نمازیں بھی طلوع و غروب کے لحاظ سے پڑھتے ہیں تو شریعتِ اسلامیہ کے تقاضوں کو صحیح معنوں میں ادا کر رہے ہیں۔ لہٰذا اسی طرح سے اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔ رات اڑھائی تین گھنٹہ کی ہو تو اس میں عشاء کی نماز اور تراویح بھی پڑھنا چاہیے۔ مغرب کی نماز کے پون گھنٹہ، گھنٹہ بعد عشاء کی نماز اور تراویح پڑھ لیا کریں۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۸۸ء)

فجر کی سنتیں

سوال: ہمارے ایک قریبی دوست جماعت اسلامی کے پرانے متفق ہیں۔ وہ تین چار سال دبئی میں ملازمت کرتے رہے۔ ابھی واپس آئے ہیں۔ وہ صبح کی دو سنتیں روزانہ فرض نماز کے بعد پڑھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی کہتے ہیں کہ جماعت کھڑی ہو جائے تو سنتیں چھوڑ کر جماعت کے ساتھ مل کر فرض پڑھ لو، سنتیں بعد میں پڑھ لینا۔ مہربانی فرما کر حنفی مسلک کے مطابق اس کا تفصیلی حل تحریر فرمائیں۔

جواب: سنتیں اس مقام پر سنتیں ہیں جس مقام پر انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا ہے۔ فجر کی سنتیں فجر کی نماز سے پہلے سنتیں ہیں۔ بعد میں ان کی حیثیت نفل کی ہے۔ اس لیے معمول تو یہی بنانا چاہیے اور اس کی پابندی کرنی چاہیے کہ فجر کی سنتیں فجر کی نماز کھڑی ہونے سے پہلے پڑھ لی جائیں لیکن کبھی اتفاقاً ایسا نہ ہو سکے تو پھر اس کی تین صورتیں ہیں:

۱- بڑی مسجد کے دروازے کے پاس پڑھ کر فرضوں میں شرکت کی جائے۔
۲- جماعت میں شمولیت اختیار کر لی جائے اور سورج نکلنے کے بعد سنتیں پڑھ لی جائیں۔
۳- فرضوں سے فارغ ہو کر متصل بعد سنتیں پڑھ لی جائیں۔

ہمارے نزدیک راجح صورت دوسری ہے کہ فرض کے لیے اقامت کے بعد فرضوں میں شرکت کر لی جائے اور سورج نکلنے کے بعد سنتیں پڑھ لی جائیں۔ متاخرین فقہاے احناف اس صورت کے علاوہ پہلی صورت کے جواز کے بھی قائل ہیں مگر تیسری صورت کے قائل نہیں ہیں اس پر کبھی کبھار عمل کرنے والے کے بارے میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ فرضوں سے پہلے سنتوں کی ادائیگی کو معمول بنایا جائے اور اس کی ترغیب دی جائے۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۸۶ء)

مسجد میں نمازِ جنازہ

سوال: بعض مساجد میں نمازِ جنازہ کھلی جگہ پر پڑھی جاتی ہے اور بعض میں صرف جنازہ باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ صحیح صورت کیا ہے؟

جواب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمول کے طور پر نمازِ جنازہ مسجد سے باہر پڑھی ہے۔ مسجد نبوی سے باہر جنازہ گاہ تھی جس کو مصلی الجنائز کہا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے مسجدِ نبویؐ کے ایک دروازے کا نام باب الجنائز ہے۔ البتہ عذر کی بنا پر آپؐ نے کبھی مسجد نبوی میں بھی نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔

فقہائے حنابلہ اور شوافع کے نزدیک مسجد میں بلا کراہت نمازِ جنازہ جائز ہے۔ المجموع شرح المہذب میں ہے: اَلصَّلٰوۃُ عَلَی الْمَیِّتِ فِی الْمَسْجِدِ صَحِیْحَۃٌ جَائِزَۃٌ لَاکَرَاھَۃَ فِیْھَا مسجد میں میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا بالکل درست ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

علامہ ابن قیم حنبلی لکھتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد میں جنازہ پڑھنے کا معمول نہ تھا۔ آپؐ مسجد سے باہر نمازِ جنازہ پڑھتے تھے الا یہ کہ کوئی عذر ہو۔ کبھی آپؐ نے مسجد میں بھی نمازِ جنازہ پڑھی ہے جیسے ابن بیضاء کی نمازِ جنازہ۔ صورتیں دونوں جائز ہیں، البتہ افضل مسجد سے باہر پڑھنا ہے۔[1]

فقہائے احناف اور مالکیہ کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔ فقہائے احناف کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ہے کہ بلا عذر آپؐ نے مسجد نبوی میں نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی حتیٰ کہ نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی باہر جنازہ گاہ میں نکل کر پڑھائی۔ اس کے علاوہ قولی احادیث بھی ہیں۔ جن میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کے اجر کی نفی کی گئی ہے۔ شوافع اور حنابلہ کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن بیضاء کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی تھی۔ دلائل کے لحاظ سے راجح بات وہی ہے جسے احناف اور مالکیہ نے اختیار کیا ہے کیونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا

۱- فقہ السنہ جلد اول، ص ۵۳۳۔

معمول ہے اور ایک دو جنازے اگر کسی عذر سے مسجد کے اندر پڑھے ہیں تو اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ بلا عذر بھی بلا کراہت ایسا کرنا جائز ہے۔

احناف کا مسلک

فقہائے احناف کے نزدیک سب سے اَولیٰ صورت تو یہ ہے کہ میت بھی مسجد سے باہر ہو اور نمازی بھی مسجد کے باہر کھڑے ہوں۔ در مختار اور رد المحتار میں ہے وَالْمُخْتَارُ الْكَرَاهَةُ مُطْلَقًا (راجح بات یہ ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ مطلقاً مکروہ ہے) اس کے مطابق میت اور نمازی دونوں کو مسجد کے باہر ہونا چاہیے اور دوسرے درجے میں یہ صورت بھی جائز ہے کہ میت تو مسجد سے باہر ہو اور نمازی مسجد میں کھڑے ہوں۔ المبسوط للسرخسی میں ہے: عِنْدَنَا اِذَا كَانَتِ الْجَنَازَةُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ لَمْ يُكْرَهْ اَنْ يُصَلِّيَ النَّاسُ عَلَيْهَا فِي الْمَسْجِدِ۔[1] ہمارے نزدیک جب جنازہ مسجد کے باہر ہو تو یہ مکروہ نہیں ہے کہ لوگ مسجد میں کھڑے ہو کر اس پر نمازِ جنازہ پڑھیں۔

عام معمول تو یہی ہونا چاہیے کہ نمازِ جنازہ مسجد سے باہر پڑھی جائے اور میت بھی باہر ہو، لیکن حرج اور ہجوم کی وجہ سے کبھی اس طرح کرنا پڑ جائے کہ میت مسجد سے باہر رکھ دی جائے اور نمازی مسجد میں کھڑے ہوں تو اس عذر کی وجہ سے ایسا کرنا بھی جائز ہے۔ جمعہ کے روز چونکہ بھیڑ ہوتی ہے، اس لیے دفعِ حرج کی خاطر میت کو مسجد سے باہر رکھ کر مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔

میت کے حق میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی نمازِ جنازہ مسجد کے اندر ہوئی ہے یا باہر۔ فرق جو بھی پڑتا ہے وہ نمازیوں کے لحاظ سے ہے کہ ان کے ثواب میں کمی بیشی ہوتی ہے کہ نہیں۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا اور مالکیہ اور احناف کے نزدیک مسجد کے اندر ثواب میں کمی ہوتی ہے اور مسجد کے باہر پورا ثواب ملتا ہے۔ لیکن اس فرق کے باوجود جنازہ تو ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی کے نزدیک بھی اس جنازے کا اعادہ نہیں ہے جو مسجد میں پڑھا گیا ہو۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۹۴ء)

۱- المبسوط، جلد دوم، ص ۶۸

فوت شدہ نمازوں کی قضا

سوال: میں بیمار تھا کچھ نمازیں قضا ہوگئیں۔ میرے ایک ساتھی نے کہا کہ نماز کی قضا نہیں ہوتی۔ یعنی جو رہ گئی وہ رہ گئی۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ میں فقہ کی بات تسلیم نہیں کرتا، قرآن وحدیث دکھائیں۔

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح کی نماز سفر میں نیند کی وجہ سے قضا ہوگئی تھی تو آپؐ نے اس کی قضا کی۔ (بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب الاذان بعد ذھاب الوقت) یہ تو قضا کی نقلی دلیل ہے۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ جب ایک انسان پر کسی کا قرض ہو تو اس سے بری الذمہ ہونے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں: پہلی یہ کہ ادائیگی ہوجائے اور دوسری یہ کہ معافی ہوجائے۔

اس بات کی کوئی دلیل قرآن وسنت سے نہیں ملتی کہ قضا نمازیں معاف ہوجاتی ہیں۔ پس دوسری صورت باقی رہ گئی کہ انھیں ادا کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: دَیۡنُ اللّٰہِ اَحَقُّ اَنۡ یُقۡضٰی اللہ کا قرض اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔ پس آپ کے دوست کی یہ بات کہ جو نمازیں قضا ہوگئیں، ان کی قضا کرنے کی ضرورت نہیں، بے معنی ہے۔ البتہ جان بوجھ کر قضا کرنے کا گناہ اس وقت دور ہوگا جب نماز کی قضا بھی کی جائے اور اس کے ساتھ توبہ بھی۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۸۸ء)

تراویح کی رکعات

سوال: کم از کم کتنی رکعت تراویح پڑھنا ضروری ہے؟ بعض لوگ ۲۰ رکعت کی جماعت میں شامل ہوتے ہیں اور ۸ ہی پڑھ کر رخصت ہوجاتے ہیں۔

جواب: تراویح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ۸ اور کبھی ۱۰ تراویح اور ۳ وتر کا تھا۔ کبھی

اس سے کم اور کبھی زیادہ بھی پڑھی ہیں۔ آپؐ کا یہ معمول انفرادی تھا، اور انفرادی معمول ایک انسان کی مرضی پر ہوتا ہے کہ چاہے اس میں لمبا قیام کرے اور چاہے مختصر۔ اس اصول کی رو سے ہمارے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا جو معمول آتا ہے وہ اتنا طویل ہے کہ اس کو سب کے لیے معمول بنانا بڑا مشکل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کا اصول یہ مقرر کیا ہے کہ مَنْ اَمَّ مِنْکُمْ فَلْیُخَفِّفْ یعنی تم میں سے جو امامت کرے تو وہ ہلکی نماز پڑھائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں تراویح کا باجماعت معمول نہ تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن نماز باجماعت پڑھائی اور پھر ترک کر دی آپؐ نے ترک کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ مسلسل باجماعت پڑھنے کی وجہ سے کہیں فرض نہ ہو جائے اس سے اشارہ مل گیا کہ فی نفسہٖ جماعت مستحسن اور مسنون ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو انھوں نے دیکھا کہ لوگ مسجد نبوی میں تراویح پڑھ رہے ہیں کوئی اکیلا کھڑا ہے، کوئی ایک حافظ کے پیچھے، اور کوئی دوسرے حافظ کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشورے سے دو کام کیے۔ ایک یہ کہ ایک جماعت کو معمول بنا کر انفرادی اور متعدد جماعتوں کے نظام کو ختم کر دیا۔ دوسرا یہ کہ آٹھ یا دس رکعتوں میں جو طویل قیام ہوتا تھا۔ اس کی جگہ تعدادِ رکعات بڑھا دی۔ اس طرح بیس تراویح اور تین وتر ہو گئے۔ یہ ان کا اجتہاد تھا جس کی بنیاد مَنْ اَمَّ مِنْکُمْ فَلْیُخَفِّفْ کا شرعی اصول تھا۔ آٹھ یا دس رکعات اسی طرح پڑھنا جیسے کہ آپؐ نے پڑھی تھیں، بہت مشکل ہوتا۔ اگر آٹھ رکعت پڑھنا معمول بنا لیا جاتا اور اس میں اتنا لمبا قیام نہ کیا جاتا جیسے کہ آپ کیا کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول میں واقع ہونے والی کمی کی تلافی نہ ہوتی۔

حضرت عمر اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کوئی خاص تعداد مقصود بالذات نہیں ہے۔ آٹھ یا دس رکعات کا معمول آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سہولت کے لیے اختیار کر رکھا تھا۔ لہٰذا اس معمول کو دوگنا کر کے باقی رکھا جائے تا کہ جماعت میں تخفیف والا

اصول بھی جاری ہو جائے۔ لیکن اس طرح سے قیام میں تخفیف کی وجہ سے جو کمی ہو اس کا مداوا تعدادِ رکعات سے ہو جائے' اس طرح تعداد ۲۰ ہو گئی۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک ۲۰ تراویح کو ہی معمول بنانا چاہیے۔ اور مساجد میں تراویح با جماعت پڑھی جائے تو ۲۰ رکعات پڑھی جائیں۔ اگر کوئی شخص انفرادی طور پر تراویح پڑھتا ہے اور وہ ۸ رکعات کو اس شکل میں پڑھنا چاہے جس شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، تو یہ بھی جائز ہے، اور تخفیف کے ساتھ ۸ پڑھنا چاہے تو بھی درست ہے۔ لیکن اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ ۲۰ تراویح خلفاے راشدین کی سنت ہے اور یہ سنت دراصل ۸ رکعات سنت نبویؐ کی دوسری شکل ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے دین کے مجموعی مزاج اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول اور نماز با جماعت کے اصولوں کی روشنی میں جو اجتہاد کیا ہے، وہ درست ہے اور اس کو اپنانے میں خیر و برکت ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص جماعت میں بھی ۸ رکعت کو اولیٰ سمجھتا ہے اور ۲۰ کو جائز تو اس پر بھی طعن کرنا مناسب نہیں ہے۔ البتہ جو شخص ۲۰ رکعات کو بدعت قرار دیتا ہے وہ ظلم کا مرتکب ہے اور زیادتی کر رہا ہے۔ اس کی اصلاح کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۵ء)

تراویح اور تہجد کا فرق

سوال: ایک عالم دین سے سنا تھا کہ رمضان المبارک میں بھی نمازِ تہجد پڑھی جائے لیکن چند ساتھیوں نے اس پر اصرار کیا کہ حضورؐ نے آٹھ رکعت جو تراویح پڑھی ہے وہ دراصل تہجد ہی کی نماز ہے لہٰذا تہجد کی ضرورت نہیں رہتی۔

جواب: تراویح تہجد کی دوسری شکل ہے۔ رمضان المبارک میں اگر ایک انسان حافظ اور قاری ہے اور انفرادی طور پر نماز ادا کرنے کا عزم رکھتا ہے تو وہ تراویح کی بجائے سحری کے وقت آٹھ تہجد پڑھ سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ ایسی صورت میں وہ ۲۰ رکعت تہجد اور تین وتر پڑھے یا آٹھ رکعت تہجد اور تین وتر، دونوں کی گنجایش ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے

مناسب یہی ہے کہ وہ تراویح پڑھے اور صبح اٹھ کر تہجد بھی پڑھے۔ یہ شکل دونوں فضیلتوں کو جمع کرنے والی ہے، اس لیے افضل ہے۔ نوافل جتنے زیادہ کوئی پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے، اسے منع نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اگر تراویح پڑھ لی ہو تو پھر تہجد پڑھے بغیر بھی قیام اللیل کا ثواب مل جائے گا۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ تراویح کے بعد تہجد پڑھنے کی ضرورت بلکہ گنجایش بھی نہیں ہے بلکہ دونوں کو پڑھنے کا فائدہ ہے۔ اس لیے کہ تراویح کے ساتھ قیام اللیل کا ثواب مل جائے گا اور تہجد کے ساتھ ثواب میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۲۰۰۰ء)

قنوتِ نازلہ

سوال: آج مسلمان دنیا ے کفار کے حملوں سے دونوں طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور حدیث شریف میں آتا ہے اگر مسلمان اس قسم کے خطرات میں گھر جائیں تو اپنی نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھا کریں۔ ۱۹۶۵ء میں جب ہندوستان نے حملہ کیا تھا تو دارالعلوم جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک کے صدر مولانا بادشاہ گل مرحوم نے اسی خاطر پورے صوبے کا دورہ کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت زندہ کی جائے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ تمام امام صاحبان نے یہ دعا پڑھنی شروع کر دی تھی اور مولانا بادشاہ گل مرحوم صرف اس ایک سنت کے زندہ کرنے پر زور دے رہے تھے۔

موجودہ حالات میں افغانستان اور پاکستان زیادہ شدت سے کفار کی زد میں ہیں مگر یہ آواز کسی ادارے سے نہیں آرہی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے رہتے ہیں مگر یہ چیز کہیں نہیں ملتی۔

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل قنوتِ نازلہ کبھی نہیں پڑھی، بلکہ ایک موقع پر زیادہ سے

زیادہ ایک مہینے تک اسے پڑھا۔ پھر دوسرے موقع پر دوبارہ پڑھا، علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

وَالصَّوَابُ هُوَ الْقَوْلُ الثَّالِثُ الَّذِیْ عَلَیْهِ جُمْهُوْرُ اَهْلِ الْحَدِیْثِ وَکَثِیْرٌ مِّنْ اَئِمَّةِ اَهْلِ الْحِجَازِ وَهُوَ الَّذِیْ فِی الصَّحِیْحَیْنِ وَغَیْرِ هِمَا اَنَّهٗ ﷺ قَنَتَ شَهْرًا یَّدْعُوْ عَلٰی رَعْلٍ وَّذَکْوَانَ وَعَصِیَّةَ ثُمَّ تَرَکَ هٰذَا الْقُنُوْتَ ثُمَّ اِنَّهٗ بَعْدَ ذٰلِکَ بِمُدَّةٍ بَعْدَ خَیْبَرَ وَبَعْدَ اِسْلَامِ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَنَتَ. (فتاوٰی ابن تیمیۃ) درست بات تیسرا قول ہی ہے جو جمہور علمائے حدیث اور اہلِ حجاز کے بہت سے ائمہ کا مسلک ہے اور صحیحین وغیرہ میں مذکور ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک رعل اور ذکوان اور عصیۃ کے خلاف قنوتِ نازلہ پڑھا پھر اس کو چھوڑ دیا۔ پھر ایک مدت کے بعد غزوۂ خیبر اور ابو ہریرہؓ کے اسلام لانے کے بعد قنوت پڑھا۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: وَاَمَّا اِنَّهٗ کَانَ یَدْعُوْ فِی الْفَجْرِ دَائِماً قَبْلَ الرُّکُوْعِ اَوْ بَعْدَهٗ بِدُعَآءٍ یُسْمَعُ مِنْهُ اَوْلَایُسْمَعُ فَهٰذَا بَاطِلٌ قَطْعًا۔ (فتاوٰی ابن تیمیۃ) یہ کہنا کہ آپ نے فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھا، اونچا یا آہستہ، رکوع سے پہلے یا بعد میں تو یہ قطعاً باطل ہے۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ موقع بموقع، وقفے وقفے سے اسے پڑھنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ یہ پہلو بھی مدنظر رکھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عملاً جہاد اور فتح کے اسباب پر عمل کرنے کے ساتھ قنوتِ نازلہ پڑھتے تھے اس لیے اصل قنوتِ نازلہ کے پڑھنے کا حق مجاہدین کو ہے یا پھر ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے کوششیں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی قنوتِ نازلہ جو نہ لادینیت کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور نہ افغان مجاہدین سے تعاون کرتے ہیں ان کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ کے ہاں ان کی قنوتِ نازلہ کا کیا مقام ہے۔ یہ بات آپ کے علم میں لانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افغان مجاہدین قنوتِ نازلہ پڑھتے ہیں۔

امام تیمیہؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: وَالَّذِیْ عَلَیْهِ اَهْلُ الْمَعْرِفَةِ بِالْحَدِیْثِ اَنَّهٗ قَنَتَ لِسَبَبٍ وَتَرَکَهٗ لِزَوَالِ السَّبَبِ۔[1] حدیث کا علم رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ آپؐ نے ایک سبب کی بنا پر اسے شروع کیا اور اس سبب کے خاتمے پر اسے چھوڑ دیا۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۸۶ء)

۱- فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲۲، ص ۳۷۲

بریلوی مسلک کے امام کے پیچھے نماز

سوال: ہمارے ہاں دو مساجد ہیں۔ ایک بریلوی حضرات کی اور دوسری دیو بندی حضرات کی ہے۔ ہمارے مولوی صاحب شرک و بدعت اور بریلوی مسلک کے کٹر مخالف ہیں۔ میں جماعتی تربیت کے زیرِ اثر اپنے ہم مسلک لوگوں کے برخلاف، بریلوی امام کے پیچھے عام نماز اور نمازِ جنازہ پڑھ لیتا ہوں۔ میرا یہ عمل میرے ہم مسلک ساتھیوں کو برا لگتا ہے۔ کل نمازِ جمعہ کے خطبے میں ہمارے مولوی صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ بریلوی مشرک ہیں اور کسی طور پر بھی ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی بلکہ مقتدی پر الٹا گناہ ہوتا ہے۔ ہمارے مولوی صاحب جانتے ہیں کہ میں جماعت اسلامی کا آدمی ہوں۔ وہ قبل ازیں دبے الفاظ میں مجھ سے بریلوی حضرات سے مکمل اجتناب کا کہتے رہے ہیں اور میں ان سے یہ عرض کرتا رہا ہوں کہ یہ مسلمان ہیں۔ اگر ان کے کچھ عقائد خراب ہیں تو نماز پڑھ لینے میں کوئی مضایقہ نہیں، نماز ان کے پیچھے ہو جاتی ہے۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ یہ مشرک ہیں، ان سے تعلق داری بھی ناجائز اور ممنوع ہے۔ انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا وہ فتویٰ بھی سنایا کہ بریلوی حضرات کا مسلک مشرکانہ ہے لہٰذا ان کے پیچھے نماز پڑھنا حرام ہے۔ اب ان کے فتویٰ نما انتباہ کے پیشِ نظر آپ سے رجوع کر رہا ہوں کہ اندریں حالات مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: پاکستان اور ہندوستان کے محققین جمہور علماے اہل سنت (دیو بندی، اہل حدیث اور بریلوی) ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنے کے قائل ہیں۔ یہی مسلک مفتیٰ بہٖ ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان اسی راہِ اعتدال پر قائم ہے اور اسی کی داعی ہے۔ آپ اسی موقف پر قائم رہیے۔ عامۃ المسلمین اس نظریے کو درست سمجھتے ہیں۔ بریلوی علما توحید و سنت کی جو تشریحات کرتے ہیں، ان میں سے بعض ہماری رائے میں بھی سلفِ صالحین کی تعبیر و تشریح سے مطابقت

نہیں رکھتیں، لیکن اس کی وجہ سے ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ بلاوجہ غصے میں آ کر ایک محدود دائرے میں بند ہو کر فتویٰ بازی کا کچھ بھی حاصل نہیں ہے۔ مثبت انداز میں توحید و سنت کی اشاعت کیجیے۔ بریلوی علما کی بعض تشریحات سے علمی اختلاف کے باوجود ان پر طعن و تشنیع، الزام تراشی، تحقیر و تذلیل کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کہ تمام مکاتب فکر کے حق پسند علما کا یہی نظریہ ہے۔

آپ فریقین سے حسبِ سابق دوستانہ روابط رکھیں اور انھیں ایک دوسرے کے قریب کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اصلاح ذات البین بہت بڑی نیکی ہے، بلکہ اس وقت نیکیوں میں سرفہرست ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۵ء)

بے داڑھی شخص کی امامت

سوال: راقم حافظِ قرآن ہے اور داڑھی نہ ہونے کے باوجود قرآن پاک تراویح میں سناتا ہے۔

• پچھلے رمضان میں اس مسئلے پر مسجد میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب کا فتویٰ لا کر مسجد میں چسپاں کیا گیا کہ بغیر داڑھی والے کے پیچھے کوئی نماز نہیں ہوسکتی خواہ فرض ہو، سنت ہو یا نفل ہو۔ اس فتویٰ کے بعد میری طبیعت بڑی مکدر ہوئی کیونکہ دو تین مقتدیوں نے اس فتوے کے بعد میرے پیچھے نماز تراویح پڑھنا چھوڑ دی اور ہر شخص جو بھی ملتا یہی کہتا کہ بھئی اب تو رکھ ہی لو۔ خدا کا شکر ہے کہ راقم کو داڑھی سے کوئی چڑ نہیں، بلکہ پختہ ارادہ ہے کہ داڑھی رکھوں گا۔ لیکن اس سے نماز کا تعلق سمجھ میں نہیں آتا اور کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں جو آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں:

۱- اگر بے داڑھی والے امام کے پیچھے نماز نہیں ہوسکتی تو بے داڑھی والے مقتدی کی نماز کس اصول سے صحیح ہوگی۔ فتویٰ کی نوعیت عام ہونی چاہیے بے داڑھی مقتدی کی نماز بھی نہیں ہونی چاہیے، صرف امام کو داڑھی کا پابند کرنا کیسے صحیح ہوگا؟

۲- میں نے فقہِ حنفی کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ فاسق وفاجر کے پیچھے بھی نماز ہو جاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بے داڑھی والے کسی نیک نمازی کے پیچھے نماز کیوں نہیں ہوسکتی؟

۳- میں نے فقہِ حنفی کی کتاب میں یہ بھی پڑھا کہ نماز کی امامت کے لحاظ سے کون کون مناسب ہے۔ان وجوہ ترجیح Priorities میں داڑھی کا کہیں ذکر نہیں۔

۴- بہت سے گناہ ایسے ہیں جن میں اکثر حضرات مبتلا ہیں اور ہمارے مولوی صاحبان بھی مستثنیٰ نہیں۔ان گناہوں پر بڑی وعیدیں آئی ہیں،مثلاً جھوٹ بولنا منافق کی نشانی ہے۔ بہتان لگانا اور غیبت کرنا مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔اسی طرح بدگمانی کرنا جس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔(الحجرات ۴۹:۱۲) جب کہ داڑھی رکھنے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو ہے،لیکن داڑھی نہ رکھنے والے کے لیے سزا میرے علم میں نہیں آئی۔ جب داڑھی والے حضرات مولوی صاحبان مندرجہ بالا گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوئے لمبے لمبے خطبے اور نمازیں پڑھا سکتے ہیں تو بے داڑھی والے نے آخر ایسا کون سا قصور کیا ہے کہ نمازِ تراویح کی امامت بھی مشکل ہو جائے، جب کہ وہ حافظِ قرآن ہو،قرآن کا حافظ یا عالم ہونا خود ایک بڑی وجہ ترجیح ہے۔

۵- احادیث میں ایک روایت آئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک علاقے کے کچھ لوگ حضورؐ کے پاس آئے اور امام کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسا ہونا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا وہ جو تم میں سب سے زیادہ قرآنِ مجید پڑھا ہو۔وہ لوگ واپس چلے گئے۔اتفاق سے ایک نوعمر بچے کو قرآنِ مجید یاد تھا۔ جب نماز کا وقت آیا تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں اسے امام بنا دیا۔ پیچھے صفوں میں عورتیں بھی تھی،اتفاق سے بچے کا ستر درست نہیں تھا۔نماز کے بعد عورتوں کی صف سے آواز آئی کہ اپنے امام کا ستر درست کراؤ۔مقصد میرا کہنے کا یہ ہے کہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام کو قرآنِ مجید کا جاننے والا ہونا کافی ہے خواہ لفظاً خواہ معناً۔معنوی علم رکھنے والا زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں امید ہے کہ آپ سائل کو تحقیقی اور مسکت جواب سے نوازیں گے۔

جواب: امامت کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ امام علم و عمل کے لحاظ سے دوسروں کی بہ نسبت بہتر ہو۔

امامت کے اس نظریے کا تعلق امامتِ کبریٰ (حکومت) اور امامتِ صغریٰ (مسجد کی امامت) دونوں سے ہے۔ مسلمانوں کے حکمران کو بھی ان تمام لوگوں سے اعلیٰ اور افضل ہونا چاہیے جن پر وہ حکمران ہے اور مسجد کے امام کو بھی ان تمام لوگوں سے اعلیٰ و افضل ہونا چاہیے جن کا وہ امام ہے۔ وہ اوصاف جن میں ان اماموں، (حکمرانوں اور ائمہ مساجد) کو دوسروں سے بہتر ہونا چاہیے، قرآنِ مجید کا حافظ اور عالم ہونا، متقی اور پرہیز گار ہونا، معزز، وجیہہ اور باوقار ہونا سرفہرست ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے علما نے حکومت کے بارے میں اس شرعی حکم کو نظر انداز کیا ہوا ہے اور انھیں اس بات کی توفیق نہیں ہے کہ وہ ایسے حکمرانوں کے خلاف فتویٰ جاری کریں جو شرعی معیار پر پورے نہ اترتے ہوں اور ان فتووں میں بھی اتنا ہی زور ہو جس طرح امامِ مسجد کے سلسلے میں جاری کردہ فتووں میں ہوتا ہے۔ اللہ کرے وہ اپنی اس کوتاہی پر غور فرمائیں۔

۱- تقویٰ اور پرہیز گاری کا تعلق سیرت و کردار اور وضع قطع دونوں سے ہے۔ چونکہ داڑھی رکھنے کا حکم بھی احادیث میں آیا ہے اس لیے داڑھی رکھنا بھی ضروری ہے۔

۲- جہاں تک نماز کا تعلق ہے وہ تو ہر ایسے مسلمان کے پیچھے جائز ہے جو نماز ٹھیک طرح سے پڑھا سکتا ہو۔ لیکن باقاعدہ امام صرف ایسے شخص کو بنانا چاہیے جس میں کوئی نمایاں برائی یا کوتاہی نہ ہو۔

۳- یہ صورتِ حال بھی قابلِ افسوس ہے کہ بڑی بڑی برائیاں جو فسق کا موجب ہیں، ان کے مرتکب افراد کو تو امامِ مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، لے دے کے صرف داڑھی رہ گئی ہے جس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ کو یہ حق ہے کہ آپ دوسری برائیوں، (جن کا آپ نے تذکرہ بھی کیا ہے) کے مرتکب افراد کی امامت پر اعتراض کریں اور نمازیوں کو

عمومی اور خصوصی طور پر توجہ دلائیں کہ وہ مساجد میں ایسے اماموں کا تقرر کریں جن میں یہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں۔لیکن داڑھی نہ رکھنے کے باوجود تراویح پڑھانے کے اعتراض پر ناراض ہونا یا کسی ردِّعمل میں پڑنا مناسب نہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ آئندہ کے لیے داڑھی رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

۴- امامت کی شرائط میں تقویٰ شامل ہے امام کو متقی ہونا چاہیے لیکن اقتدا کی شرائط میں تقویٰ شامل نہیں ہے۔اس لیے مقتدی کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اس کی اقتدا اسی وقت صحیح ہو جب کہ اس کی داڑھی ہو۔

۵- حدیث تو صحیح ہے کہ قوم کی امامت وہ کرے جو قرآن پاک کا زیادہ علم رکھتا ہو۔پہلی بات کہ وہ بالغ ہو یا اپنے جسم کا ستر بھی نہ کرتا ہو تب بھی وہ امامت کرا سکتا ہے، صحیح نہیں ہے۔جس واقعے کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا تعلق امامت سے نہیں ہے بلکہ تحصیلِ قرآن پاک کی عمر سے ہے۔ اس بچے کے بارے میں، جو آنے جانے والے قافلوں سے قرآن پاک یاد کرتا تھا،عورتوں نے کہا کہ اس قرآن پڑھنے والے کو کپڑے تو پہنا دو اور اس کے ستر کو تو ڈھانپو اور اس طرح اس کا کچھ نہ کچھ اعزاز و اکرام تو کرو۔اس کا تعلق امامت سے پہلے کے دور سے ہے۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۸۵ء)

صحیح قرآن نہ پڑھنے والے امام کے پیچھے نماز

سوال: ہماری مسجد میں ایک امام صاحب تقریباً ایک سال سے امامت کرا رہے ہیں۔مگر قرآن پڑھتے ہوئے اکثر غلطیاں کرتے رہتے ہیں مثلاً اکثر مقامات پر 'ع' کو نہیں پڑھ سکتے اور اس کی جگہ 'ہمزہ' پڑھتے ہیں۔جیسے یعلمون کے بجائے یئلمون اور من شعائر الله کی جگہ مـن شـائـر اللـه پڑھتے ہیں۔اسی طرح بغیر وقف کے رک جانا اور پھر آگے سے

شروع کرنا، کبھی کبھی آدھی آیت سے قراءت شروع کرنا اور کبھی آدھی آیت پر رکوع میں چلے جانا ان کی مستقل عادت ہے۔ جب ان کو کہتے ہیں کہ یہ آپ غلط پڑھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ اس سے معنی میں فرق نہیں آتا۔ ایک ہی غلطی بار بار کرتے ہیں اور بتانے پر غصے بھی ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے میرے والد صاحب نے تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور مجھے بھی نماز پڑھتے ہوئے مزہ نہیں آتا۔ کیونکہ میرے خیال میں قرآن میں ایک زبر کا اضافہ یا کمی اپنی طرف سے کرنا اور پھر کہنا کہ اس سے معنی میں فرق نہیں آتا، بہت بڑی زیادتی ہے۔ براہِ مہربانی اس الجھن کو دور فرمائیں۔

جواب: نماز پڑھانے کے لیے ایسا امام مقرر کرنا چاہیے جو صحیح قراءت کرتا ہو۔ آپ نے جن امام صاحب کے حالات لکھے ہیں وہ انتہائی تشویش ناک ہیں۔ ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھنا بعض اوقات معنی میں تبدیلی اور نماز کے فساد کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اگرچہ ایسے حروف جن میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے ان میں جواز کا قول بھی ہے اس لیے متبادل صحیح قرآن پڑھنے والے امام کا انتظام کرنا چاہیے۔ لیکن جب تک متبادل اچھے قاری کا انتظام نہیں ہو جاتا یا وہ اپنی اصلاح نہیں کر لیتے اس وقت تک انھی کی اقتدا میں نماز پڑھنی چاہیے۔ اگر حروف کو اپنے مخارج سے نہیں بلکہ مخارج کے قریب بھی ادا کرتے ہوں تب بھی نماز جائز ہو جائے گی۔ بشرطیکہ معنی میں ایسا تغیر نہ آئے جو مفسدِ صلوٰۃ ہو، واللہ اعلم۔[1]

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۹۸ء)

مشرک کے پیچھے نماز

سوال: ایک آدمی اللہ سے بھی مانگتا ہے، رسولؐ سے بھی مانگتا ہے، صحابہؓ اور بزرگوں سے بھی مانگتا ہے۔ کیا یہ شرک نہیں ہے؟ اگر شرک ہے تو کیا ایسے آدمی کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب: جب تک کسی کے مزعومہ مشرکانہ اقوال و اعمال کی بنا پر کسی کو دائرہ اسلام سے خارج

۱- رد المحتار، مسائل زلۃ القاری، ج ۲، ص ۴۷۴، طبع بیروت۔

نہیں کیا جاتا اس وقت تک وہ مسلمان ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ ہمارے معاشرے میں غیر اللہ سے مدد مانگنا، بزرگوں کو مشکلات میں پکارنا تاویلاً ہوتا ہے۔ یہ لوگ اللہ سے مدد مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو قادر اور قیوم سمجھ کر مدد مانگتے ہیں دوسروں کو کارساز اور مالک ومختار سمجھ کر نہیں بلکہ محبت کے طور پر پکارتے ہیں اصل کارساز اور حاجت روا اللہ ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے تاویل اور جہالت کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا حکم نہیں لگا دیا جاتا بلکہ ایسے اقوال پر تنقید کر کے لوگوں کو اس سے احسن انداز سے روکا جاتا ہے اور اصلاح کی جاتی ہے۔ آپ اجتماعیت کو برقرار رکھنے اور لوگوں کی اصلاح کی خاطر، فتوؤں کا طریقہ نہ اختیار کریں بلکہ واعظ اور مبلغ اور داعیِ حق کی حیثیت سے ایسے انداز سے نشتر لگائیں کہ مریض کا آپریشن بھی ہو جائے اور وہ تکلیف بھی محسوس نہ کرے۔

ہمارے معاشرے میں تمام علما کا یہی موقف ہے کہ ایسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھی جائے گی جو تاویلاً غیر اللہ کو اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں کیونکہ انھیں اس قسم کی پکاروں کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا: اَلصَّلٰوۃُ اَحۡسَنُ مَا یَعۡمَلُ النَّاسُ فَاِذَا اَحۡسَنَ النَّاسُ فَاَحۡسِنۡ مَعَھُمۡ وَاِذَا اَسَآءُوۡا فَاجۡتَنِبۡ اِسَاءَتَھُمۡ نماز ان تمام کاموں سے اچھا کام ہے جو لوگ کرتے ہیں۔ اس لیے جب لوگ اچھا کام کریں تو اچھائی میں ان کا ساتھ دو اور جب برا کام کریں تو ان کی برائی میں ان کا ساتھ دینے سے اجتناب کرو۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: صَلِّ وَعَلَیۡهِ بِدۡعَتُهٗ اس کے پیچھے نماز پڑھو اس کی بدعت کا نقصان اس کو ہوگا۔[1]

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۸ء)

۱۔ بخاری، باب امامة المفتون والمبتدع، ج۱، ص۹۶

نماز کی قضا

سوال: میں [ایک] فیکٹری میں شفٹوں میں کام کرتا ہوں۔ ہر ہفتے بعد شفٹ بدل جاتی ہے۔ کئی دفعہ رات بارہ بجے سے لے کر دن بارہ بجے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ پھر گھر آ کر سو جاتا ہوں۔ اس دوران میری نمازِ ظہر، عصر اور مغرب قضا ہو جاتی ہے۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ ان نمازوں کو وقت پر ادا کرنا ہوگا یا ان کی قضا پڑھ سکتا ہوں؟ رات کی ڈیوٹی کے بعد گھر آ کر سونا بہت ضروری ہے کیونکہ پھر دوبارہ رات کو ڈیوٹی کرنا ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال مہینے میں آٹھ یا دس دن تک پیش آتی ہے۔

جواب: ادائیگیِ نماز کے سلسلے میں عرض ہے کہ نمازیں اپنے وقت پر پڑھنا چاہییں۔ آپ نمازِ ظہر اور عصر دونوں درمیانی وقت میں پڑھ لیا کریں۔ آج کل اڑھائی بجے سے لے کر تین بجے تک درمیانی وقت ہوتا ہے۔ اس کو 'مثلِ ثانی' کہتے ہیں۔ نمازوں کے لیے جو نقشے مساجد میں آویزاں ہوتے ہیں یا دیگر جگہوں سے دستیاب ہیں، ان میں 'مثلِ ثانی' کے اوقات دیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ نمازِ مغرب اور عشاء بھی درمیانی وقت میں پڑھ لیا کریں۔ یہ درمیانی وقت غروب آفتاب کے پون گھنٹہ بعد سے لے کر ڈیڑھ گھنٹہ تک ہوتا ہے۔ افق پر سرخی کے بعد سفیدی اور سفیدی کے بعد سیاہی آتی ہے۔ سفیدی کا وقت دونوں نمازوں کو جمع کرنے کا وقت ہے۔

ملازمت یا ڈیوٹی کی وجہ سے نمازوں کو قضا کر لینا جائز نہیں۔ اس کی بجائے ڈیوٹی تبدیل کرائی جائے یا پھر ایسی تدبیر کی جائے کہ درمیانی وقت میں آپ دو شفٹوں میں نمازیں پڑھیں اس طرح اپنی نیند بھی پوری کر لیں گے اور نمازیں بھی بروقت ادا کر لیں گے۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۹ء)

صلوٰۃ التسبیح باجماعت

سوال: کیا صلوٰۃ التسبیح باجماعت ادا کرنا درست ہے؟ ہمارے ہاں جماعت اسلامی سے وابستہ خواتین دعوتی مقاصد کے پیشِ نظر اہتمام کے ساتھ صلوٰۃ التسبیح ہفتہ وار باجماعت ادا کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ہم اس لیے کرتی ہیں کہ دعوتی اجتماعات میں حاضری عموماً کم رہتی ہے جب کہ صلوٰۃ التسبیح کی وجہ سے حاضری بہتر ہوتی ہے، اس طرح زیادہ افراد تک دعوت پہنچتی ہے۔ رمضان المبارک میں اس کا اکثر مقامات پر باقاعدگی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔

بعض خواتین وحضرات نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ خواتین کا علیٰحدہ سے باجماعت نماز ادا کرنا درست نہیں۔ صلوٰۃ التسبیح ایک نفلی عبادت ہے جو انفرادی طور پر ادا کرنی چاہیے۔ نیز اس کا مستقل باجماعت ادا کرنا بدعت ہے۔

دوسری جماعتیں جو دین کے نام پر کام کرتی ہیں وہ بھی اس کا باقاعدگی سے اہتمام کرتی ہیں اور لوگ بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ اس معاملے میں رہنمائی فرمائیں۔

جواب: شریعت کی یہ مستقل ہدایت ہے کہ اس کے احکام میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کی جائے اور نہ کسی حکم کی حیثیت اپنے پاس سے زیادہ یا کم کی جائے۔

'نماز باجماعت' سے نماز کو ایسی اہمیت ملتی ہے جو انفرادی نماز کو حاصل نہیں ہے۔ نوافل کوئی بھی ہوں ان کی حیثیت انفرادی ہے یعنی لوگ انفرادی طور پر انھیں ادا کریں۔ اگر لوگ نوافل کو اجتماعی اہتمام کے ساتھ ادا کرنا شروع کردیں تو وہ اس کی اصل حیثیت کو ختم کردیں گے۔ پھر نوافل کی حیثیت بتدریج پانچ نمازوں اور عیدین کی طرح ہو جائے گی جو صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے آپ صلوٰۃ التسبیح اور نفل نمازوں کی ترغیب پر اکتفا کیجیے تاکہ لوگ اپنے طور پر ان کی ادائیگی کا اہتمام کریں لیکن انفرادی طور پر، باجماعت نہیں۔ شریعت کو اپنی اصلی شکل میں رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ کسی کام کو اس بنا پر اجتماعی شکل دینا کہ لوگ اجتماعی شکل دینے سے اس کی طرف زیادہ رُخ

کرتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت یہی چیز تو اس کو اجتماعی شکل دینے میں مانع ہے، اس لیے کہ شریعت بعض عبادتوں کو انفرادی عبادت کے مقام میں رکھنا ضروری سمجھتی ہے تاکہ فرائض اور نوافل دونوں شریعت میں اپنے مقام پر رہیں۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۹ء)

نماز میں گریہ وزاری اور ریا

سوال: نماز پڑھنے کے دوران میری کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ میں گریہ وزاری کے انداز میں رو سکتا ہوں لیکن مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے میں اپنے آپ کو اس لیے روکتا ہوں کہ یہ ریاکاری کے دائرے میں آجائے گا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں تصنع نہیں کر رہا اور بناوٹی طور پر نہیں رو رہا، فی الواقع میری یہ کیفیت ہے، کیا تب بھی اس پر ریاکاری کا اطلاق ہوگا؟ مجھے عملاً کیا کرنا چاہیے، کیا اس کیفیت کے اظہار کو گھر کی تنہائی کی نمازوں تک محدود کرلوں؟

جواب: نماز میں آپ کی یہ کیفیت تو مطلوب ومحمود کیفیت ہے۔ سورۂ انفال میں اہلِ ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اِذَا ذُکِرَاللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (الانفال ۸:۲) ان کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔

سورۂ زمر میں ہے کہ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُالَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَقُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِاللّٰہِ (الزمر ۳۹:۲۳) قرآن سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: وَيَخِرُّونَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۹) اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔

سورۂ مریم میں ہے کہ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَبُكِيًّا (مریم ۱۹: ۵۸) ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمان کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔

جب ایک شخص نے دورِ جاہلیت میں اپنی بیٹی کو کنویں میں دھکا دینے کا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا تو آپؐ رو دیے اور آپؐ کے آنسو بہنے لگے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کرو۔ اس نے دوبارہ بیان کیا اور آپؐ اسے سن کر اس قدر روئے کہ آپؐ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ (دارمی، مقدمہ، باب اول)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بھی روتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن شخیر سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ کے سینے سے رونے کی آواز اس طرح سے آتی تھی جیسے کہ ہنڈیا کے جوش مارنے کی آواز ہوتی ہے۔[1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں فرمایا: ابوبکرؓ سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ابوبکرؓ رقیق القلب ہیں، اپنے آنسو نہیں روک سکتے۔ وہ جب قرآن پاک پڑھتے ہیں تو روتے ہیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ آپؐ کی بیماری کے دوران میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی نے امامت کرائی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے واقعات میں آتا ہے کہ وہ صبح کی نماز میں سورۂ یوسف پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (یوسف ۱۲: ۸۶) (میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا) تو ان کے رونے کی آواز سنی گئی۔ (بخاری)

۱- مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی

اسی بنا پر فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص نماز کے دوران اللہ کے جلال، قرآن پاک کی آیات یا دوزخ کے تصور سے بلند آواز کے ساتھ رو پڑے تو اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب بے اختیار آواز نکل آئے اور تلاوتِ قرآنِ پاک سننا اور سنانا متاثر نہ ہو۔ جب ایک آدمی امام کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے تو اسے دوسروں کے خشوع وخضوع اور نماز اور امام کی قراءت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود رقت کا اس قدر غلبہ ہو جائے کہ آواز سے رونا شروع کر دے تو اس سے نماز میں فرق نہیں پڑے گا۔

اس لیے نماز با جماعت میں کوشش یہی کرنی چاہیے کہ بلند آواز سے نہ روئے تاکہ دوسروں کی نماز خراب نہ ہو اور وہ رونے والے کی طرف متوجہ ہو کر اپنی نماز کی طرف توجہ نہ چھوڑ دیں، نیز اس کے نتیجے میں اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ ریاکاری کا مرض پیدا ہو جائے، اس لیے احتیاط کرنا چاہیے۔

ریاکاری کے حوالے سے تو انسان خود ہی اپنے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے۔ ریاکاری کے اندیشے سے نیک کام چھوڑتے چلے جانا شیطان کی تدبیر ہو سکتی ہے۔ انفاق کے بارے میں بھی حکم ہے کہ خفیہ کرو اور علانیہ بھی کرو۔ نیک اعمال کے مشاہدے سے نیک اعمال کی ترغیب ہوتی ہے۔ اس کی اپنی اہمیت ہے لیکن جو شخص اپنے دل کا مرض محسوس کرے اسے احتیاط کرنا چاہیے۔

ریاکاری کا تعلق دل سے ہے، اپنے دل پر نظر رکھنا چاہیے۔ ریاکار وہ ہوتا ہے جو لوگوں کے سامنے ایک کام کرے لیکن جب لوگ دیکھ نہ رہے ہوں تو اسے نہ کرے۔ لوگوں کے سامنے روزہ دار، نمازی، تہجد گزار کی شکل میں پیش ہو لیکن فی الحقیقت روزہ، نماز، تہجد سے اسے کوئی شغف نہ ہو، جیسے کہ مدینہ کے منافقین کا طرزِ عمل تھا۔ ریاکار بھی دراصل منافق ہوتا ہے۔ حقیقی کیفیات اور ظاہر و باطن میں ہم آہنگی ہو تو پھر ریاکاری نہیں ہوتی۔

رہی یہ بات کہ لوگوں کے سامنے کیا کام کرنا ہے اور تنہائی میں کیا؟ تو اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر جائز کام اور ہر عبادت لوگوں کے سامنے کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح جو کیفیت جائز اور

اسے لوگوں کے سامنے لایا جاسکتا ہے۔ رونا بھی اسی قسم کی کیفیات میں سے ایک کیفیت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور سلفِ صالحین نے کھلے عام بھی اس سے پرہیز نہیں کیا۔ نماز میں ایسی کیفیت طاری ہو اور نماز میں آنسو بہنے لگیں تو انھیں روکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ریاکاری نہیں ہے۔ آدمی مغلوب ہو جائے اور رونے کی آواز نکل آئے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ریاکاری یہ ہے کہ رونا نہ آتا ہو لیکن لوگوں کے سامنے بزرگی، تقویٰ اور ولایت ظاہر کرنے کے لیے روئے، اور گھر میں جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو اس وقت نماز میں خشوع وخضوع بھی نہ ہو، آنسو بھی نہ آئیں اور بے اختیار آواز بھی نہ نکلے۔ آپ نے اپنا جو حال لکھا ہے۔ یہ ریاکار کا حال نہیں ہے بلکہ نیک لوگوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کیفیت میں ترقی فرمائے۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۲۰۰۲ء)

مجبوری کی بنا پر جمع بین الصلاتین

سوال: ۱- ایک شخص رات کھانے سے پیشتر اعصاب کو سکون بخشنے والی ادویات استعمال کرتا ہے جس سے اس پر نمازِ عشاء سے قبل ہی نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جو اپنی مصروفیات یا ذمہ داریوں میں ایسا الجھا ہوا ہے کہ نمازِ عشاء بروقت ادا کرنے کے قابل نہ ہو اور نماز قضا ہونے کا احتمال ہو۔ کیا ایسے دونوں اشخاص کا نمازِ مغرب کے ساتھ نمازِ عشاء کا ملا کر پڑھنا (یعنی نمازِ مغرب ادا کر کے تسبیح وتہلیل کے بعد نمازِ عشاء ادا کرنا) جائز ہے؟

۲- ایک شخص مسجد کے پڑوس میں کاروبار کرتا ہے۔ کاروبار اس نے قرض لے کر شروع کیا ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص دکان پر موجود نہیں ہوتا۔ نماز کے اوقات میں دکان بند کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہے اور سرمایہ ڈوبنے کا ڈر ہے۔ کیا ایسا شخص دکان پر نماز ادا کرسکتا ہے؟

جواب: ۱- رات کھانے سے پہلے خواب آور ادویات کا استعمال یا دنیاوی کاروبار میں منہمک ہو جانا ایسے عذر نہیں ہیں کہ ان کے سبب نمازِ عشاء مقررہ وقت پر ادا نہ کی جائے۔ شدید

مجبوری کی بنا پر جمع بین الصلاتین صرف درمیانی وقت میں کی جاسکتی ہے جو نمازِ مغرب کے تقریباً پون گھنٹہ بعد شروع ہوتا ہے۔ آپ یہ طریقہ اختیار کرسکتے ہیں کہ نمازِ مغرب کے پون گھنٹے بعد نمازِ عشاء پڑھ کر دوائیں اور کھانا کھالیں۔ اس طرح شریعت کی پابندی اور عذر کی رعایت بھی ہو جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شام کے بعد افق پر سرخی کے بعد جو سفیدی آتی ہے وہ جمع بین الصلاتین کا وقت ہے جو غروبِ آفتاب کے تقریباً پون گھنٹہ بعد شروع ہوجاتا ہے۔

دنیاوی کاروبار میں مشغولیت کی وجہ سے نمازِ عشاء کی تقدیم درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ جمعہ میں ایسے کاروبار اور تجارت سے منع فرمایا ہے جو یادِ الٰہی اور نماز سے غافل کرنے والی ہو۔ فرمایا گیا: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (الجمعہ ۶۲:۱۱) اور جب انھوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمھیں کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

اسی طرح جو لوگ اپنے کاروبارِ زندگی کے دوران، نماز اور دیگر عبادات میں خلل نہیں آنے دیتے، ان کی تحسین اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ہے: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ (النور ۲۴:۳۷) ان میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد، اقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کردیتیں۔

اس لیے کاروبار میں الجھ کر رہ جانا یا خواب آور ادویات کے استعمال سے نماز کو اپنے مخصوص اوقات سے مقدم یا مؤخر کرنا درست نہیں ہے۔

۲- نفع و نقصان کا خدشہ ہر وقت موجود ہے۔ جو کچھ اللہ نے کسی کے مقدر میں لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا۔ محض چند خدشات کی وجہ سے نماز کو گھر یا دکان میں پڑھنا درست نہیں۔

(ترجمان القرآن، مئی ۲۰۰۱ء)

غائبانہ نمازِ جنازہ

سوال: غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: غائبانہ نمازِ جنازہ اختلافی مسئلہ ہے۔ احناف کے نزدیک غائبانہ نمازِ جنازہ نہیں ہے۔ امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک بھی غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے۔ اختلافی مسائل میں سختی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر اہلِ حدیث غائبانہ نماز جنازہ پڑھیں تو انھیں منع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اختلافی مسائل میں شریعت کا یہی مزاج ہے۔
(ترجمان القرآن، ستمبر ۲۰۰۰ء)

صاحبِ ترتیب[1] کی قضا نماز

سوال: صاحبِ ترتیب شخص کی ایک نماز قضا ہو جاتی ہے، مثلاً عصر کی نماز قضا ہوئی۔ پھر وہ مغرب کی نماز کے لیے اس وقت مسجد پہنچا جب کہ جماعت بالکل تیار ہے۔ آیا وہ شخص باجماعت نماز چھوڑ کر پہلے قضا نماز پڑھے یا پہلے مغرب کی نماز پڑھے؟

جواب: صاحبِ ترتیب شخص کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قضا شدہ نماز پڑھے اور اس کے بعد وقتی۔ اگر جماعت کھڑی ہوگئی ہو تو پھر بھی پہلے قضا نماز پڑھے اور پھر جماعت کے ساتھ شریک ہو جائے۔ جماعت مل جائے تو فبہا، نہ ملے تو اکیلے پڑھ لے۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۹۲ء)

۱۔ فقہ کی اصطلاح میں صاحبِ ترتیب وہ شخص ہوتا ہے جس کی عمر بھر میں کبھی مسلسل چھے نمازیں قضا نہ ہوئی ہوں۔ (مرتب)

نماز میں سورتوں کی ترتیب

سوال: ایک شخص ظہر کی نماز میں جماعت کے ساتھ اس وقت شریک ہوتا ہے، جب کہ ایک رکعت گزر چکی ہوتی ہے۔ اب جب وہ یہ رکعت آخر میں پڑھتا ہے تو فاتحہ کے بعد وہ قرآن میں ترتیب کے لحاظ سے پہلے آنے والی سورت پڑھے گا یا بعد میں آنے والی مثلاً جب وہ جماعت میں شریک ہوا تو دوسری رکعت جاری تھی اور امام نے سورہ فلق پڑھی۔ اب سلام کے بعد جب وہ کھڑا ہوگا تو کیا سورۃ الناس پڑھے یا سورہ فلق سے پہلے آنے والی کوئی سورہ پڑھے گا؟

جواب: مقتدی جب امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ نماز پڑھنا شروع کرے تو فاتحہ کے بعد کوئی بھی سورۃ پڑھ سکتا ہے۔ ترتیب کا قائم رکھنا ضروری نہیں ہے۔ دراصل ایسا شخص ان رکعتوں کی قضا کرتا ہے جنھیں امام اس سے پہلے پڑھ چکا تھا۔ گویا یہ بعد والی رکعتیں پہلے پڑھتا ہے اور پہلے والی رکعتیں بعد میں پڑھتا ہے۔ اس طرح سے اس کی نماز میں ترتیب تو ختم ہو گئی ہے۔ آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ امام کے پیچھے فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت بھی پڑھتے ہیں ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ امام کے پیچھے سِرّی نمازوں میں صرف فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے۔ بہرحال جب ایسی صورت پیش آجائے تو ان رکعتوں میں، جن کی آپ امام کے پیچھے قضا کریں کوئی بھی سورت پڑھ سکتے ہیں۔ امام نے جو سورتیں پڑھی ہیں، ان کو مدنظر رکھ کر ترتیب سے سورتیں پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ بالعموم کبھی پہلے پڑھی جانے والی رکعت کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کیا پڑھا گیا۔ خصوصاً سری نمازوں میں تو بالکل ہی لاعلمی رہتی ہے۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۸۷ء)

☆......☆......☆

باب چہارم

روزہ

رؤیتِ ہلال

سوال: ہمارا گاؤں دور دراز دیہات میں واقع ہے۔ شروع ہی سے ہمارے ہاں یہ معمول چلا آرہا ہے کہ عموماً لوگ سرکاری اعلان سے ایک دن پہلے رمضان المبارک کے روزے رکھنے شروع کرتے ہیں اور ایک دن پہلے ختم کرکے عید مناتے ہیں۔ یہی حال اس علاقے کے تقریباً تمام دیہات کا ہے۔ رمضان المبارک اور عید کا اعلان ایک مقامی مدرسے کا مہتمم کرتا ہے، جس کا صحیح حال اللہ ہی جانتا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کل روزہ نہیں ہے جب کہ مقامی علما کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ روزہ ہے۔ یہ اعلان اکثر اوقات بغیر کسی معتبر شہادت کے ہوتا ہے۔ اب میں بہت پریشانی میں مبتلا ہوں اور کوئی متعین صورت نہیں پاتا ہوں۔ آپ مہربانی کرکے ایک متعین اور واضح صورت بتادیں کہ حکومت کے اعلان پر عمل کرکے تمام ملک والوں کے ساتھ روزہ رکھوں اور عید مناؤں یا مقامی علما کے اعلان پر عمل کرکے مقامی لوگوں کے ساتھ۔ یہ بات بھی بتادینا چاہتا ہوں کہ ان مقامی لوگوں میں ایک قلیل تعداد ان کی بھی ہے جو حکومت کے اعلان پر عمل کرتی ہے۔

اگر آپ مؤخر الذکر رستے پر جانے کی تاکید کرتے ہیں تو اس حال میں پہلے روزے کی فرض کی نیت کروں یا نفل کی؟ اگر میں مقامی علما کے اعلان کے مطابق پہلا روزہ رکھوں اور پھر ڈیوٹی پر حاضر ہو جاؤں اور کالج میں لوگوں کا روزہ نہیں ہوتا، جو کہ عموماً نہیں ہوتا، کیونکہ شہر کے لوگ اکثر حکومت کی پیروی کرتے ہیں، تو اس حال میں میرے لیے توڑنا مناسب ہوگا یا رکھنا؟

جواب: اب جب کہ حکومت نے رویتِ ہلال کے لیے ایک مرکزی کمیٹی تشکیل دے دی ہے اور پھر ضلعی سطح پر رویتِ ہلال کمیٹیاں بھی قائم ہیں جن میں قابل اعتماد علما بھی شامل ہیں تو اس بات کا موقع نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ حکومت کی طرف سے رمضان شریف کا اعلان نہ ہو اور کوئی مقامی عالم رمضان شریف کا اعلان کرکے روزے رکھوانا شروع کردے۔ اس کے بجائے حکومت

کی رویتِ ہلال کمیٹیوں اور مقامی علما کا فرض ہے کہ وہ آپس میں رابطہ قائم کریں۔ اگر کسی عالم نے شرعی شہادتوں کی روشنی میں رمضان کے چاند ہو جانے کا فیصلہ کیا ہو اور فیصلہ دینے والا عالم قضا کا اہل ہو تو وہ اپنے فیصلے کو ضلعی رویتِ ہلال کمیٹی کے سامنے پیش کرے اور ضلعی کمیٹی مرکزی کمیٹی کے سامنے پیش کرے۔ ضلعی اور مرکزی کمیٹی کو چاہیے کہ وہ قواعد کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ دے۔ پھر ضلعی اور مرکزی کمیٹیوں کی طرف سے اس فیصلے کی تصدیق و تائید ہو جائے تو پورے ملک میں اس کے مطابق عمل ہو جائے گا اور اگر مقامی عالم کا فیصلہ شرعی وجوہ کی بنا پر رد کر دیا جاتا ہے اور اس کی گنجایش موجود ہے، اس لیے کہ وہ باقاعدہ قاضی نہیں ہے تو ایسی صورت میں ملک کے کسی حصے کے باشندوں پر اس کا حکم نافذ نہیں ہوگا۔ البتہ وہ شخص یا اشخاص جنھوں نے شہادتیں دی ہوں اور انھیں یقین ہو کہ انھوں نے چاند دیکھا ہے تو وہ روزہ رکھنے کے پابند ہوں گے، لیکن اگر نہ رکھیں تو ان پر کفارہ نہیں ہوگا۔ (الہدایہ) لیکن اگر مرکزی کمیٹی بلاوجہ اس طرح کے فیصلے کو نہیں مانتی تو اسے نااہلیت کی بنا پر توڑ دیا جائے۔

افسوس ہے کہ ابھی تک رویتِ ہلال کمیٹیوں کو سرکاری کمیٹیاں سمجھ کر ان سے تعاون نہیں کیا جاتا اور یہ کمیٹیاں بھی اپنے فیصلوں میں شرعی ضوابط کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے علما سے تعاون لینے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ نتیجہ افراتفری ہے اور ایسی صورت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ اپنے یقین اور جزم کے مطابق عمل کریں اور علاقے کے لوگوں سے اتفاق واتحاد کے پہلو کو بھی لازماً مدنظر رکھیں۔ نیز اصولاً لوگوں کو کسی مقامی عالم کے اعلان کے بجائے حکومت کی قائم کردہ آزاد رویتِ ہلال کمیٹی کے اعلان پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ اسی کی حیثیت قاضی کی ہے اور اسی کا فیصلہ قاضی کا فیصلہ ہے۔ جو لوگ اس سے ہٹ کر مقامی عالم کے اعلان پر روزہ رکھیں گے وہ نفل کی نیت سے روزہ رکھیں، رمضان کے روزے کی نیت نہ کریں۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۸۶ء)

روزے میں ان ہیلر کا استعمال

سوال: میں کافی عرصے سے دمہ کا مریض ہوں۔ پہلے تو دوا کھانے سے کافی وقفہ مل جاتا تھا مگر اب دو یا تین گھنٹے سے زیادہ وقفہ نہیں ہوتا اور ان ہیلر کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کیا روزے کی حالت میں سانس کی تکلیف میں ان ہیلر کا استعمال ہوسکتا ہے؟

جواب: ان ہیلر کے ذریعے دوا جوف معدہ اور پھیپھڑوں میں جاتی ہے جیسا کہ اس دوا کے استعمال کے لیے بیان کردہ نقشے سے واضح ہے۔ نیز یہ بات بھی اسی میں کہی گئی ہے کہ یہ دوا بعض اوقات دودھ پلانے والی عورت کے دودھ میں بھی نکل آتی ہے۔ جب دوا جوفِ معدہ اور جوفِ دماغ میں داخل ہو جاتی ہو تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے اس ضابطے کے مطابق ان ہیلر کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

آپ اگر دمے کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے اور آپ کو مجبوراً ان ہیلر استعمال کرنا پڑتا ہے تو آپ بے شک روزہ نہ رکھیں بلکہ روزے کی جگہ فدیہ دے دیں۔ بعد میں بیماری سے شفا ہو جائے تو قضا کرلیں ورنہ فدیہ کافی ہوگا۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۲۰۰۰ء)

انجکشن کا مسئلہ

سوال: آج کل ایمرجنسی کی صورت میں بعض علما حضرات گوشت والا ٹیکہ یا وریدی ٹیکہ لگانے کی اجازت دیتے ہیں۔ کیا زیادہ تکلیف کی صورت میں گوشت والا ٹیکہ یا وریدی ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب: ٹیکے کا مسئلہ مختلف ہے۔ بعض ٹیکوں کے بارے میں دو رائے ہیں اور بعض کے

بارے میں اتفاق ہے کہ ان سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جس ٹیکے کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ اس سے دوا جوفِ معدہ اور جوفِ دماغ میں پہنچتی ہے، اس کے بارے میں اتفاق ہے کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور جس ٹیکے کے بارے میں اس حوالے سے اختلاف ہے تو جن حضرات کے نزدیک خود دوا پہنچتی ہے ان کے نزدیک اس قسم کے ٹیکے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جن کے نزدیک دوا بذاتِ خود نہیں پہنچتی بلکہ اس کی تاثیر پہنچتی ہے، ان کے نزدیک اس قسم کے ٹیکے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اگر روزہ رکھنے کی استطاعت ہو تو ایسا ٹیکہ استعمال کر لیں جس سے دوا براہِ راست جوفِ معدہ اور دماغ میں نہیں پہنچتی۔ اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ آپ کا روزہ ہو جائے گا۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۲۰۰۰ء)

ہفتے کے دن روزہ رکھنا

سوال: ہفتہ کا روزہ نہ رکھنے کے بارے میں کتاب الصوم میں ایک مستند حدیث دیکھی۔ لیکن ساتھ ہی دوسری حدیث بھی ہے جس سے ذہن میں الجھن پیدا ہوئی۔ اب کس پر عمل کروں؟

جواب: ہفتے کے دن روزے کے بارے میں آپ نے دو روایتوں کے درمیان تعارض کا جو ذکر کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہفتے کے روز فی نفسہٖ روزہ رکھنا جائز ہے۔ اس لیے کہ ۵ دنوں عیدالفطر، عید الاضحیٰ اور ایام تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳/ ذوالحج) کے سوا باقی تمام دنوں میں روزہ رکھنا باعثِ ثواب ہے، البتہ اس وجہ سے روزہ رکھنا کہ ہفتے کا دن متبرک ہے جیسے کہ یہودی سمجھتے تھے، درست نہیں ہے۔ منع کرنے والی روایت دوسری صورت پر محمول ہے اور جواز اور ثواب والی روایت پہلی صورت پر محمول ہے۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۲۰۰۰ء)

روزے کا فدیہ

سوال: یہاں ایک سعودی ریڈیو کو سنتے ہوئے سوال پیدا ہوا کہ ایک شخص جو رمضان شریف میں روزے رکھتا ہے لیکن مہینہ ختم ہونے سے قبل فوت ہو جاتا ہے تو کیا اس کی جانب سے کوئی اس کا بھائی یا قریبی رشتہ دار باقی روزے رکھے اور کسی طرح مرحوم کو بخشے؟ کیا مرحوم کے لیے قرآن شریف پڑھ کر بخشش کر سکتے ہیں؟

جواب: ایک شخص رمضان میں فوت ہو گیا اور بیماری کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکا تو اس کی طرف سے روزوں کی قضا نہیں ہے۔ اور فدیہ بھی نہیں ہے کیوں کہ اس پر روزے فرض ہی نہیں ہوئے تھے۔

قرآن پاک پڑھ کر اس کا ثواب پہنچانا جائز ہے البتہ مروجہ رسمی اور نمایشی طریقوں سے ختم قرآن کرانا اور پڑھنے والوں کو اجرت دینا ایسی چیزیں ہیں جن کی اصلاح ہونی چاہیے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

باب پنجم

حج وقربانی

بالغ بچے کا حج

سوال: ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ اس کی بچیاں، جو کہ ان کے ساتھ یہاں سعودی عرب میں رہایش پذیر ہیں، بالغ ہو چکی ہیں۔ اگر وہ اب اپنے والدین کے ساتھ حج کا فریضہ ادا کر لیں تو کیا ان کا فرض عنداللہ ادا ہو جائے گا؟ یہ بات اس لیے بھی پوچھی جا رہی ہے کہ اس وقت ان کے لیے حج ادا کرنا آسان ہے بہ نسبت بعد کے، جب کہ وہ خود کفیل ہو جائیں یا شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔

جواب: نابالغ بچے اور بچیاں حج کریں تو وہ نفل شمار ہوگا۔ بالغ ہونے کے بعد والدین کے ساتھ حج کریں تو فرض شمار ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں آپ آسانی کے ساتھ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو بچے اور بچیاں والدین کے ساتھ حج کرتے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ اگر بالغ ہونے کے بعد حج کریں گے تو ان کا فرض ادا ہو جائے گا۔ دوبارہ حج کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۳ء)

حجِ بدل، جہاد فنڈ یا خدمتِ خلق

سوال: بندہ ایک ریٹائر ملازم ہے، عمر ۶۰ سال سے کچھ اوپر ہے۔ بندہ کی ریٹائرمنٹ طبی بنیادوں پر ۱۹۸۶ء کے دوران ہوئی۔ ذیابیطس کا پرانا مریض ہے depression کا بھی شکار چلا آتا ہے۔ بندہ اس وقت بوجہ عمومی کمزوری لاٹھی کے سہارے تھوڑا بہت چل لیتا ہے۔ بندہ کی بیٹی جس کی عمر تقریباً ۲۲ سال ہے، کی شادی تا حال نہیں ہو سکی۔ البتہ منگنی ہو گئی ہے۔

دیرینہ خواہش تھی کہ حج کی سعادت سے بہرہ مند ہو جاتا مگر جوان بیٹی کی نگہداشت کے باعث یہ معاملہ ملتوی ہوتا رہا۔ بندہ کی موجودہ صحت کی وجہ سے عزیز واقارب، جو کہ حج بیت اللہ کی

سعادت حاصل کر چکے ہیں، کہتے ہیں کہ بندہ کے لیے یہ فریضہ ادا کرنا مشکل ہے۔
اندریں حالات بندہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر صحت حج کی ادائیگی کے معاملے میں واقعی مانع ہے تو بندہ حجِ بدل کا اہتمام کیوں نہ کرے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی خیال آ رہا ہے کہ اگر اسلام میں گنجایش ہو تو حجِ بدل پر اٹھنے والی رقم جہادِ افغانستان، جہادِ کشمیر، جماعتِ اسلامی یا کسی یتیم و بے سہارا بچی کی شادی کے سلسلے میں دے دی جائے تو کیا اس صورت میں حج بدل ادا ہو جائے گا؟

جواب: حج بدل وہ آدمی کرا سکتا ہے جو خود حج کرنے کے قابل نہ ہو۔ اگر ایک آدمی چل پھر سکتا ہے، ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حج بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں حج کے لیے کافی سہولتیں میسر ہیں۔ بعض لوگ خود طواف نہیں کر سکتے انھیں چار پائی پر بٹھا کر طواف کرا دیا جاتا ہے۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی اسی طرح کرا دی جاتی ہے۔ کنکر پھینکنے کا کام کسی وکیل سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر لیں کہ آپ سفر اور حج کے قابل ہیں یا نہیں۔ اگر استطاعت پاتے ہیں تو آپ خود حج کریں ورنہ کسی اور کو اپنی طرف سے حج کے لیے بھیج دیں۔ وہ آپ کی طرف سے حج کی نیت کرے گا اور اخراجات آپ کو ادا کرنے ہوں گے۔

حج آپ پر فرض ہے اور جہاد آپ کے لیے نفل ہے۔ اس لیے جہاد فنڈ میں رقم ادا کر دینے سے آپ پر عائد فرض ساقط نہیں ہوگا۔ البتہ جہاد فنڈ میں رقم لگانے کا ثواب مل جائے گا۔ حج پھر بھی آپ کو کرنا پڑے گا یا کسی کو حج پر اپنے بدلے میں بھیجنا ہوگا۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۲ء)

فریضۂ حج اور حجِ بدل

سوال: ایک آدمی کی پرورش نانا نے کی اور انھوں نے اپنی زندگی میں حج نہیں کیا کیونکہ استطاعت نہ تھی۔ اب ان کے نواسے صاحبِ استطاعت ہیں، لیکن نانا جان اب بالکل معذور ہیں، وہ ان کی طرف سے کسی دوسرے آدمی کو حج پر بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس صورت میں حج نفل ہوگا یا فرض؟ حج کس کی طرف سے ہوگا؟ وہ آدمی نیت کیا کرے؟ جس آدمی نے حج کرانے کا وعدہ کیا ہے، کیا اس پر بھی حج کرنا فرض ہے؟ کسی کے فوت ہونے کے بعد حج کی کیا نیت ہو؟

جواب: اگر ایک شخص اتنی مالی حیثیت رکھتا ہے کہ اس پر حج فرض ہو، لیکن خود سفر کے قابل نہیں رہا تو وہ کسی بھی شخص کو چاہے اس کا نواسا ہی کیوں نہ ہو، اپنی طرف سے حج پر بھیج سکتا ہے۔ حج پر جانے والا یہ ارادہ کرے کہ وہ اس شخص کی طرف سے حج کر رہا ہے جو اسے حج پر بھیج رہا ہے۔ اس شخص کے جملہ اخراجات بھیجنے والے کو برداشت کرنا ہوں گے اور حج بھی بھیجنے والے کی طرف سے شمار ہوگا۔ یہ تو اس صورت کا حکم ہے جب معذور نانا مالی لحاظ سے صاحبِ استطاعت ہوں لیکن بدنی لحاظ سے معذور ہوں۔ اگر نانا صاحب مالی لحاظ سے بھی صاحبِ استطاعت نہیں بلکہ نواسے صاحبِ استطاعت ہیں تو وہ پہلے سال اپنا حج کریں اور نانا صاحب کی طرف سے اگلے سال حج کر لیں اور اگر اسی سال ان کی طرف سے حج کرانا چاہیں تو کسی دوسرے کو ان کی طرف سے حج کرا دیں۔

اگر کسی شخص نے کسی سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے حج پر بھیجے گا تو اسے اخلاقاً اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے، لیکن اگر اس نے خود حج نہیں کیا اور اس پر حج فرض ہے اور وہ حج پر جا بھی سکتا ہے، معذور نہیں ہے تو ایسے شخص کا کسی دوسرے کو حج پر بھیجنا، بھیجنے والے کے حج کا بدل نہیں ہوگا۔ البتہ رقم خرچ کرنے کا ثواب اسے ضرور مل جائے گا۔ ان شاءاللہ

کسی کے فوت ہونے کے بعد اس کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔ اس حج کا ثواب فوت ہونے والے کو ملے گا۔ اگر اس نے حجِ بدل کی وصیت کی تھی تو اس کی طرف سے حجِ بدل بھی ہو جائے گا۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۸۹ء)

حالتِ عدت میں حج

سوال: میری والدہ کی عمر ۶۵ برس ہے۔ ان کو حج پر جانے کی بہت تمنا تھی۔ اس دفعہ میں نے ان کے لیے درخواست دے دی۔ درخواست دینے کے بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور عدت کے ۱۳۰ دن حج کی آخری فلائٹ تک بھی پورے نہیں ہو پاتے۔ کیا کسی طرح سے بھی کوئی گنجایش ہو سکتی ہے کہ ان کی دیرینہ تمنا پوری ہو سکے؟ ان کی صحت بھی دن بدن بہت خراب ہو رہی ہے، اگلے سال تک شاید وہ جانے کے قابل نہ رہ سکیں اور پھر شاید محرم کا ساتھ بھی نہ مل سکے۔

جواب: عدت پورا کرنے سے پہلے سفرِ حج پر جانے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ جو عورت عدت میں ہے وہ بحقِ شوہر اپنے گھر میں محبوس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ ۲: ۲۳۴) تم میں سے وہ لوگ جو فوت ہو جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ دیتے ہیں، وہ (بیویاں) اپنے آپ کو روکے رکھیں چار مہینے دس دن۔

آپ اپنی والدہ صاحبہ کو عدت پورا کرنے کے بعد حج پر لے جانے کا اہتمام کریں۔ اگر مشیتِ الٰہی کی وجہ سے وہ حج نہ کر سکیں تو ان کا اجر ثابت ہے اور اصل مطلوب تو اجر ہی ہے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۵ء)

غیر محرم کے ساتھ حج

سوال: میری بیوی کے ساتھ اس کی بھابی جن کے لیے میں غیر محرم ہوں، حج پر جانا چاہتی ہیں۔ بعض دوسرے اعزّہ کا بھی ساتھ ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا اس صورت میں میری زوجہ کی بھابی ہمارے ساتھ حج پر جاسکتی ہیں۔ میں نے مولانا محمد یوسف اصلاحی کی رائے کی روشنی میں اثبات میں جواب دیا۔ مولانا اصلاحی فرماتے ہیں: جس خاتون کا شوہر نہ ہو اور کوئی ایسا محرم بھی نہ ہو جس کے ساتھ سفرِ حج میں جاسکے تو پھر وہ ان رفقاے سفر کے ساتھ سفر کرسکتی ہے جن کی اخلاقی حالت قابلِ اطمینان ہو۔ یہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ [آسان فقہ، حصہ دوم، حاشیہ، ص ۱۸۴]

مسئلے کی نزاکت کے سبب میں نے یہاں ایک مولوی صاحب، جو مسجد کے خطیب اور حافظِ قرآن ہیں، سے پوچھا اور درج بالا کتاب کا حوالہ دیا۔ انھوں نے کہا: یوسف اصلاحی، مودودی ذہن کا بندہ ہے۔ یہ حوالہ بھی غلط ہے۔ وہ آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی اور جائے گی تو حج نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ سے رہنمائی درکار ہے۔

جواب: اس مسئلے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ حج کے لیے ایک خاتون اس وقت جاسکتی ہے جب فتنے سے اطمینان ہو اور معتمد علیہ خواتین کی جماعت اور قابلِ اعتماد غیر محرم مردوں کے ذریعے تحفظ حاصل ہو۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس کے لیے حکومت کے سامنے غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے۔ فرماتے ہیں: وَ فِی کُتُبِ الْحَنَفِیَّةِ عَامَّةَ عَدَمُ جَوَازِ السَّفَرِ اِلَّا مَعَ مَحْرَمٍ قُلْتُ وَ یَجُوْزُ عِنْدِیْ مَعَ غَیْرِ مَحْرَمٍ اَیْضًا مَعَ شَرْطِ الْاِعْتِمَادِ وَالْاَمْنِ مِنَ الْفِتْنَةِ وَ قَدْ وَجَدْتُ لَهٗ مَادَّةً کَثِیْرَةً فِی الْاَحَادِیْثِ اَمَّا فِی الْفِقْهِ فَهُوَ مِنْ مَّسَائِلِ الْفِتَنِ[1] فقہ حنفی کی کتابوں میں عام طور پر غیر محرم کے ساتھ سفرِ حج کے

۱- فیض الباری، ج ۲، ص ۳۹۷، باب فی کم یقصر الصلوۃ۔

عدمِ جواز کا ذکر ہے مگر میرے نزدیک جب فتنے کا خطرہ نہ ہو اور غیر محرم ایسا ہو جس پر اعتماد ہو تو جائز ہے۔ اس کے جواز کے لیے میرے پاس بہت سی احادیث ہیں، البتہ فقہ میں یہ مسئلہ فتن کے قبیل سے ہے۔

اس کے حاشیے میں مولانا بدر عالم نے اس حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالعاص سے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے، فرمایا تھا کہ صاحبزادی زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں اور جس آدمی کے ساتھ بھیجنے کا فرمایا تھا وہ ان کا محرم نہ تھا۔

نقل کردہ عبارت کا مطلب یہ ہے کہ غیر محرم کے ساتھ سفر کرنا اس وقت منع ہے جب کہ فتنے کا احتمال ہو۔ فقہ کی کتابوں میں جو بات ہے، اس کا تعلق فتنے سے ہے۔ اس لیے مولانا محمد یوسف اصلاحی کی بات صحیح ہے۔ آپ کی اہلیہ کی بھابی آپ کے ساتھ حج کر سکتی ہے۔ البتہ حکومت اگر سوال کرے تو بتا دیں کہ یہ میری اہلیہ کی بھابی ہیں اور اس طرح میں غیر محرم ہونے کے باوجود شرعاً محرم کی طرح انھیں اپنے ساتھ حج کے لیے لے جا سکتا ہوں۔ فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں اس کی اجازت ہے اور فقہ حنفی کی باریکیوں کو سمجھنے والوں نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۸ء)

سرکاری خرچ پر حج

سوال: کیا حکومت پاکستان اپنے اخراجات پر ایسے افراد کو حج پر بھیج سکتی ہے جن پر حج فرض نہیں ہے جب کہ حکومت خود قرض میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس صورت میں حج کا ثواب کسے ملے گا؟

جواب: ایک مسلمان فرد، ادارہ یا ملک عیاشی اور سہولتوں کے لیے قرض نہیں لیتا اسلام کی یہی تعلیم ہے۔ لیکن پاکستان سمیت جملہ اسلامی ممالک جن قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں وہ اسی قسم کے قرضے ہیں۔ صنعتی، زرعی اور رفاہی کاموں کے لیے قرض لینا اور پھر اس پر سود ادا کرنا اور اس سلسلے کو مسلسل جاری رکھنا، بلکہ ان قرضوں کے حصول کی خاطر اپنی ملکی پالیسیاں قرض دہندگان

کے منشا کے مطابق ترتیب دینا کسی بھی درجے میں شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ایسے قرضے لینا اوران پر سود دینا دونوں ہی ناجائز ہیں۔ایسی صورت میں سوال یہ ہونا چاہیے کہ بیرونی قرضوں سے سڑکیں اور پل بنانا، جہاز خریدنا، تعلیمی اور انتظامی منصوبے بنا کر ان پر اربوں روپے خرچ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟ اوران قرضوں کی ادائیگی کی راہ میں جواخراجات رکاوٹ ہیں وہ اخراجات کرنا جائز ہیں یانہیں؟ لیکن کوئی بھی یہ سوال نہیں اٹھاتا کہ کام ودہن اور جسم وجان کی ان لذتوں پر جو اخراجات ہورہے ہیں ان کی شرعی حیثیت کیا ہے اور یہ جائز ہیں کہ ناجائز؟ اور کبھی اس کی بات کی جاتی ہے تو آگے سے یہ جواب ملتا ہے کہ دورِ حاضر میں ان چیزوں کے بغیر گذارا ممکن نہیں ہے اور ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنی سڑکوں کو ویران، نہروں کو خشک اور زمینوں کو بنجر کردیں اور زندگی کی گاڑی کو جام کردیں۔لیکن اگر چند افراد کے دینی جذبے کی تسکین کا سامان ہو جاتا ہے تو اس کے بارے میں سوال اٹھالیا جاتا ہے کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ایک انسان قرض کی کار میں قرض سے بنی ہوئی سڑک پر قرض سے بنے ہوئے دفتر میں قرض سے حاصل کردہ کرسی اور میز پر جاکر بیٹھتا ہے تو اس کے متعلق یہ سوال کرنا کہ ایسے ہزاروں افراد میں سے چند افراد جو مسجد میں جاکر نماز پڑھتے ہیں ان کی نمازوں کا کیا حکم ہے کوئی معقول سوال نہیں ہے۔اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ انواع واقسام کے کھانے جو قرض لے کر لگائے گئے ہوں ان کے متعلق تو بات نہ کی جائے کہ ان کی کیا حیثیت ہے لیکن ان میں جو نمک اور مرچ ڈالے گئے ہیں ان کے متعلق کہا جائے کہ ان کی کیا حیثیت ہے۔عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے قرضے لینا بذاتِ خود حماقت ہے اور پھر اگر ان سے نجات حاصل کرنا مطلوب ہو تو ایسے تمام اخراجات ختم کرنا ہوں گے جو ان کی ادائیگی میں رکاوٹ ہیں۔ جہاں تک چند افراد کو حج پر بھیجنے کا تعلق ہے تو میرے خیال میں یہ کوئی ایسا خرچ نہیں ہے جو قرضوں کی ادائیگی میں کسی بھی درجہ رکاوٹ بنتا ہو اس لیے یہ جائز ہے۔

بیت المال مختلف قسم کی مدات پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں آمدن کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں۔ کچھ رقمیں محاصل سے حاصل ہوتی ہیں، کچھ زکوٰۃ اور کچھ معدنیات، تیل اور گیسز کے ذخائر

سے حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کچھ مخصوص مقاصد کے لیے بیرونی قرضے بھی حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان کا مصرف وہی مقاصد ہوتے ہیں جن کے لیے یہ قرضے حاصل کیے جاتے ہیں، لیکن دوسری مدات کا مصرف رفاہِ عامہ، حکومت کے انتظامی اخراجات اور فقرا و مساکین کی دینی اور دینوی ضروریات ہوتی ہیں۔ حکومت کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ ان رقوم کو رفاہی کاموں، جائز انتظامی مصارف اور قرضوں کی ادائیگی میں خرچ کرے وہاں اس کا یہ بھی فرض ہے کہ ان رقوم سے مسلمانوں کے لیے مساجد و مدارس اور دینی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔ لیکن ہماری حکومت ان مدات میں کسی قسم کے اخراجات نہیں کرتی۔ انھی مدات میں ایک مد حج بھی ہے جس میں برائے نام کبھی کبھار خرچ کر دیتی ہے۔ یہ ایک جائز مصرف ہے۔ حج کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین نے بیت المال کے اونٹ عاریتاً دیے کہ ان پر حاجی حج کر سکیں۔ آج اگر حکومت کسی حاجی کے لیے اس قسم کا انتظام کرتی ہے تو اس کی نظیر موجود ہے۔ البتہ اس میں ضروری ہے کہ بطور رشوت حج نہ کرایا جائے اور اس پر اتنی رقم خرچ نہ کی جائے جو بیت المال کی دیگر مدات اور مصارف کو متاثر کرے۔

جہاں تک ثواب کا تعلق ہے تو حدیث شریف کے مطابق ثواب صاحبِ مال کو بھی ملے گا، دینے والے کو بھی اور حج کرنے والے کو بھی...... مال چونکہ قوم کا ہے اس لیے مال کا ثواب قوم کو ملے گا، دینے کا کام حکومت کرتی ہے لہٰذا دینے کا ثواب اسے ملے گا اور حج کا ثواب اسے ملے گا جس نے حج کیا ہے۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۱ء)

قربانی کے جانوروں کی عمریں

سوال: مسئلہ درپیش ہے کہ قربانی کا جانور، بکرا، چھترا، دنبہ ایک سال کا ہونا چاہیے یا دو دانت ہونا ضروری ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات پختہ تھی کہ جانور ایک سال کا ہونا چاہیے۔لیکن میرے ایک اہلِ حدیث دوست نے مجھے یہ حدیث لکھ کردی ہے: عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَاتَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّۃً اِلَّا اَنْ یُعْسَرَ عَلَیْکُمْ فَجَذَعَۃٌ مِّنَ الضَّأْنِ (مسلم)[حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ذبح نہ کرو مگر ایک سال کا جانور، سوائے اس کے کہ تمھارے لیے مشکل ہو جائے۔ تب سات آٹھ ماہ کا موٹا دنبہ بھی ذبح کر سکتے ہو] براہِ کرم احادیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب: قربانی کے لیے جانوروں کی عمریں متعین ہیں۔ بکرا، بکری، دنبہ، چھترا وغیرہ ایک سال اور گائے وغیرہ دو سال کی۔ بلکہ بھیڑ اور دنبہ اگر سال سے کم بھی ہو لیکن خوب فربہ اور تیار ہو اور سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ البتہ چھ مہینے سے کم کسی صورت میں نہ ہو۔ اس سلسلے میں احادیث اور فقہا کی آرا درج ذیل ہیں:

۱۔ عَنْ اَبِیْ کِبَاشٍ قَالَ: جَلَبْتُ غَنَماً جَذَعًا اِلَی الْمَدِیْنَۃِ فَکَسَدَتْ عَلَیَّ، فَلَقِیْتُ اَبَاھُرَیْرَۃَ فَسَأَلْتُہٗ فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: نِعْمَ اَوْ نِعْمَتِ الْاُضْحِیَۃُ الْجَذَعُ مِنَ الضَّأْنِ قَالَ فَانْتَھَبَہُ النَّاسُ (ترمذی، مسلم) حضرت ابو کباش سے روایت ہے کہ میں جذعہ کی عمر کی بکریاں مدینے لایا تا کہ ان کو فروخت کردوں، تو ان کی طرف کسی کو رغبت نہ ہوئی (اس لیے کہ ان کی عمریں کم تھیں اور لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی قربانی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کوئی خریدنے کے لیے تیار نہیں تھا) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملا اور (جذعہ کی قربانی کے بارے میں) پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جذعہ کی قربانی اچھی قربانی ہے۔ (حضرت ابو کباش) فرماتے ہیں کہ اس کے بعد

لوگ میری بھیڑوں اور دنبوں پر (خریدنے کے لیے) ٹوٹ پڑے۔

۲-عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَاهُ غَنَمًا يُقَسِّمُهَا عَلٰى اَصْحَابِهِ ضَحَايَا، فَبَقِيَ عَتُوْدٌ اَوْ جَدْيٌ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ضَحِّ بِهِ اَنْتَ (ترمذی، حدیث حسن صحیح) عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھیڑ بکریاں دیں تا کہ وہ انھیں آپؐ کے اصحاب میں قربانی کے لیے تقسیم کر دیں۔ ان میں سے ایک 'عتوذ' یا 'جدی' باقی بچا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کی تُو خود قربانی کر۔

ان احادیث سے ثابت ہے کہ 'جذعہ' اور 'عتوذ' کی قربانی بالکل جائز اور صحیح ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ 'جذعہ' اور 'عتوذ' کسے کہتے ہیں۔

۱- مشہور اہلِ حدیث عالم علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے اپنی کتاب تحفة الاحوذی شرح جامع الترمذی میں 'جذع' کے معنی کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَهُوَ وَصْفٌ لِسِنٍّ مُعَيَّنٍ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَمِنَ الضَّأْنِ مَا اَكْمَلَ السَّنَةَ وَ هُوَ قَوْلُ الْجُمْهُوْرِ وَ قِيْلَ دُوْنَهَا. (تحفة الاحوذی، دوم، ص ۳۵۵) یعنی جذعہ چوپایوں کی ایک خاص عمر کا وصفی نام ہے، بھیڑ اور دنبہ میں 'جذعہ' اس کو کہتے ہیں جو سال بھر کا ہو۔ یہ جمہور کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے کہ سال سے کم عمر کا ہو۔

۲- لغت کی مشہور کتاب، المخصص میں جذعہ کے معنی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

فَاِذَا اَتَمَّتْ لَهٗ سَنَةٌ مِّنْ مَّوْلِدِهٖ فَهُوَ جَذَعَةٌ جب اس کے وقتِ پیدائش سے لے کر ایک سال ہو جائے تو وہ جذعہ ہے۔

۳- وَ ذَكَرَ الزَّعْفَرَانِيُّ فِي الْاَضَاحِيْ: اَلْجَذَعُ اِبْنُ ثَمَانِيَةِ اَشْهُرٍ اَوْ تِسْعَةِ اَشْهُرٍ (بدائع الصَّنَائِع، ج ۵، ص ۷۰) زعفرانی نے کتاب الاضاحی میں ذکر کیا ہے کہ جذعہ آٹھ مہینے یا نو مہینے کے بچے کو کہتے ہیں۔

یعنی سال کے لگ بھگ کے بچے کو جذعہ کہتے ہیں۔

دوسری حدیث میں 'عتوذ' کی قربانی کا ذکر ہے۔ اب دیکھیے کہ 'عتوذ' کسے کہتے ہیں۔

۱- امام نوویؒ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

قَالَ اَهلُ اللُّغَةِ: اَلعَتُودُ مِنْ اَوْلَادِ الْمَعْزِ خَاصَّةً وَّهُوَ مَا رَعٰی وَ قَوِیَ. قَالَ الْجَوْهَرِیُ وَ غَیْرُهٗ هُوَ مَا بَلَغَ سَنَةً[۱] اہل لغت کہتے ہیں کہ عتود اس بکرے یا بکری کو کہتے ہیں جو چر کر خوب قوی اور موٹا ہو چکا ہو اور جوہری اور دوسروں نے کہا ہے کہ عتود وہ ہے جس کی عمر ایک سال ہو۔

۲- علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

هُوَ مِنْ اَوْلَادِ الْمَعْزِ مَارَعٰی وَ قَوِیَ وَ اَتٰی عَلَیْهِ الْحَوْلُ[۲] عتود اس بکرے، بکری کو کہتے ہیں جو خوب موٹا تازہ ہو اور ایک سال کا ہو۔

پس ان حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ فقہا اور اہلِ لغت کے نزدیک جذعہ ایک سال کے لگ بھگ بھیڑ یا دنبے کو کہتے ہیں اور عتود یا جدی ایک سال کے لگ بھگ بکرے یا بکری کو کہتے ہیں اور احادیثِ بالا سے ان دونوں کی قربانی کا جواز ثابت ہوا۔ اب اس بارے میں فقہاے احناف کی آرا ملاحظہ کیجیے:

۱- بکرے بکری کے لیے ایک سال کا ہونا ضروری ہے۔ بھیڑ اور دنبہ اگر اتنا فربہ ہو کہ دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو وہ بھی جائز ہے۔[۳]

۲- مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

بکری ایک سال سے کم درست نہیں مگر بھیڑ اور دنبہ چھے مہینے کا اگر خوب فربہ ہو تو وہ بھی درست ہے۔[۴]

۳- مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قربانی کے لیے جانوروں کی عمریں معین ہیں۔ بکرا بکری ایک سال کا ہو اور گائے دو سال کی۔ چونکہ اکثر حالات میں جانوروں کی صحیح عمریں معلوم نہیں ہوتیں اس لیے اس کے دانتوں سے عمر معلوم کرنے اور اس پر عمل کرنے کا احتیاطاً حکم دیا گیا ہے۔

۱- شرح الکامل للنوی، ج۲، ص۱۵۵۔

۲- تحفة الاحوذی، ج۲، ص۳۵۵۔

۳- جواہر الفقہ

۴- فتاویٰ رشیدیہ، ص۵۵۲۔

مُسِنّہ کے معنی سال بھر والے اور دانتوں والے دونوں کے ہو سکتے ہیں لیکن سال بھر کا ہونا کسی بکرے کا، جس کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو یا مشتبہ ہو، بغیر دو دانتوں کے معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے عام حکم یہی دینا مناسب تھا اور وہی دیا گیا۔[۱]

۴۔ جذعة کے بارے میں خصوصاً محدثین نے بھی اتفاقاً لکھا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔ چنانچہ جامع الترمذی میں امام ترمذی نے لکھا ہے۔

وَالْعَمَلُ عَلٰى هٰذَا عِنْدَ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ وَغَيْرِهِمْ اَنَّ الْجَذَعَ مِنَ الضَّأْنِ يَجْزِئُ فِي الْاُضْحِيَّةِ رسول کریمؐ کے صحابہؓ کا عمل اسی پر ہے کہ جذع کی قربانی جائز ہے۔

صاحب تحفة الاحوذی لکھتے ہیں:

وَ ذَهَبَ الْجَمْهُوْرُ اِلَى الْجَوَازِ وَ هُوَ الْحَقُّ، يَدُلُّ عَلَيْهِ اَحَادِيْثُ الْبَابِ[۲] جمہور علما اس طرف گئے ہیں کہ جذعہ کی قربانی جائز ہے اور یہی حق ہے جس پر اس باب کی احادیث بھی دلالت کرتی ہیں۔

آپ نے جو حدیث لکھ کر بھیجی ہے اس کے بارے میں شارحِ مسلم علامہ نوویؒ نے لکھا ہے:

قَالَ الْجَمْهُوْرُ هٰذَا الْحَدِيْثُ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْاِسْتِحْبَابِ وَالْاَفْضَلِيَّةِ[۳] جمہور علما نے اس حدیث کو استحباب اور افضلیت پر محمول کیا ہے۔

یعنی مستحب اور بہتر یہ ہے کہ مسنہ کی قربانی کی جائے اور اگر کسی وجہ سے یہ مہیا نہ ہو تو جذع کی قربانی کی جائے۔ آگے چل کر امام نوویؒ اسی حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وَ لَيْسَ فِيْهِ تَصْرِيْحٌ بِمَنْعِ جَذَعَةِ الضَّأْنِ وَ اَنَّهَا لَاتَجْزِئُ[۴] اور اس حدیث میں ایسی کوئی صراحت نہیں کہ سال بھر کا بھیڑ دنبہ قربانی میں منع ہے یا جائز نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۱ء)

۱- کفایت المفتی، جلد ۸، کتاب الاضحیة۔

۲- تحفة الاحوذی، ج ۲، ص ۳۵۶۔

۳- شرح الكامل للنووی علی صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۵۵۔

۴- ایضاً۔

اجتماعی قربانی میں نیت کا مسئلہ

سوال: بعض احباب اجتماعی قربانی کا اہتمام کرتے ہیں جو کہ کئی حوالوں سے مفید ہے۔ اگر بڑی تعداد میں قربانی کرنا ہو تو کیا سب لوگوں کے لیے جانور کا الگ الگ تعین کرنا اور ہر قربانی پر نام لینا ضروری ہے؟ بسا اوقات مختلف حصے داروں کے لیے مختص جانوروں کی نشان دہی کرنا مشکل امر ہوتا ہے۔ نیز کیا ہر جانور پر تکبیر پڑھنا لازم ہے؟

جواب: اجتماعی قربانی کے سلسلے میں اتنا تعین تو ضروری ہے کہ قربانیوں کی تعداد یہ ہے، مثلاً: پانچ سو کی تعداد میں، فلاں فلاں آدمی کی طرف سے ہیں۔ البتہ قربانی کرتے وقت ہر قربانی پر کسی کا نام لینا ضروری نہیں ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ پانچ سو آدمیوں کے لیے قربانی کے جانور یا اس میں حصہ متعین ہو لیکن اگر ہر ایک کے لیے الگ الگ تعین ممکن نہ ہو بلکہ اتنی بات طے ہو کہ اتنی تعداد میں قربانیاں اتنے اور فلاں آدمیوں کی طرف سے ہیں تو بھی قربانی ہو جائے گی۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: رَجُلٌ ضَحّٰی عَنْ نَفْسِهٖ وَ عَنْ اَرْبَعَةٍ مِّنْ عِيَالِهٖ خَمْسَ شِيَاهٍ وَ لَمْ يُعَيِّنْ كُلَّ وَاحِدٍ عَنْ صَاحِبِهَا عَنْ اَبِیْ يُوْسُفَ اَنَّهٗ يَجُوْزُ اِسْتِحْسَاناً[۱] ایک آدمی نے اپنی طرف سے اور اپنے اہل وعیال میں سے چار کی طرف سے قربانی دی۔ کل پانچ بکرے قربان کیے لیکن تعین نہ کیا کہ کونسا بکرا کس کی طرف سے ہے تو امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قربانی ہو جائے گی۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: اِشْتَرٰی سَبْعَةُ نَفَرٍ سَبْعَ شِيَاهٍ بَيْنَهُمْ وَ لَمْ يُسَمِّ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ شَاةً بِعَيْنِهَا فَضَحَّوْهَا كَذٰلِكَ فَالْقِيَاسُ اَنْ لَّا يَجُوْزَ وَ فِی الْاِسْتِحْسَانِ يَجُوْزُ سات آدمیوں نے مشترکہ طور پر سات بکریاں خرید لیں اور ہر ایک کے لیے بکری متعین نہ کی اور ان ساتوں کو قربان کر دیا تو قیاس تقاضا کرتا ہے کہ جائز نہ ہو لیکن استحسان کا

۱۔ فتاویٰ عالم گیری، ج ۳، ص ۳۵۱۔

تقاضا یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ امداد الفتاویٰ میں اسی طرح کی ایک صورت کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں قربانی درست ہو جائے گی۔ باقی بہتر یہ ہے کہ ہر جانور پر ایک شخص کا نام لگا دیا جائے کہ وہ فلاں کی طرف سے ہے اور وہ فلاں کی طرف سے ہے، اور وہ فلاں کی طرف سے۔

پس واضح ہو گیا کہ پہلے سے ہر ایک کے نام جانور کا تعین اچھی بات ہے لیکن لازمی نہیں۔ البتہ اتنا تعین ضروری ہے کہ اتنی قربانیاں فلاں فلاں آدمیوں کی طرف سے ہیں جن کی تفصیل قربانی کرنے والے یا اس شخص کے پاس ہو جس نے کسی کو قربانی کے لیے وکیل بنایا ہو۔ خیال رہے کہ تکبیر ہر جانور پر لازمی ہے، تاہم اگر بھول جائے تو ذبح صحیح ہو گا۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۹ء)

قربانی کی کھالیں اور خدمتِ خلق

سوال: ہم نے ایک ویلفیئر سوسائٹی قائم کی ہے جس کے تحت ہم خدمتِ خلق کے مختلف کام کر رہے ہیں، مثلاً فری آئی کیمپ، جہادِ کشمیر کے لیے پروگرام، معذور طالب علموں کے لیے سائیکل کا انتظام، سیلاب کے موقع پر مدد، نادار افراد [خصوصاً طلبہ] کا علاج معالجہ، فیس اور کتابوں کا انتظام، اسلامی کتابوں کی لائبریری وغیرہ۔ ہم اپنے ویلفیئر فنڈ کے لیے قربانی کی کھالیں بھی جمع کرتے ہیں لیکن بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ویلفیئر کے لیے قربانی کی کھالوں کی رقم جائز نہیں ہے۔

جواب: آپ کا ویلفیئر سوسائٹی قائم کرنا قابلِ قدر و قابلِ تقلید ہے۔ اللہ کرے کہ آپ زیادہ سے زیادہ خدمتِ خلق کا کام کرسکیں۔ زکوٰۃ کی رقوم ایسے کاموں میں لگانی چاہییں جو قرآنِ پاک میں منصوص ہیں اور جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ باقی کام نفلی صدقات اور عطیات سے چلائے جائیں۔

مسلمان فقرا اور مساکین زکوٰۃ کا مصرف ہیں۔ آئی کیمپ ہو یا کشمیری مجاہدین اور مہاجرین، سب میں فقیری اور احتیاج کو ملحوظ رکھ کر انھیں زکوٰۃ دی جائے۔ کشمیری مجاہدین اور مہاجرین تو ظاہر ہے کہ فقیر اور محتاج بھی ہیں اور جہاد بھی کر رہے ہیں لہٰذا ان پر خرچ کرنا دوہرے اجر کا موجب ہوگا۔ اسی طرح غریب طلبہ کو کتابیں لے کر دینا، فیسوں کی ادائیگی میں تعاون کرنا، سائیکل لے کر دینا سب جائز ہے۔ نقد رقم بھی دی جاسکتی ہے۔ قربانی کی کھالیں اور ان کی رقوم بھی آپ زکوٰۃ کی مدات میں خرچ کرسکتے ہیں۔ زکوٰۃ کی رقوم کا آپ حساب کتاب الگ رکھیں اور باقی صدقات اور عطیات کا الگ۔ مذکورہ ضابطے کے مطابق زکوٰۃ اور چرم ہائے قربانی کی رقوم خرچ کرنے پر علما کا اتفاق ہے۔

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۹۶ء)

قربانی کا گوشت

سوال: قربانی کا گوشت کتنے دن تک رکھ کر کھانا جائز ہے؟ مثلاً ایک شخص نے گائے کی قربانی کی، جس میں سے تقریباً تین من گوشت حاصل ہوا۔ اس شخص نے ایک من گوشت غربا میں، ایک من عزیز واقارب میں اور ایک من گوشت فریج میں رکھ کر ایک ماہ تک کھایا۔ کیا ایسا کرنا شرعی نقطۂ نگاہ سے ٹھیک ہے؟

جواب: پہلے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ نہیں رکھا جاسکتا تھا، بعد میں اس کی اجازت مل گئی۔ اب جائز ہے کہ جتنے دن ذخیرہ کرسکتا ہو اتنے دن اسے ذخیرہ کرے۔ ہدایہ میں ہے: وَيُطْعِمُ الْاَغْنِيَآءَ وَالْفُقَرَآءَ وَ يَدَّخِرُ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ اَكْلِ لُحُوْمِ الْاَضَاحِیْ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ ادَّخِرُوْا[1] اغنیا اور فقرا کو کھلائے اور ذخیرہ کرے، یہ جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے کہ میں تمھیں قربانی کا گوشت (تین دن کے بعد) کھانے سے روکتا تھا اب کھاسکتے ہو اور ذخیرہ بھی کرسکتے ہو۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہدایہ میں تصریح ہے کہ کم از کم ایک تہائی حصہ کا صدقہ کردینا مستحب ہے۔ لہٰذا اس قدر تو صدقہ کردے اور ایک تہائی احباب کو کھلانا چاہے تو فبہا ورنہ اس کو بھی خود کھاسکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص حد نہیں ہے کہ کتنے دن تک ذخیرہ کرسکتا ہے۔ آج کل اس کے وسائل زیادہ ہوگئے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص گوشت کا کچھ حصہ ایک ماہ تک رکھ سکتا ہو تو اس کی بھی اجازت ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ ایسا انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے بخل کا شبہہ پیدا ہو اور انسان کی شخصیت پر اس کا اثر پڑتا ہو۔ اعتدال کے ساتھ اور عرف کے دائرے میں ایسا کیا جائے۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۹۲ء)

۱- ہدایہ، کتاب الاضحیۃ، ج ۴، ص ۴۴۸۔

قربانی کا وجوب

سوال: ایک غریب شخص، جس پر قربانی واجب نہیں، قربانی کے لیے جانور خریدتا ہے، قربانی سے قبل وہ جانور گم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ شخص بڑی مشکل سے دوسرا جانور خریدتا ہے۔ قربانی سے قبل پہلا جانور بھی مل جاتا ہے۔ کیا وہ شخص ایک جانور کی قربانی دے یا دونوں جانوروں کی۔

اسی طرح ایک امیر شخص کے ساتھ بھی یہ کچھ ہوتا ہے، وہ جانور خریدتا ہے، گم ہو جاتا ہے پھر اور خریدتا ہے، اس وقت پہلا جانور بھی مل جاتا ہے۔ کیا اس امیر شخص پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی یا دونوں کی؟

جواب: غریب آدمی پر قربانی، جانور خریدنے کے بعد واجب ہو جاتی ہے اور جس جانور کو خریدا گیا تھا اسی کی قربانی لازم ہوتی ہے۔ اگر اس کا جانور گم ہو گیا اور اس نے دوسرا خرید لیا تو دونوں کی قربانی کرے گا، لیکن صاحب نصاب آدمی پر قربانی واجب ہے اور جانور خریدنے سے، خریدے ہوئے جانور کی قربانی اس پر واجب نہیں ہو جاتی، اس لیے اگر وہ جانور گم ہو جاتا ہے تو اس پر قربانی کرنا واجب رہتا ہے۔ لیکن غریب آدمی کا جانور گم ہو جائے تو اس پر دوسرا جانور خریدنا واجب نہیں ہوتا۔ اگر دوسرا جانور خریدا تو اس کی قربانی بھی اس پر واجب ہوگئی۔ اس لیے اگر امیر آدمی کا جانور واپس مل جائے تو اس پر دونوں کی قربانی واجب نہیں ہوتی۔ غریب نے اپنی مرضی سے اپنے اوپر بوجھ ڈالا ہے نہ کہ شریعت نے۔ اس کو کسی نے نہیں کہا کہ جانور خریدے اور خریدا ہوا جانور اگر گم ہو گیا تھا تو اس کو کسی نے نہیں کہا کہ اب وہ دوسرا جانور خریدے۔ اس کے برعکس امیر پر تو شرع نے ایک قربانی واجب کی ہے۔ اگر اس نے دس جانور خریدے اور وہ گم ہو گئے تو پھر بھی اس پر جانور خرید کر قربانی کرنا واجب ہوگا۔ بشرطیکہ وہ پھر بھی صاحب نصاب ہو۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۹۲ء)

عورت کا قربانی کرنا

سوال: عیدالاضحیٰ کے موقع پر اگر عورت اپنی طرف سے قربانی کرنا چاہے تو کیا حکم ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ میں خود کماتی تو نہیں۔ بس دل بہت چاہتا ہے کہ اپنی طرف سے قربانی کروں۔ خاوند علیحدہ کرتے ہیں، کیا وہ اپنی رقم سے بکرا خرید کر میری طرف سے قربانی کر سکتے ہیں؟ دوسرا یہ کہ اگر عورت خود کماتی ہو تو پھر وہ اپنی طرف سے قربانی کر سکتی ہے؟

جواب: شوہر اپنی رقم سے آپ کی طرف سے قربانی دے سکتے ہیں۔ آپ کو قربانی کا ثواب مل جائے گا۔ لیکن اگر ان پر قربانی واجب ہو تو اپنی قربانی پہلے دیں اس کے بعد مزید گنجایش ہو تو آپ کی طرف سے قربانی دیں۔ عورت اگر خود صاحبِ نصاب ہو تو اس پر بھی قربانی دینا واجب ہوتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۸۶ء)

☆......☆......☆

باب ششم

زکوٰۃ

زکوٰۃ کے بعض مسائل

سوال: میں خود غریب آدمی ہوں۔ میرے تین بچے ہیں جو بالغ ہیں۔ میری والدہ نے مجھے دس تولے سونا دیا تھا۔ جو میں نے اپنے تینوں بچوں کی شادی کے سلسلے میں اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ دونوں لڑکوں کو تین تین تولہ اور چھوٹی بیٹی کو چار تولے دے دیا ہے۔ دونوں لڑکے کام وغیرہ کرتے ہیں۔ چھوٹی بیٹی میرے ساتھ ہے۔ اب ان پر سال پورا ہو جائے تو زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے گی؟ اس سونے کے ساتھ چاندی وغیرہ نہیں ہے۔ اگر سال کے بعد میرے بچوں کے پاس ضروریاتِ زندگی کا خرچ نکال کر کچھ پیسے بچ جائیں تو زکوٰۃ ہر ایک کو علیحدہ دینی پڑے گی یا دس تولے سونے کی، جو تینوں بچوں کو الگ الگ کر کے دے دیا گیا ہے اور ان کی شادی کے لیے رکھا گیا ہے، ایک ساتھ زکوٰۃ نکالنی پڑے گی؟

قرض کی ایسی رقم جو کسی کو دی گئی اور واپسی کا معلوم نہیں ہے کہ کب دیں گے اس رقم کی زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے گی؟

بچوں کی شادی کے سلسلے میں اگر کچھ رقم جمع کی جائے تو کیا ایسی جمع شدہ رقم پر بھی سال پورا ہونے پر زکوٰۃ نکالی جائے گی؟

مکان بنانے یا کاروبار کرنے کے سلسلے میں یا مکان کو لیز کرانے کے سلسلے میں جو رقم جمع کی جائے تو کیا سال پورا ہونے پر اس پر بھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی؟

جواب: زکوٰۃ اس آدمی پر آتی ہے جس کے پاس نقد سونا، چاندی اور دیگر سامان جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، سارا مل ملا کر مقدارِ نصاب کو پہنچ جائے۔ اگر آپ کے بچوں کے پاس سونے کی مذکورہ مقدار کے علاوہ کوئی اور نقد روپیہ، ان کی اصل ضروریات (جن میں سامانِ خورد و نوش، گھریلو ساز و سامان، شادی کے لیے خریدا جانے والا ساز و سامان، لباس وغیرہ سب شامل ہیں) سے زائد، اتنی مقدار میں ہو کہ سونے کی قیمت اور نقد روپیہ دونوں مل کر مقدارِ نصاب کو پہنچ جائے تو پھر

ان پر زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہیں۔ اسی طرح آپ پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔

شادی کے سامان کے لیے جو رقم اکٹھی کی ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ زکوٰۃ اسی مال پر عائد ہوتی ہے جو بنیادی ضروریات، خوراک، لباس، مکان، گھریلو ساز و سامان وغیرہ سے زائد ہو۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر آپ اپنے بارے میں فیصلہ کرلیں کہ آپ پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے یا نہیں۔ اسی طرح بیٹوں کے بارے میں اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرلیں۔ اگر انسان کے پاس رہایش کے لیے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کا مکان ہو اور اس کی گزرِ اوقات بھی بہ آسانی ہو رہی ہو، کوئی تنگی نہ ہو تو پھر مکان بنانے کے لیے جو رقم جمع کی ہو اور جو سال بھر محفوظ پڑی رہی ہو، اس پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کر دینا بہتر ہے۔ کاروبار کے لیے جمع رقم پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۸ء)

مصارفِ زکوٰۃ

سوال: ایک اسلامی مزدور تنظیم نے اس سال ۷ تا ۱۹؍اپریل ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار رکھا تھا۔ اس کا موضوع تھا 'مزدور تحریک کا اسلامی ماڈل' اس سیمینار میں ۴، ۵ اسلامی مالک کے ان افراد نے شرکت کی تھی جو اپنے اپنے ممالک میں مزدور فیلڈ میں اسلام کے حوالے سے کام کر رہے ہیں۔ مقصد اس سیمینار کا یہ تھا کہ بین الاقوامی سطح پر امریکی، روسی اور چینی نظریات کی حامل مزدور تنظیموں کے مقابلے پر (جنھوں نے مسلمان ممالک کی مزدور تنظیموں کو بھی اپنا شکار بنایا ہوا ہے) اسلام کی علمبردار تنظیم قائم کرلی جائے۔ الحمدللہ! اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا اور نہایت حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے، اس سیمینار میں ایک ایسے رفیق نے بھی شرکت کی جو آمد و رفت کے اخراجات کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ کیا ہم زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کا کرایہ دے سکتے ہیں؟

جواب: سورۂ توبہ میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ان میں سے ایک مصرف 'فی سبیل اللہ' ہے۔فی سبیل اللہ سے مراد اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کے تمام مراحل ہیں۔غلبۂ دین کے لیے کام کرنے والوں کے جملہ مصارف زکوٰۃ سے ادا کیے جاسکتے ہیں۔ان مصارف میں سفرخرچ بھی شامل ہے۔مشہور عالم، مفسرِ قرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

'راہِ خدا' کا لفظ عام ہے۔تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو، اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے لیکن حق یہ ہے اور ائمۂ سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں 'فی سبیل اللہ' سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظامِ کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کو قائم کرنا ہو۔اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفرخرچ کے لیے، سواری کے لیے، آلات واسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جاسکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔[1]

ائمۂ اربعہ کا مسلک

❋ مالکیہ: اِنَّ الزَّکٰوۃَ یُعْطٰی مِنْهَا الْمُجَاهِدُ وَ الْمُرَابِطُ وَ مَا یَلْزَمُهُمَا مِنْ آلَةِ الْجِهَادِ بِاَنْ یَّشْتَرِیَ مِنْهَا سِلَاحٌ اَوْ خَیْلٌ لِیُنَازِلَ عَلَیْهَا۔ وَ یَاْخُذُ مِنَ الزَّکٰوۃِ وَلَوْ کَانَ غَنِیًّا[2] یعنی سرحدات کی حفاظت پر مامور مجاہد کو زکوٰۃ اس کی جملہ ضروریات کے لیے دی جائے گی اگرچہ وہ غنی ہو، جن میں اسلحہ اور سواریاں سب شامل ہیں۔

❋ شافعیہ: لِلْاِمَامِ الْخِیَارُ اِنْ شَآءَ دَفَعَ الْفَرَسَ اِلَی الْغَازِیْ تَمْلِیْکًا وَاِنْ شَآءَ اِسْتَأْجَرَ لَهٗ مَرْکُوْبًا وَّاِنْ شَآءَ اِشْتَرٰی خَیْلًا مِّنْ هٰذَا السَّهْمِ وَ وَقَفَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُعِیْرَهُمْ اِیَّاهَا وَقْتَ الْحَاجَةِ فَاِذَا انْقَضَتْ اِسْتَرَدَّ[3] امام کو اختیار ہے چاہے زکوٰۃ

۱- تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۰۸، التوبہ، حاشیہ ۶۷۔

۲- شرح الدردیر علی 'متن خلیل' بحوالہ فقہ الزکوٰۃ، یوسف القرضاوی، ج ۲، ص ۶۳۸۔

۳- الروضۃ للنووی، ج ۲، ص ۳۲۶-۳۲۷۔

کے مال سے مجاہدین کو گھوڑے خرید کر انھیں مالکانہ طور پر دے دے، چاہے کرایہ پر لے کر دے دے، چاہے اس سے سواریاں خرید کر بیت المال میں وقف کر دے کہ بوقتِ ضرورت مجاہدین کو دیا کرے اور ضرورت باقی نہ رہنے پر واپس لے لیا کرے۔

شوافع بھی فقیر اور غنی دونوں کے لیے جہادی ضروریات کو زکوٰۃ کی مد سے پورا کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

٭ حنابلہ: وَمَذْهَبُ الْحَنَابِلَةِ كَمَذْهَبِ الشَّافِعِيَّةِ[1] حنبلی فقہا کا مسلک شوافع کی طرح ہے۔

٭ **احناف**: وَحِيلَةُ التَّكْفِينِ بِهَا التَّصَدُّقُ عَلٰى فَقِيرٍ ثُمَّ هُوَ يَكْفِنُ فَيَكُونُ الثَّوَابُ لَهُمَا[2] میت کے کفن میں زکوٰۃ دینے کی تدبیر یہ ہے کہ کسی فقیر کو کفن کی رقم صدقہ کی جائے پھر وہ اپنی طرف سے کفن میں لگا دے اس سے دونوں کو ثواب ملے گا۔

اس اصول کے تحت جہاد فی سبیل اللہ کی مد میں زکوٰۃ کی رقم فقیر کو یہ کہہ کر دے دی جائے کہ وہ اپنی طرف سے مجاہد کو دے دے۔ اس سے صاحبِ مال اور فقیر دونوں کو ثواب ملے گا اور زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ حنفی مذہب کے مطابق آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ اپنی اسلامی مزدور تنظیم کے غریب کارکن کو زکوٰۃ کی رقم دے دیں کہ وہ اپنی طرف سے کرایہ کے لیے فلاں صاحب کو دے دے۔ خلاصہ یہ کہ تمام فقہا کے نزدیک دینی خدمت سرانجام دینے والے کارکن کا کرایہ زکوٰۃ کی رقم سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۳ء)

۱- فقہ الزکوٰۃ، یوسف القرضاوی، ج ۲، ص ۶۴۱۔

۲- درمختار، ج ۲، ص ۱۳۔

زکوٰۃ اور تاوان کی ادائیگی

سوال: فریقین میں مصالحت کرانے کے لیے جو تاوان دیا گیا ہو، کیا اس کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے کی جا سکتی ہے؟ براہ کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

جواب: فریقین میں مصالحت کے لیے جو لوگ اپنے ذمے تاوان کی ادائیگی لے لیں وہ مستحقِ اعانت ہوتے ہیں اور وہ زکوٰۃ کی رقم وصول کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ قرآن میں جو مصارفِ زکوٰۃ بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک 'الغارمین' بھی آیا ہے اور حدیث میں بھی ہے: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ [لِغَنِيٍّ] اِلَّا لِخَمْسَةٍ لِغَازٍ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَوْ لِعَامِلٍ عَلَیْهِ اَوْ لِغَارِمٍ (ابن ماجہ، موطا) [مال دار کے لیے زکوٰۃ جائز نہیں ہے سوائے پانچ کے، مجاہد فی سبیل اللہ، عاملِ زکوٰۃ یا قرض دار] قبیصہ بن مخارق ہلالی کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے فریقین میں مصالحت کے لیے اپنے ذمے رقم لی ہے اور آپؐ سے اس میں اعانت کی درخواست کرتا ہوں تو آپؐ نے فرمایا: زکوٰۃ کی رقم آنے تک انتظار کرو (احمد، مسلم، نسائی، ابوداؤد) تاوان کو ادا کرنے کی وجہ سے آدمی صاحبِ نصاب نہ رہے تو وہ مستحقِ زکوٰۃ ہو جاتا ہے اگر وہ زکوٰۃ لے لیں تو جائز ہے۔ اور اگر پہلے سے غریب ہو خود تاوان نہ دے سکتا ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ کی رقم لے کر تاوان ادا کر سکتا ہے۔ اگر تاوان اپنے ذمے لینے والا مالدار ہو مستحقِ زکوٰۃ نہ ہو لیکن فریقین مستحقِ زکوٰۃ ہوں تب بھی زکوٰۃ کی رقم تاوان میں دی جا سکتی ہے اس لیے کہ زکوٰۃ کی رقم مستحقین کو دی گئی اس لیے صورتِ مسئولہ کے سلسلے میں زکوٰۃ دینا بلا شک وشبہہ جائز ہے اور قرآن وحدیث کی نصوص سے ثابت ہے۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۳ء)

چند مسائلِ زکوٰۃ

سوال: (الف) زید اور بکر حقیقی بھائی ہیں۔ زید عیال دار اور بظاہر خوش حال ہے۔ اس نے بکر سے خاصی رقم قرض لے کر کاروبار میں لگائی ہے۔ لیکن اس کے بقول صرف اتنی کمائی ہو رہی ہے کہ جس سے بمشکل گزارا ہوتا ہے اور سال پر سال گزر رہے ہیں کہ وہ قرض کی رقم لوٹا نہیں سکا۔ دوسری طرف بکر پر اسی رقم کی زکوٰۃ فرض ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بکر، زکوٰۃ کی ساری رقم بجائے دیگر مستحقین کے صرف زید کو ہی ادا کر سکتا ہے۔

(ب) بکر کی نیت یہ ہے کہ زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے اور زید کے قرض کی ادائیگی بھی۔ یعنی زید وہی زکوٰۃ کی رقم عملاً وصول نہ کرے بلکہ محض کاغذی طور پر بکر اپنے قرض کی وصولی شمار کرے، کیا یہ جائز ہے یا عملاً رقم کی ادائیگی ضروری ہے؟

(ج) زکوٰۃ کی رقم کی یک مشت ادائیگی ضروری ہے یا اس رقم کو سال کے دوران مختلف خیراتی مدوں میں ادا کیا جا سکتا ہے؟

(د) ایک صاحب، زکوٰۃ کی رقم میں سے تحریکِ اسلامی کی اعانت فرماتے ہیں۔ کیا عام اعانت کی مد میں زکوٰۃ کی رقم کی ادائیگی جائز ہے یا تحریک اسلامی کے پاس زکوٰۃ کی رقم متعلقہ مد میں ہی جمع کرنا چاہیے؟

جواب: (الف) اگر آپ کے بھائی قرض واپس کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور آپ انھیں قرض کی رقم معاف فرما سکتے ہیں تو معاف فرما دیں تاکہ آپ کے ذمے زکوٰۃ واجب نہ ہو اور اگر قرض کی رقم معاف نہیں کر سکتے اور وہ اس قدر رقم کا مالک بھی نہیں ہے جو بنیادی ضروریات زندگی اور قرض سے فاضل ہو اور مقدارِ نصاب کو پہنچی ہوئی ہو تو آپ انھیں زکوٰۃ دے کر قرض میں واپس لے لیں اس سلسلے میں انھیں تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہ رقم وصول کر لیں اور اس سے اپنا قرض ادا کر دیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قرض کی یہ رقم جب آپ کو واپس ملے اس وقت اسے وصول کرلیں اور اس میں سے اتنا حصہ جو زکوٰۃ کی مد میں بنتا ہو اپنے بھائی صاحب کو واپس کردیں اور دل میں نیت یہ رکھیں کہ زکوٰۃ کی رقم اپنے بھائی کو دے رہے ہیں۔ اگر ساری رقم زکوٰۃ کی مد میں ختم ہو جاتی ہو تو ساری رقم واپس کردیں۔

یہ بھی جائز ہے کہ مقدارِ زکوٰۃ کے برابر رقم آپ قرض کی وصولی میں ڈال کر اس کی اطلاع بھائی صاحب کو دے دیں کہ میں نے آپ کے ذمے واجب الادا قرض میں اس قدر کمی کردی ہے۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ آپ پہلی دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کریں تاکہ بالاتفاق آپ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے۔

(ب) اپنے بھائی کو زکوٰۃ دینا دوہرے ثواب کا موجب ہے۔ ایک زکوٰۃ کی ادائیگی کا ثواب اور دوسرا صلہ رحمی کا ثواب۔ اس لیے دوسروں کو زکوٰۃ دینے کی نسبت انھیں دے دینا افضل ہے۔

(ج) زکوٰۃ کی ادائیگی یک مشت ضروری نہیں ہے۔ آپ زکوٰۃ کی رقم دوسرے مال سے الگ کرکے رکھ دیں اور سال بھر زکوٰۃ کے مختلف مصارف میں دیتے رہیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

(د) زکوٰۃ کی ادائیگی اس طرح بھی ہو جائے گی کہ اسلامی تحریک کی اعانت کی جائے اور اس طرح سے بھی کہ اسے تحریکِ اسلامی کے پاس 'مدِ زکوٰۃ' میں جمع کرادی جائے اور اس طرح سے بھی کہ خود مستحقینِ زکوٰۃ کو دے دی جائے۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۸۴ء)

طویل عرصے کی زکوٰۃ کا تعیّن

سوال: ۱۹۴۰ء میں ایک صاحب نے ۵۰ تولہ سونا خرید کر محفوظ کر لیا۔ جب کہ اس وقت اس کی قیمت ۲۰ روپیہ فی تولہ تھی، ۱۹۹۱ء میں اس سونے کی زکوٰۃ ادا کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا ہے جب کہ سونا اس وقت قریباً ۳۵۰۰ روپے فی تولہ ہے۔ اب ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک ۵۰ سال کی مدت کے لئے مذکورہ سونے کی قیمت کا اوسط نکالنے کا کیا طریقہ ہے؟ نیز طویل عرصے کی زکوٰۃ کے تعین کا طریقہ بھی وضاحت کے ساتھ بتایئے۔

جواب: زکوٰۃ ادا کرتے وقت گزشتہ سالوں کی قیمت نہیں لگائی جائے گی کہ اوسط نکالنے کی ضرورت پڑے، بلکہ جب آپ زکوٰۃ ادا کر رہے ہیں تو اس وقت کی قیمت لگائی جائے گی مثلاً آپ نے ۱۹۴۰ء میں ۵۰ تولے سونا ذخیرہ کیا اور اب تک اس کی زکوٰۃ نہیں ادا کی اور اب ادا کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ ریٹ ۳۵۰۰ روپے فی تولہ کے حساب سے ۵۰ تولے سونے پر جو زکوٰۃ آتی ہے۔ یعنی اڑھائی فیصد، یا ۴۰ واں حصہ، وہ آپ ادا کر دیجیے۔ ۵۰ تولے سونے کا وہ حصہ جو زکوٰۃ میں نکل جائے اس کے علاوہ باقی آپ کی ملکیت ہے۔ اس پر زکوٰۃ دینا پڑے گی یہاں تک کہ ساڑھے سات تولے سونے سے کم ہو جائے تو پھر زکوٰۃ نہیں۔ اگر روپیہ اور نوٹ کی شکل میں زکوٰۃ دیں گے تو ہر سال پچاس تولے سونے کی زکوٰۃ دینا ہوگی۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۲ء)

زکوٰۃ سے آئی کیمپ کا انعقاد

سوال: لوگ اپنے صدقات وزکوٰۃ رفاہی کاموں مثلاً ہسپتالوں میں مریضوں کے علاج معالجہ یا آئی کیمپوں میں آنکھوں کے مریضوں کے آپریشن وغیرہ پر خرچ کرتے ہیں۔ بعض ہسپتالوں کی انتظامیہ یہ احتیاط کرتی ہے کہ مریضوں کو بتا دیتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، اگر آپ حق دار ہیں تو فائدہ اٹھائیں، ورنہ نہیں۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟ بعض ہسپتالوں یا آئی کیمپوں کے ذمہ داران یہ احتیاط نہیں کرتے اور غیر مستحق مریض بھی اس رقم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیا اس طرح فائدہ اٹھانا جائز ہے؟

آنکھوں کے آپریشن کیمپ خاص آئی سیزن میں لگتے ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں میں بھی مریض اسی سیزن میں زیادہ آتے ہیں لیکن بعض ہسپتالوں کے ڈاکٹر فری آئی کیمپوں میں ڈیوٹی لگوا لیتے ہیں یا لگا دی جاتی ہے۔ اس طرح ان ہسپتالوں کے مریض متاثر ہوتے ہیں جن کی خدمت کے عوض وہ تنخواہ لیتے ہیں۔ کیا اس طرح ڈیوٹی جائز ہے؟

بعض لوگ اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچانے کے لیے زکوٰۃ وصدقات کی رقم یا ناجائز کمائی مریضوں کے علاج یا آئی کیمپوں وغیرہ کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ کیا ناجائز کمائی کے ان کاموں میں خرچ کرنے پر ان بزرگوں کو یا خرچ کرنے والوں کو ثواب ملے گا؟

جواب: زکوٰۃ کا مصرف صرف فقرا ہیں۔ ہسپتالوں کی انتظامیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کا کھاتہ الگ رکھیں اور زکوٰۃ کی رقوم سے صرف فقرا اور مساکین کا علاج کریں۔ انھیں چاہیے کہ اس کے لیے مستحقین سے درخواستیں لیں۔ مستحقین معلوم کرنے کے لیے تحقیق کریں اور صرف ان لوگوں کا علاج زکوٰۃ سے کریں جو تحقیق کے نتیجے میں مستحق ثابت ہوں۔ محض اتنی بات کافی نہیں ہے کہ مریضوں کو بتلا دیا جائے کہ جس رقم سے علاج کیا جارہا ہے یہ زکوٰۃ کی ہے۔

زکوٰۃ کی رقم کو بلا تحقیق صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ انتظامیہ ایسا کرے گی تو عند اللہ

عندالناس جواب دہ ہوگی۔ مریض، انتظامیہ، ڈاکٹر ہر ایک کو اپنے اپنے دائرے میں جائز و ناجائز، مستحق و غیر مستحق کا خیال رکھنا چاہیے لیکن اصل ذمہ داری انتظامیہ کی ہے۔

آئی کیمپ میں جو ڈاکٹر اپنی ڈیوٹی لگواتے ہیں، اگر ہسپتال کی انتظامیہ ان کی ڈیوٹی لگاتی ہے اور انھیں اجرت دیتی ہے تو مریضوں کا متبادل انتظام کرنا، ہسپتال کی ذمہ داری ہے۔ ڈاکٹر ہسپتال سے جو تنخواہ لیتے ہیں وہ ان کے لیے جائز ہے، جب کہ وہ ہسپتال انتظامیہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرتے ہوں اور ان کی اجازت سے 'آئی کیمپ' وغیرہ مہمات میں شرکت کرتے ہوں۔

زکوٰۃ و صدقات کی رقم کو ان کے مصارف میں صرف کرنا موجبِ ثواب ہے۔ جو شخص اپنے والدین کو ایصالِ ثواب کے لیے رقم لگاتا ہے اسے اپنے پاس سے زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات میں سے صرف کرنا چاہیے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی تو فرض ہے اسے تو بہر حال صرف کرنا ہے، اس کا ایصالِ ثواب سے تعلق نہیں ہے۔

ناجائز مال سے صدقہ کرنے کا ثواب نہیں ملتا۔ البتہ اپنے استعمال میں لانے کی بجائے، مستحق فقرا اور مساکین کی حاجات میں صرف کرنے کے نتیجے میں آدمی گناہ سے بچ جائے گا، صدقے کا ثواب نہیں ملے گا۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، اپریل ۲۰۰۰ء)

زکوٰۃ کی رقم سے سرمایہ کاری

سوال: کیا کسی فرد یا ادارے کو لوگوں سے زکوٰۃ، خیرات اور صدقات لے کر سرمایہ بنانے کی اجازت ہے کہ وہ سرمایہ سودی کاروبار پر لگا کر مزید سرمایہ جمع کرے؟

جواب: زکوٰۃ کا مال کسی فرد کو دیا گیا ہو تو وہ اسے کاروبار میں لگا کر بڑھا سکتا ہے تاکہ زکوٰۃ لینے کی بجائے دینے والا بنے اور کسی ادارے کو دیا گیا ہے تو وہ اسے مصارفِ زکوٰۃ میں خرچ کرے گا۔ یہ بھی کر سکتا ہے کہ وہ اسے کاروبار میں لگا دے اور منافع زکوٰۃ کے مصارف میں خرچ کرے اور اصل کو محفوظ رکھے۔ البتہ سودی کاروبار میں لگانا ناجائز ہے۔ اسی طرح اسے مصارفِ زکواۃ کے بجائے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا بھی ناجائز ہے۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۱ء)

بنک سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال: میں نے اپنی کچھ رقم بنک میں رکھی ہے کیوں کہ ہمارے ملک میں امن وامان کی صورت حال مایوس کن ہے۔ بنک سود بھی دیتا ہے اور زکوٰۃ بھی کاٹتا ہے۔ کیا اس طریقے سے زکوٰۃ دینے کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا مجھے اپنے ہاتھوں سے مزید رقم زکوٰۃ میں ادا کرنی چاہیے؟ بنک نے جو رقم کاٹی ہے، اسے کیا سمجھا جائے؟

جواب: بنک میں رکھی ہوئی رقم سے اگر حکومت زکوٰۃ کاٹ لے تو اتنی رقم کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے جتنی رقم کی زکوٰۃ کاٹی گئی ہو۔ مزید رقم جو گھر میں ہو، یا کاروبار میں لگی ہوئی ہو، اس کی زکوٰۃ اور سامانِ تجارت (اگر کوئی ہو) یا سونا چاندی زیور کی شکل میں یا کسی دوسری شکل میں یا اپنی اصل شکل میں ہو تو اس کی زکوٰۃ الگ سے نکالنا ہوگی۔ سود دینا اور لینا دوسرا مسئلہ ہے۔ اس کا زکوٰۃ

کی ادائیگی اور عدمِ ادائیگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس طرح ایک آدمی نماز پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ برے کام بھی کرتا ہے، رشوت لیتا ہے، سودی کاروبار کرتا ہے تو اس کی نماز ادا ہو جاتی ہے مگر رشوت اور سودی لین دین کا گناہ بھی ہوتا ہے۔ یہی حکم اس شخص کا ہے جس کی بنک میں رکھی ہوئی رقم سے زکوٰۃ کاٹی جاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ سود بھی لیتا ہے۔ یہی معاملہ حکومت کا ہے جو زکوٰۃ بھی وصول کرتی ہے اور سود بھی دیتی ہے۔ اس کا زکوٰۃ لینا صحیح ہوگا اور سود دینا ناجائز۔

موجودہ حکومتیں یہی تو کر رہی ہیں کہ انھوں نے اسلام اور غیر اسلام کا ملغوبہ تیار کیا ہوا ہے۔ زکوٰۃ وصول کر کے اپنے آپ کو اسلامی حکومت ظاہر کرتی ہیں اور سود لے کر اپنے آپ کو سیکولر ترقی یافتہ حکومتوں کی صف میں کھڑا کر دینے کا دعویٰ کر رہی ہیں، اور معاشی ترقی کی خوش خبریاں سنا رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ سودی کاروبار چھوڑ دیں تو دنیا کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ اسی تضاد کا نقصان یہ ہے کہ جو زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے وہ بھی بے برکت ہے اور اس پر ثواب بھی پورا نہیں ملتا اگرچہ فقہی لحاظ سے اس کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ نیکی کے ساتھ جب بدی شامل ہوتی ہے تو بعض اوقات دنیوی اور اخروی دونوں لحاظ سے نیکی بالکل معدوم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اس کے کافی حصے ختم ہو جاتے ہیں اور کچھ باقی رہ جاتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شراب پیتا ہے اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوتی (ترمذی، ابواب الاشربۃ) اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھ کر آتا ہے تو وہ نماز کا دسواں حصہ لے کر آتا ہے۔ دوسرا نواں حصہ، تیسرا آٹھواں حصہ، اور اسی طرح کوئی زیادہ کوئی کم، اور کوئی بالکل محروم لوٹتا ہے۔ (ابن حبان، ابوداؤد، نسائی)

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۹۸ء)

زکوٰۃ میں رشتہ داروں کا حق

سوال: میری ایک بہن اور ایک نند بہت ضرورت مند ہیں۔ وہ زکوٰۃ کی مستحق ہیں۔ چونکہ میرا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے اس لیے میں اعانت بھی دیتی ہوں اور اپنی محدود حیثیت کے مطابق کتابوں یا کیسٹوں کی شکل میں انفاق بھی کرتی ہوں۔ کبھی اللہ توفیق دے تو کوئی چھوٹا موٹا زیور کشمیر فنڈ میں یا کتابوں کی مد میں دے دیتی ہوں۔ میں نے یہ سنا ہے کہ رشتے داروں کو چھوڑ کر کہیں اور انفاق یا زکوٰۃ دینے سے وہ قبول نہیں ہوتی۔ میری محدود آمدنی ہے اور اس سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ انفاق فی سبیل اللہ بھی کروں اور رشتے داروں کو زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ دوں۔ اس لیے درج ذیل سوالات کی وضاحت فرما دیں:

۱۔ کیا ان دونوں مستحقین کی موجودگی میں میرا کسی اور مد میں انفاق درست نہیں ہے؟

۲۔ کسی ایک کی مدد کرنا ہو تو نند اور بہن میں سے کس کو ترجیح دوں؟

۳۔ زکوٰۃ کی رقم سے ضرورت کی چیزیں خرید کر انھیں تحفتاً بھجواتی ہوں لیکن یہ ظاہر نہیں کرتی کہ یہ زکوٰۃ کی رقم سے لی گئی ہیں۔ کیا یہ بتانا ضروری ہے؟

۴۔ جان کے صدقے کے لیے فی سبیل اللہ یعنی کیسٹوں، کتابوں رسائل کی مد میں خرچ کیا جاسکتا ہے؟

۵۔ کیا بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں زکوٰۃ سے اسکول کی فیس، یونی فارم، کتابوں وغیرہ میں مدد کی جاسکتی ہے؟

جواب: آپ زکوٰۃ اور دوسرے نفلی صدقات اپنی بہن اور نند کو دیتی رہیں۔ آپ کے علاوہ دوسرے صاحبِ استطاعت رشتے داروں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کا خیال رکھیں اور زکوٰۃ وصدقات سے ان کی اعانت کریں۔ اگر اس سے ان کا گزارا ہوسکتا ہے تو ٹھیک، ورنہ سب کو مل کر مزید اعانت بھی کرنا چاہیے۔ رشتے داروں کے ضروری اخراجات مال دار رشتے

داروں کے ذمے شریعت نے لازم کیے ہیں۔

زکوٰۃ کا کچھ حصہ جہاد فی سبیل اللہ یعنی دعوتِ دین اور اقامتِ دین کی مد میں بھی دینا چاہیے اور رشتے داروں کی مزید اعانت اپنے مال سے بھی کرنی چاہیے۔ جس قدر زکوٰۃ کا حصہ جہاد کی مد میں دیا جائے اسی قدر اعانت اپنے مال سے رشتے داروں کی کرنی چاہیے۔ کچھ اپنے اوپر مزید بوجھ بھی ڈالنا چاہیے۔ اس طرح کرنے سے تمام حق داروں کا حق ادا ہو جائے گا۔

مذکورہ اصولوں کی روشنی میں آپ کے سوالات کا جواب بھی آ جاتا ہے جو درج ذیل ہے:

۱- ان دو مستحقین کی موجودگی میں آپ ان کو دوسروں پر ترجیح دیں۔ البتہ اقامتِ دین کے کام کے لیے کچھ حصہ ان لوگوں تک بھی پہنچانا چاہیے جو اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں اور اس سے ان کے حصے میں جو کمی آئے، اسے زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مال سے یا رشتے داروں کے مال سے پورا کریں۔

۲- بہن کو نند پر ترجیح حاصل ہے۔ اگر آپ کے پاس دینے کے لیے ایک چیز ہو تو بہن کو مقدم رکھیں۔

۳- زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے، ادا کرنے والے کی نیت ہی کافی ہے۔ جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے، اس کے لیے اس کا علم ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے آپ جس طرح سے زکوٰۃ دے رہی ہیں، دیتی رہیں، لیکن یہ بھی نہ کہیں کہ یہ تحفہ ہے۔ یہ کہیں کہ یہ آپ کا حق ہے جو میرے مال میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے رکھا ہے، وہ آپ تک پہنچا رہی ہوں۔

۴- صدقہ، مساکین و فقرا اور دین کے کاموں میں مالی اعانت کا نام ہے۔ دینی کتابیں اور جہاد فی سبیل اللہ بھی صدقے کا مصرف ہے۔ اس لیے آپ کتابیں لے کر دے دیں تو صدقہ ادا ہو جائے گا۔ جان کا صدقہ بکرا ذبح کرنا نہیں ہوتا بلکہ مذکورہ کاموں میں مالی اعانت ہوتی ہے۔

۵- جو بچے زکوٰۃ و صدقات کے مستحق نہ ہوں ان کے لیے اسکول یونی فارم اور کتابوں وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں لگتی۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۲۰۰۰ء)

عشر کے جدید مسائل

سوال: عشر کے سلسلے میں فقہ حنفی کے احکام تو بہت واضح ہیں لیکن عصرِ حاضر میں کچھ پیچیدہ سی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ میرے خالہ زاد بھائی ایک صاحبِ ایمان فرد ہیں۔ دوڑھائی ایکڑ اراضی کے مالک ہیں اور باقاعدگی سے عشر نکالتے ہیں۔ گذشتہ دنوں انھوں نے عشر کے تعین کے سلسلے میں اپنی صورتِ حال سامنے رکھی تو ہم جواب دینے میں مخمصے کا شکار ہوگئے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو پیداوار حاصل کی ہے اس پر پانی کے علاوہ عمدہ قسم کا بیج، مصنوعی کھاد اور کیڑے مار ادویات خریدنے اور اجرت پر ٹریکٹر کے ذریعے ہل چلانے اور اجرت پر تھریشر کے ذریعے گندم اور بھوسہ الگ کروانے کی اخراجات ہوئے۔ اب انہیں کس شرح سے عشر ادا کرنا چاہیے، خصوصاً اس پس منظر میں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے اخراجات کے باعث شرح میں تبدیلی فرمائی؟

دوسرا ان کا یہ کہنا ہے کہ جتنی گندم کھیت سے اٹھا لایا ہوں اس سے سال بھر کے اناج کی ضروریات پوری کرنی ہیں اور اگلی فصل کے لیے اخراجات (ہل بذریعہ ٹریکٹر، اسپرے، نئی اقسام کے بیج کی خریداری، کھیت کی صفائی کے لیے لیبر کا حصول) بھی اسی سے پورے کرنے ہیں اور ان اخراجات کے بغیر چارہ نہیں کہ یہ واحد ذریعۂ معاش ہے۔ اس سب کچھ کرنے کے بعد بچتا کچھ نہیں بلکہ کچھ قرض وغیرہ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اب ان صاحب نے اخراجات الگ الگ کرکے، دس فی صد کی شرح سے عشر ادا کر دیا ہے۔ فصلوں کی موجودہ صورتِ حال جس میں تجارت کی طرح پہلے بہت کچھ لگانا پڑتا ہے۔ عشر کی ادائیگی کے بارے میں اہلِ فقہ کیا فرماتے ہیں؟ بندۂ دہقان کے اوقات تو بہت تلخ ہو چکے۔

جواب: جدید مشینی آلات اور کھاد وغیرہ کے ذریعے زراعت میں جہاں اخراجات اٹھتے ہیں وہاں اُس کے ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے مستند بات یہ ہے کہ اخراجات ادا

کرنے کے بعد اگر زمیندار استطاعت رکھتا ہو کہ اس پیداوار سے اپنے اخراجات آسانی سے پورے کر سکے اور وہ کل پیداوار سے اخراجات کو منہا کیے بغیر عشر دینے کی سکت رکھتا ہو تو کل پیداوار سے عشر ادا کرے۔ اور اگر زمیندار چھوٹی سطح کا ہو، اخراجات منہا کیے بغیر عشر دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اتنی پیداوار حاصل نہ کی ہو کہ آسانی سے اپنے اخراجات بھی پورے کر سکے اور کل پیداوار میں سے عشر بھی ادا کر سکے تو پھر اخراجات منہا کر کے باقی کا عشر نکال لے۔ یہ درمیانی راہ ہے جو قرآن پاک کی عمومی ہدایات اور عشر کے احکام دونوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ عمومی ہدایت تو یہ ہے کہ زکوٰۃ اغنیا سے وصول کی جائے اور فقرا کو دی جائے اور عشر کا اصول یہ ہے کہ جو پیدا ہو اس میں سے عشر دیا جائے۔

جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ پانی کے اخراجات کو تو شریعت نے اس طرح مستثنیٰ کر دیا ہے کہ دسویں کے بجائے بیسواں حصہ مقرر کر دیا ہے۔ پانی کے علاوہ باقی اخراجات کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ لہٰذا اس میں دونوں پہلوؤں کی گنجایش ہے یعنی مستثنیٰ کرنے اور نہ کرنے کی۔ مستثنیٰ نہ کرنے کا پہلو ان لوگوں کے لیے مناسب ہوگا جو سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں۔ ان پر اس سے کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔ ادائیگی کے بعد بھی وہ اپنا گزارا خود کر سکیں گے اور دوسروں کے محتاج نہ ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلصَّدَقَۃُ عَنْ ظَھْرِ غِنیً (مسند احمد، دارمی) صدقہ مال دار کی پشت پر ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اخراجات کو مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہ اس وقت ہے جب کہ زمین دار غریب ہو، صاحبِ استطاعت نہ ہو اور اخراجات کو منہا نہ کر کے بوجھ تلے دب جائے۔ اسے دوسروں کی طرف سوال کے لیے رجوع کرنا پڑے اور قرض اٹھانا پڑے۔ اس کی دلیل مذکورہ حدیث ہے یہ چونکہ غنی نہیں ہے لہٰذا اس پر صدقہ نہ ہوگا۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۹ء)

مزید وضاحت

سوال: رسائل و مسائل (ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۹ء) میں آپ نے فرمایا ہے کہ بڑے زمین دار اپنے طور پر اخراجات منہا کیے بغیر عشر کا تعین کریں اور چھوٹے زمین دار اخراجات منہا کر کے بقیہ میں سے عشر ادا کریں۔ میں خود بھی اور کچھ دیگر زراعت پیشہ دوست بھی اس جواب سے اور مسئلے کی اس نوعیت سے مطمئن نہیں ہیں۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ چھوٹے اور بڑے زمین دار کا تعین کون کرے؟ کیا فارمولا ہو جو معروف ہو سکے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ چھوٹے زمیندار کی اپنی کاشت سے جہاں آمدن کم ہوگی، وہاں فصل پر اٹھنے والے اخراجات بھی کم ہوں گے اور بڑے زمین دار کی جہاں فصل کی مقدار زیادہ ہوگی وہاں فصل بنانے پر اس کے اخراجات بھی زیادہ اٹھتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ لوگوں کو حیلہ سازی کے مواقع ملیں گے۔ جس طرح ہسپتالوں میں فیس اور علاج کے اخراجات یا بچوں کو محکمۂ تعلیم سے وظائف دلوانے کے لیے لوگ اپنی آمدنی کے جھوٹے سرٹیفکیٹ بنواتے ہیں۔ آیندہ اسلامی حکومت بنے گی تو عاملین کے ساتھ حیلہ سازی کی جائے گی اور ایک بات یہ بھی ہے کہ اکثر علماے احناف اس پر متفق ہیں کہ کاریز، نہر، چشمہ اور بارانی پانی کی فصل میں دسواں حصہ عشر ہے، جب کہ ٹیوب ویل یا دیگر ایسا پانی جس پر خرچ آتا ہو اس کی فصل میں سے بیسواں حصہ یعنی ۵ فی صد ہے۔ یہ متفقہ رائے بھی ہے اور سادہ اور آسان بھی۔ ازراہِ کرم اس مسئلے پر سیر حاصل بحث فرمائیں تا کہ بات واضح ہو جائے۔ فارمولا متعین صورت میں ہو اور معروف و مروج ہو جائے۔

جواب: اصل تو یہی ہے کہ عشر کل پیداوار میں سے ادا کیا جائے۔ جمہور کا یہی مسلک ہے اور فتویٰ اسی پر ہے۔ لیکن بعض حضراتِ صحابہ کرام، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ

اور بعض تابعین کے نزدیک بعض اخراجات، مثلاً ایسے اخراجات جو زمین پر قرض لے کر کیے ہوں، منہا کیے جاسکتے ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور بعض کے نزدیک کل اخراجات منہا کیے جاسکتے ہیں۔ حضرت عطاؒ تابعی کا یہی مسلک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گھریلو قرضوں کو بھی منہا کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور شارح ترمذی، ابن عربی کی بھی یہی تحقیق ہے۔ انھوں نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عاملین کو ایک تہائی یا ایک چوتھائی منہا کر کے عشر لینے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتنی مقدار اخراجات میں چلی جاتی ہے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان لَیْسَ فِیْ مَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ صَدَقَةٌ[1] (پانچ وسقوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے) سے چھوٹے زمیندار کا تعین ہوجاتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اخراجات کا مسئلہ اجتہادی نوعیت رکھتا ہے لہٰذا اصول تو اسی کو بنایا جائے کہ اخراجات منہا کیے بغیر عشر دیا جائے۔ لیکن اگر ایک آدمی پیداواری اخراجات کی وجہ سے اس قدر زیرِ بار ہوگیا ہو کہ پیداواری اخراجات منہا کیے بغیر وہ عشر ادا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو، تو پھر ایسی حاجتِ شدیدہ کی صورت میں ان فقہا کے اجتہاد پر عمل کرسکتا ہے جن کے نزدیک اخراجات منہا کرنے کی اجازت ہے۔ چھوٹے زمینداروں سے اسی قسم کے زمیندار مراد ہیں جن کی پیداوار تھوڑی ہو یا وہ پیداواری اخراجات کی وجہ سے بہت زیادہ زیرِ بار ہوچکے ہوں کہ وہ خود بھی فقرا اور مساکین کے زمرے میں آگئے ہوں۔ میں نے اپنے جواب کے آخر میں وضاحت سے لکھا تھا کہ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اخراجات کو مستثنیٰ کردیا جائے۔ یہ اس وقت ہے جب کہ زمیندار غریب ہو، صاحبِ استطاعت نہ ہو اور اخراجات کو منہا کیے بغیر بوجھ تلے دب جائے، اسے دوسروں کی طرف سوال کے لیے رجوع کرنا پڑے اور قرض اٹھانا پڑے۔ اس کی دلیل بھی مذکورہ حدیث ہی ہے۔ یعنی اَلصَّدَقَةُ عَنْ ظَهْرِ غِنًی (مسند احمد، دارمی) صدقہ مال دار کی پشت پر ہے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۹ء)

۱۔ تقریباً تمام محدثین کی کتابوں میں، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔

کرایے کے مکان پر زکوٰۃ

سوال: کیا کرایے پر دیے گئے مکانوں پر زکوٰۃ فرض ہے؟ مثلاً ایک شخص کے پاس اپنے استعمال کے علاوہ کچھ مکان ہیں جو کرایے پر دیے گئے ہیں اور ایک سال سے زائد عرصہ بھی گزر چکا ہے۔ کیا ان مکانوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ اگر واجب ہوگی تو کس حساب سے؟ یعنی صرف حاصل کردہ کرایے پر، مکان کی کل قیمت پر، مکان کی قیمت خرید پر یا موجودہ قیمت پر؟

جواب: کرایے پر دیے گئے مکانات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ ان کی آمدنی کو جمع شدہ رقم کے ساتھ ملا کر سال کے آخر میں ساری رقم کی زکوٰۃ ادا کی جائے، بشرطیکہ اس کے پاس پس انداز کی ہوئی رقم ہو اور وہ کرایے کی آمدنی کے ساتھ مل کر مقدارِ نصاب کو پہنچ جاتی ہو۔ مثلاً ایک شخص کے پاس تین ہزار روپے کی رقم ہے کرایے کی آمدنی ماہ بماہ اسے ہوتی ہے اور اس میں سے کچھ یا ساری اس کے پاس تین ہزار روپے کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے۔ دورانِ سال کبھی ڈیڑھ ہزار، کبھی دو ہزار، کبھی سات سو ہو جاتی ہے، لیکن رقم کا کچھ حصہ بہر حال موجود رہتا ہے اور سال کے بعد تین ہزار روپے ہو جاتے ہیں (آج کل ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت بھی تقریباً تین ہزار ہے) تو اس پر تین ہزار کی رقم کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۹۲ء)

زیور کی زکوٰۃ

سوال: زکوٰۃ کے بارے میں میرے میاں کا یہ استفسار ہے کہ عورت چونکہ زیور کی مالک ہوتی ہے اس لیے وہ ہر سال خود زکوٰۃ دے مگر جب وہ خود نہ کماتی ہو تو یہی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ ہر سال زیور میں سے کچھ بیچ کر زکوٰۃ ادا کرے جب کہ میرے ذہن کے مطابق زیور عورت کی ملکیت میں نہیں ہوتا۔ مرد کو جب ضرورت ہوتی ہے تو اسے بیچ دیتا ہے۔ پھر اکیلی عورت تو مالک نہیں ہو سکتی اور دوسری بات یہ کہ زیور اسے حقِ مہر میں بھی نہیں ملا۔

جواب: زیورات کے بارے میں فیصلہ کرنا کہ ان کا مالک کون ہے، آپ لوگوں کا اپنا کام ہے۔ آپ یہ طے کرلیں اور اس کے بعد جو بھی اس کا مالک ہو اس پر زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ اگر مالک آپ ہوں تو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے شوہر آپ کو اتنی رقم بطورِ ہبہ دے دیا کریں جس سے آپ کے زیورات کی زکوٰۃ ادا ہو جائے۔ ملکیت کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ زیورات دیتے وقت دینے والے کی نیت کیا تھی، یا عرف اور رواج کیا تھا۔ اگر دیتے وقت خاوند نے یہ نیت کی تھی کہ اس کی بیوی زیور کی مالکہ ہوگی یا عرف اور رواج مالکانہ طور پر دینے کا تھا تو بیوی مالکہ شمار ہوگی اور اس کی ملکیت پر یہ بات اثر انداز نہ ہوگی کہ خاوند بوقتِ ضرورت بیچ دیتا ہے تو بیوی رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ بلکہ ایسی صورت میں خاوند کو بیوی سے باقاعدہ اجازت لینا چاہیے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۸۶ء)

☆ ☆ ☆

باب ہفتم

معاشی مسائل

سودی قرضے

سوال: موجودہ حکومت نے بے روزگاروں کے سلسلے میں کچھ اسکیمیں شروع کی ہیں۔ عام افراد کو صرف ۶۰،۰۰۰ روپے کی ادائیگی پر ٹیکسی کا مالک بنا دیا جاتا ہے [جب کہ] تعلیم یافتہ افراد کے لیے اس رقم میں مزید کمی کی گنجایش بھی رکھی گئی ہے۔ بقیہ رقم بینک سے قرض کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔ بینک کی یہ رقم آسان قسطوں میں بینک کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح ۱۰،۰۰۰ روپے سے ۳،۰۰،۰۰۰ روپے تک قرض دیا جا رہا ہے۔ اس رقم کی واپسی بھی مع سود کی جائے گی۔

کیا کوئی رکنِ جماعت از خود یا اپنے کسی عزیز دوست کے لیے مذکورہ بالا قرض حاصل کر سکتا ہے یا قرض کے حصول میں کسی بھی حیثیت سے معاون و مددگار اور مشیر بن سکتا ہے اگر ایسا کرتا ہے تو جماعتِ اسلامی میں اس کی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب: بے روزگاروں کے لیے سودی قرضوں کی سکیموں کے بارے میں حکم بالکل واضح ہے کہ اس کا لین دین اور اس میں معاونت کی کوئی بھی صورت جائز نہیں ہے۔ اسی لیے جماعتِ اسلامی اپنے ارکان و متفقین کے لیے خصوصاً اور عامۃ المسلمین کے لیے عموماً جملہ ناجائز کاموں میں، جن میں سودی سکیمیں بھی شامل ہیں، شرکت کی تمام صورتوں کو ناجائز سمجھتی ہے۔ اور ان میں شرکت سے روکتی ہے۔ اگر کسی رکن سے اس نوعیت کے ناجائز کاموں میں شرکت یا تعاون کی کمزوری کا ارتکاب ہوا ہو تو اسے متنبہ کر کے اس کام سے منع کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اس سے غلطی کا ارتکاب ہوا ہو۔ لیکن سمجھانے پر اگر نہ سمجھے، اسے اپنی غلطی کا احساس نہ ہو، اور اس ناجائز کام میں مستقلاً ملوث ہو، تو اس کے بارے میں متعلقہ جماعت کو آگاہ کیا جائے اور ضابطے کے مطابق اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۹۲ء)

سیونگ سرٹیفکیٹ کا سود

سوال: میں ایک سکول ٹیچر ہوں۔ میں نے دس سال پہلے ڈاک خانے سے سیونگ سرٹیفکیٹ خریدے تھے۔ کہ دس سال بعد یہ دگنے ہوجائیں گے۔ اب مجھے مذہب کے بارے میں کچھ شعور آیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں کہ اس سرٹیفکیٹ کا میری اصل رقم کے علاوہ پیسہ یعنی منافع جائز بھی ہے یا نہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ چونکہ حکومت یہ پیسہ کاروبار میں لگاتی ہے اس لیے اس کا منافع ہمارے لیے جائز ہے۔ دوسرا یہ کہ میرے شوہر پہلے دوائیوں کا کام کرتے تھے جن میں انھیں بہت نقصان ہوا یعنی تقریباً ۹ لاکھ کا۔ انھیں بہت سے لوگوں کا قرضہ دینا ہے اور بہت سے لوگوں سے لینا ہے۔ مگر نہ کوئی دیتا ہے اور نہ یہ دینے کے قابل ہیں۔ اب عرصہ تین سال سے بالکل بے کار ہیں، کوڑی کوڑی کے محتاج ہیں۔ بھائیوں کا بھی قرضہ دینا ہے۔ زمین سے جو ہزار روپے سالانہ آتے ہیں وہ بھائی کاٹ لیتے ہیں اور پلاٹ پر دوسرے بھائی کا قبضہ ہے وہ بھی کہتا ہے میرا قرضہ دینا ہے، پلاٹ میں نہیں دوں گا۔ وہ بیچنے بھی نہیں دیتا۔ ایک ڈالا گاڑی ہے جو بہت پرانی ہے وہ بھی عرصے سے ورکشاپ میں کھڑی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اصل رقم کے علاوہ جو رقم منافع کی ہو وہ اپنے شوہر کو دے دوں تاکہ وہ اپنی روٹی کما سکیں۔ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس لیے کوئی بھی حصہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے اپنی رقم آڑے وقت کے لیے رکھی ہوئی ہے آپ اپنے مفید مشورے سے نوازیں کہ کیا میں منافع کی رقم اپنے شوہر کو دے سکتی ہوں۔

جواب: ڈاک خانے سے سیونگ سرٹیفکیٹ پر جو اضافی رقم ملتی ہے وہ سود ہے اور سود شرعاً حرام ہے۔ آپ نے دس سال پہلے جو سرٹیفکیٹ خریدے تھے وہ ڈاک خانے والوں کی طرف سے آپ کو دوگنا کر کے دیے جا رہے ہیں تو اصلی رقم سے زائد جو ملے گا وہ سود شمار ہوگا۔

آپ کو سیونگ سرٹیفکیٹ پر منافع کی جو رقم ملے وہ آپ موجودہ اضطراری حالت میں مبتلا

شوہر کو دے سکتی ہیں۔ آپ ان کو یہ رقم بھی دے دیں اور ان کے لیے دعا بھی کریں تا کہ آپ کے گھر کے حالات سدھر جائیں۔

آپ نے اپنے شوہر کی دکھ بھری کہانی جو بیان کی ہے اسے پڑھ کر دکھ اور صدمہ پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کے شوہر کی مدد فرمائے تا کہ ان کے قرضوں کا بوجھ اتر جائے اور وہ خوشحالی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اپنی زندگی بسر کریں اور ان کی معیت میں آپ کو بھی خوشی اور اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور بندگانِ خدا کی خدمت اور اصلاح کا کام کرنے کا موقع میسر ہو۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل مسنون دعا، نمازوں کے بعد اور رات کے وقت زیادہ سے زیادہ تعداد میں اچھی طرح خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھتے رہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوۡذُبِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَاَعُوۡذُبِكَ مِنۡ ضَلَعِ الدَّیۡنِ وَ قَھْرِ الرِّجَالِ اے اللہ میں فکرمندی اور غم سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور بزدلی اور کنجوسی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور قرض کے بوجھ اور لوگوں کے دباؤ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۹۲ء)

بنک کا سود

سوال: ۱- مجھے کسی عالم نے بتلایا کہ بینک کے سود کی رقم استعمال میں نہیں لانی چاہیے، بلکہ کسی ضرورت مند کو دے دینی چاہیے۔ نیکی یا اللہ واسطے کی نیت سے نہیں، بلکہ غلط رقم کے استعمال سے بچنے کی غرض سے۔ میں اس پر عمل کر رہا ہوں کیونکہ بینک کے پاس چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ کیا یہ طریق کار ٹھیک ہے؟

۲- ہمارے محلے میں مسجد کی رقومات ایک صاحب کے پاس رہتی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بینک میں رکھی جائیں۔ دوسرے لوگ سود کی وجہ سے اسے قابل اعتراض قرار دیتے

ہیں۔ ہمارے لیے صحیح راستہ کون سا ہے؟

جواب: ۱- بینک کا منافع سود ہے۔اس کا مصرف اضطراری حالت میں مبتلا فقرا اور مساکین ہوتے ہیں۔ جس عالمِ دین نے آپ کو یہ مسئلہ بتلایا ہے، انھوں نے صحیح مسئلہ بتلایا ہے۔ یہ بات حدیثِ رسولؐ سے ثابت ہے کہ جس مالِ حرام کو اس کے اصل مالک کو واپس نہ کیا جا سکتا ہو، اسے حالت اضطرار میں مبتلا فقرا اور مساکین میں صرف کیا جائے کہ وہ اس کا مصرف ہیں۔ اس لیے کہ جس مال کا اصل مالک نہ ملے اسے اس کی طرف سے فقرا کو دے دیا جائے تو گویا اسے دے دیا۔ گری پڑی ہوئی چیز کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ہدایت دی ہے۔

۲- مسجد فنڈ آپ بنک میں رکھ سکتے ہیں۔ کرنٹ اکاؤنٹ میں سود نہیں لگتا لہٰذا آپ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھ دیں۔ اس میں زکوٰۃ بھی نہیں کاٹی جاتی۔ بنک میں بطورِ امانت رکھی ہوئی رقم پر اگر سود لگ جائے تو بنک سے لے کر مفلوک الحال فقرا کو دے دیا جائے۔ بوسنیا، کشمیر، فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کی ضروریات وحاجات پر خصوصی توجہ دی جائے۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۵ء)

متعین منافع

سوال: میں نے اپنی ہمشیرہ سے کاروبار کے لیے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ لیا ہوا ہے اور ان سے یہ طے کیا ہے کہ میں آپ کو ہر مہینے آپ کے خرچ کے لیے تھوڑی سی رقم دیتا رہوں گا۔ ہم سب نے اپنا کاروباری منافع اندازے سے بنایا ہوا ہے جس میں سے ہر مہینے ہم اپنی ہمشیرہ کو ۲۲۵۰ روپے دیتے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ آیا یہ طریقہ درست ہے؟ واضح رہے کہ اس سے ہماری ہمشیرہ مطمئن ہے، مگر میرے ذہن میں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس سے کسی طرح کوئی سود کی شق نہ نکلتی ہو۔

جواب: کاروبار میں کسی کی رقم پر متعین منافع دینا سود ہوتا ہے۔ آپ اپنی ہمشیرہ کو ماہوار ۲۲۵۰

روپے منافع دے رہے ہیں۔ اگر بہن کے لیے آپ کے نزدیک یہی منافع ہے اور آپ نے متناسب نفع نہیں رکھا جس کی بنا پر ۲۲۵۰ روپے ماہوار مقرر کردہ رقم میں کمی بیشی ممکن ہو تو سود شمار ہوگا۔

غیر سودی منافع کے لیے ایک تو یہ ضروری ہے کہ نفع و نقصان دونوں میں شراکت ہو اور دوسرا یہ ضروری ہے کہ متناسب منافع ہو یعنی کل منافع کا نصف یا ۲/۳ یا کوئی اور نسبت، جو بھی آپ طے کر دیں، اس کے حساب سے منافع تقسیم کیا جائے۔ ایسی صورت اختیار کی جائے تب ہی یہ معاملہ غیر سودی ہوگا ورنہ نہیں۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۲ء)

قسطوں پر خرید و فروخت

سوال: کوئی چیز قسطوں پر لیں تو کیا وہ سود میں آتی ہے یا جائز ہے؟ مثلاً ایک موٹر سائیکل کی قیمت بازار میں ۳۰ ہزار روپے ہے اور قسطوں میں تقریباً ڈھائی تین سال میں اس کی قیمت ۳۵ ہزار ادا کرنا پڑتی ہے۔ کیا وہ سود میں آتی ہے؟

جواب: نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کے ساتھ چیز فروخت کرنا اور خریدنا جائز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا نقد فروخت کرنے کی صورت میں دکاندار خریداروں کو مختلف قیمتوں پر چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ کسی سے کم قیمت لیتے ہیں اور کسی سے زیادہ، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ 'ادھار' یا قسطوں کی صورت میں رقم بروقت ادا نہ کر سکنے کی صورت میں قیمت میں فرق نہ کیا جائے اور اتنی رقم وصول کی جائے جتنی طے کی گئی ہے۔ خریدار رقم ادا کر سکتا ہو اسے تو رقم بروقت ادا کرنا چاہیے، نہ ادا کر سکتا ہو تو مالک کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مزید مہلت دے۔ قرآنِ پاک میں ہے: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (البقرۃ ۲:۲۸۰) پس مہلت دے دو آسانی تک۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۲ء)

روپے کی قیمت میں کمی بیشی اور ادائیگی قرض

سوال: ایک شخص دکاندار کو کپاس لا کر فروخت کرتا رہا۔ نرخ مقرر کر کے حساب کیا گیا۔ شخص مذکور ساتھ ساتھ رقم لیتا رہا۔ جو کہ کئی ہزار تھی۔ کل قیمت میں سے دو ہزار روپیہ دکاندار کے ذمہ باقی بچ گیا تھا، جو دکاندار مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ادا نہ کر سکا۔ چالیس سال گذر جانے کے بعد دکان دار کی مالی حالت کچھ ٹھیک ہوئی، تو اس نے شخصِ مذکور سے کہا کہ اپنی بقایا رقم دو ہزار لے لو۔ شخصِ مذکور نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس وقت کپاس کا نرخ کم تھا۔ اب بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس حساب سے رقم دو۔ حالانکہ اس وقت نرخ طے کر کے حساب کر لیا گیا تھا۔ اور دو ہزار روپیہ دکان دار کے ذمے باقی بچ گیا تھا۔ اب ادائیگی کیسے کی جائے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: قرضِ حسنہ یا دَین کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اس کے مثل چیز ادا کی جائے۔ نوٹ کا مثل نوٹ ہے۔ اس لیے اگر ایک شخص کے ذمے دو ہزار روپے تھے تو اسے دو ہزار ہی دینے ہوں گے۔ جیسے ایک شخص نے ۱۰ تولے سونا لیا تھا تو وہ ۱۰ تولے سونا ہی واپس لے سکتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ۱۰ تولے کی قیمت اس وقت تھوڑی تھی اور آج دس تولے سونے کی قیمت زیادہ ہے۔ اگر مقروض کہے کہ اب میں ۱۰ تولے نہیں دوں گا بلکہ ایک تولہ دوں گا۔ کیونکہ میں نے ۱۰ تولہ لیا تھا جس کی قیمت آج دس گنا بڑھ گئی ہے اور آج کا ایک تولہ اس وقت کے دس تولے کے برابر ہے تو اس کا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح قیمت کی کمی کی صورت میں بھی قرض خواہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ اس کے لیے کمی کا ازالہ کیا جائے۔ مزید وضاحت کے لیے گندم کی مثال دی جا سکتی ہے۔ آج گندم مہنگی ہے اور جس قدر روپیہ یا سونے چاندی سے آج آپ سو من گندم حاصل کر سکتے ہیں آج سے تیس سال قبل اس قدر روپیہ یا سونے چاندی سے ایک ہزار من گندم لے سکتے تھے لہٰذا اگر کسی نے آج سے تیس سال قبل سو (۱۰۰) من گندم قرض دی تھی تو وہ آج ایک ہزار من گندم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

اسی طرح آج سے بیس سال قبل سو(۱۰۰) روپے قرض دینے والا ایک ہزار روپے کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا بلکہ اسے صرف سو(۱۰۰) روپے کے مطالبے کا حق ہے۔

(ترجمان القرآن،جنوری ۱۹۹۲ء)

منافع یا سود!

سوال: پاکستان کی ایک مشہور کمپنی لوگوں سے ۱۵ فیصد منافع کی بنیاد پر رقم جمع کرتی ہے اور یہ تمام رقم قرآن کریم اور دیگر اسلامی کتب کی اشاعت پر لگاتی ہے۔عرض ہے کہ کیا اس طرح سے رقم لگانا جائز ہے؟ کیا یہ منافع سود نہیں ہے؟

جواب: کسی سے قرض لے کر اسے ایک متعین شرح سے نفع دینا قطعاً سود ہے۔اس کے سود ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کی آیت: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰو (البقرۃ ۲:۲۷۵) [حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام] کے ذیل میں تجارتی کاروبار اور سودی کاروبار کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مگر یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں،خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت وحرفت کے یا زراعت کے اور خواہ انھیں آدمی صرف اپنی محنت سے کرتا ہو یا اپنے سرمائے اور محنت ہر دو سے،ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقررہ منافع کی ضمانت ہو۔پھر آخر پوری کاروباری دنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہو جو نقصان کے خطرے سے بچ کر ایک مقررہ اور لازمی منافع کا حق دار قرار پائے؟[1]

پس جو کمپنی بھی لوگوں سے ۱۵ فیصد (یا کم وبیش) منافع کی بنیاد پر رقم جمع کرتی ہے سودی کاروبار میں مبتلا ہے۔اس لیے اس کے پاس رقم جمع کرا کے منافع حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن،اکتوبر ۱۹۸۳ء)

۱- تفہیم القرآن،ج اوّل،ص ۲۱۲،البقرۃ،حاشیہ ۳۱۷۔

حرام مال کا اصل مصرف

سوال: جدہ میں تحریکِ اسلامی کی تمام کارکن خواتین اعانت دیتی ہیں جو مختلف مدوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ ان میں وہ خواتین بھی ہیں جن کے شوہر بنک میں کام کرتے ہیں مگر تحریک کی ذمہ دار خواتین ان کے گھر جا کر پانی کا گلاس تک نہیں پیتیں، صرف اس بنا پر کہ ان کی آمدنی جائز نہیں ہے۔ یہ بتایئے کہ یہ ذمہ دار خواتین ان سے اعانت کیوں لیتی ہیں، جب کہ یہ رقم زکوٰۃ اور صدقات میں بھی استعمال ہوتی ہے، پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی رقم شامل ہو جانے سے تمام رقوم ناپاک ہوگئیں۔

جواب: حرام مال سے بچنا تو ایک صحیح طرزِ عمل ہے اس پر نکیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ایک صاحب بنک میں ملازمت کرتے ہیں، وہ بنک کی رقم سے مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں اور مہمانوں کو معلوم ہے کہ ان کی حرام مال سے ضیافت کی جارہی ہے تو انھیں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ البتہ اگر وہ ایسے صاحب ہوں کہ ان کی کمائی خالص حرام نہ ہو یا وہ مہمانوں کو بطور خاص قرض لے کر حلال مال سے کھلاتے پلاتے ہوں تو ایسی صورت میں مہمانی قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسے صاحب کو اس بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیے کہ حلال و حرام کا امتیاز کرنے والے ان کے ہاں کھانے پینے سے احتراز کرتے ہیں۔

اعانت کا مسئلہ بالکل الگ ہے۔ اعانت میں حرام مال بھی لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ حرام مال کا اصل مصرف فقرا اور مساکین ہیں۔ اس لیے بنک ملازم سے فقرا، مساکین اور شعبۂ خدمتِ خلق کی مد میں رقم لینا جائز ہے۔ دونوں مسئلوں کو آپس میں خلط ملط کرنا مناسب نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، مئی ۲۰۰۰ء)

بانڈز کی شرعی حیثیت

سوال: اگر انعامی بانڈز کی قرعہ اندازی میں انعام مل جائے تو اس کے جائز مصارف کیا ہیں، یعنی وہ رقم کہاں خرچ کی جائے؟ اگر رشتے دار و اقارب میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اس رقم میں سے کاروبار کیا جا سکتا ہے؟ اگر کاروبار کرنے والے مقروض ہوں تو ان کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے؟ اگر کاروبار میں لگا کر آہستہ آہستہ وہ رقم نکال لی جائے تو کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

جواب: انعامی بانڈز میں دراصل سود کی وہ رقم جو الگ الگ تقسیم کی جاتی ہے، اکٹھی کر کے ایک یا دو یا چند آدمیوں کو دے دی جاتی ہے۔ یہ دراصل سودی رقم ہے۔ سودی رقم کو خود نہیں استعمال کرنا چاہیے بلکہ اپنے اعزہ و اقارب میں یا جو علاقے کے مستحق ہیں ان کو دے دینی چاہیے، صدقے کی نیت سے نہیں بلکہ مصرف میں خرچ کرنے کی نیت سے۔ اس رقم سے کاروبار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کاروبار حلال و جائز مال سے کیا جائے۔ انعامی بانڈز کے ذریعے لوگوں کے اندر جوے کی بیماری بھی پیدا کی جاتی ہے۔ انعام کے بہانے سودی رقم بھی کھلائی جاتی ہے اور انعام کے لالچ میں بے شمار لوگوں کی رقم بھی جمع کی جاتی ہے۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۹۸ء)

بنک میں شراکتی کھاتہ

سوال: بنکوں میں نفع ونقصان شراکتی کھاتے میں جو رقوم رکھی جاتی ہیں ان پر نفع کے نام سے بنک جو رقم دیتا ہے۔ آیا وہ شریعت کی رو سے جائز ہے؟ میرے بعض تحریکی دوست اسے جائز سمجھتے ہیں مگر مجھے شرحِ صدر نہیں ہے۔ کیا شرعاً یہ کشمیری مجاہدین کو بھیجی جاسکتی ہے؟ کیا اس سے لائبریری کے لیے دینی لٹریچر خریدا جاسکتا ہے؟ بچیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے اس سے ٹرسٹ بنانا اور مدرسے کھولنا جائز ہے؟ نفع ونقصان شراکتی کھاتے میں سے یکم رمضان کو زکوٰۃ کاٹی جاتی ہے۔ کیا یہ زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

جواب: بنک میں نفع ونقصان میں شراکتی کھاتے کے نام سے [حکومت پاکستان کی طرف سے صدر ضیاء الحق کے دور سے] جو کھاتہ جاری کیا گیا ہے وہ [حقیقت میں] سود ہے اور اس سے حاصل کردہ منافع سودی منافع ہے۔ ایسے منافع کے مستحق فقرا ومساکین اور مفلوک الحال لوگ ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کے دوستوں کا نظریہ اور طرزِ عمل درست نہیں ہے۔ منافع کی یہ رقم جو نفع ونقصان شراکتی کھاتے سے ملتی ہے، سود کی رقم ہے۔ اسے آپ مجاہدین کشمیر، یتیموں، بیواؤں اور بوسنیا کے مہاجرین ومجاہدین کی امداد میں دے سکتے ہیں، اپنے استعمال میں لانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اس رقم سے کتابیں خریدنا، اسے بچوں کی تعلیم وتربیت میں خرچ کرنا، مدرسے کھولنا جائز نہیں ہے۔

بنک والوں کو زکوٰۃ کی کٹوتی کرانے کے مقابلے میں خود زکوٰۃ ادا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تاہم اگر حکومت زکوٰۃ کی کٹوتی کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ البتہ حکومت کو مجبور کریں کہ زکوٰۃ کی رقوم زکوٰۃ کے مصارف میں خرچ کرے۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۶ء)

سود کی مجبوری

سوال: کوئی فرد جماعتِ اسلامی کا رُکن نہیں بن سکتا، اگر اُس کا کاروبار معصیتِ فاحشہ کے ضمن میں آتا ہو۔ ہمارے چند احباب ایسے ہیں جو اپنے جائز کاروبار (مثلاً گارمنٹ اور دواؤں کے کاروبار) کے سلسلے میں بنکوں سے لین دین کرتے ہیں اور یہ کرنے پر مجبور ہیں۔ براہِ کرم ان کے بارے میں بتائیے کہ وہ مذکورہ دفعہ کے تحت تو نہیں آتے؟ کیا وہ رکن بن سکتے ہیں؟ ایک اور صاحب ملازمت کی سلسلے میں واپڈا والوں سے لین دین پر مجبور ہیں، ورنہ واپڈا والے بجلی کاٹ سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی بتائیے۔

جواب: بنک کے ساتھ سودی لین دین جائز نہیں ہے اور سودی لین دین کرنے والا معصیتِ فاحشہ میں مبتلا ہونے کی بنا پر جماعت کا رکن نہیں بن سکتا۔ البتہ غیر سودی کاروبار بنک کی وساطت سے کیا جائے تو موجودہ حالات میں درگزر کے قابل ہے۔ دکان اور دواؤں کے کاروبار کے سلسلے میں بنک کے ذریعے رقوم کا لین دین جائز ہے۔ یعنی خریدار بائع کو بنک کے ذریعے رقم بھیج سکتا ہے۔ اسی طرح بائع بنک کے ذریعے ادویہ ارسال کرسکتا ہے۔

جہاں تک کسی کے مجبور ہونے کا تعلق ہے تو اضطراری واقعات کی ٹوہ میں نہیں پڑنا چاہیے نہ اضطرار میں مبتلا شخص کو اپنے گناہ کا افشا کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص اضطرار کے دعویٰ کے ساتھ کسی محکمے کو رشوت دیتا ہے تو اسے تنبیہ کرنا چاہیے اور اس پر واضح کر دینا چاہیے کہ جماعت کے ارکان فقہا کی طرف سے دی گئی رخصتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ ہرگز کسی رکن کو اس کی اجازت نہ دیں کہ وہ رشوتیں دے کر اپنے کام نکالے۔ لیکن اگر کسی سے قصور ہو گیا ہو اور آپ کے سامنے کیس آ گیا ہو، تو ایسی صورت میں فیصلہ فقہا کے فتویٰ کی روشنی میں کیا جائے گا۔ ایسے شخص کو توبہ واستغفار کی تلقین کے ساتھ کچھ روزے رکھوا دیے جائیں اور صدقہ دینے کی ہدایت کر دی جائے، لیکن اس کی رکنیت باقی رکھی جائے۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۵ء)

مقروض کا صدقہ

سوال: ایک صاحب کو قرض ادا کرنا ہے لیکن وہ قرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صدقہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ کیا انھیں پہلے قرض ادا کرنا چاہیے یا ساتھ ساتھ صدقہ بھی کر سکتے ہیں؟

جواب: حقوق العباد کی بروقت ادائیگی بہت زیادہ ضروری ہے۔ جن لوگوں کے قرض کسی کے ذمہ ہوں، ضروری ہے کہ وہ وعدے کے مطابق ادا کیے جائیں۔ اگر کوئی قرض ایسا ہے کہ اس کی ادائیگی کا وقت آ پہنچا ہے اور صدقہ کرنے سے وہ حق متاثر ہوتا ہے تو ایسی صورت میں صدقہ کو موخر کرنا چاہیے۔ اگر قرض کی میعاد ابھی دور ہے اور غالب گمان ہے کہ صدقہ کرنے سے قرض کی ادائیگی متاثر نہ ہوگی بلکہ اپنے وقت پر ہو جائے گی تو ایسی صورت میں صدقہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنی مقدار میں کہ گھر کے جاری اخراجات میں بھی خلل نہ آئے، ان کے لیے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنا پڑے اور قرض بھی اپنے وقت پر ادا ہو جائے۔ قرآنِ پاک میں اس کے لیے یہ اصول بیان کیا گیا ہے: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اپنے ہاتھ کو گردن سے ملا کر جکڑ نہ دو اور اسے پوری طرح کھلا بھی نہ چھوڑ و کہ اس کے بعد ملامت زدہ اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

اس لیے جس طرح قرض کی وجہ سے آدمی اپنا کھانا پینا اور دیگر اخراجات محدود کرتا ہے تاکہ قرض کی ادائیگی کے لیے رقم بچائی جا سکے، اسی طرح صدقہ وخیرات کو بھی محدود کرنا چاہیے۔ اس کو بھی اس حد تک رکھنا چاہیے کہ قرضوں کی ادائیگی متاثر نہ ہو۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۸ء)

سود سے پاک قرض اسکیم

سوال: انگلینڈ میں مکانات خریدنے کی عام صورت سود پر قرض حاصل کر کے لینے کی ہے۔ کوئی مسلم یا اسلامی ادارہ شراکت یا مضاربت کی بنیاد پر یہ کام کرنے کی ضرورت یا منفعت محسوس نہیں کرتا۔ ایسے میں ایک صورت یہ سامنے آتی ہے کہ کچھ ہاؤسنگ ایسوسی ایشن خریدار کے ساتھ مل کر مکان خریدتی ہیں۔ مثلاً خریدار ایک لاکھ پونڈ کا مکان خریدنے کے لیے پسند کرتا ہے۔ یہ مکان ہاؤسنگ ایسوسی ایشن کے پاس رہن ہوتا ہے۔ خریدار مثلاً ۱۰ ہزار پونڈ ادا کرتا ہے، باقی ۹۰ ہزار ایسوسی ایشن ادا کرتی ہے۔ مکان کا مارکیٹ میں کرایہ ۵ سو پونڈ متعین کیا جاتا ہے۔ خریدار ۹۰ ہزار اصل کی واپسی کے ساتھ، کرایے کا ایسوسی ایشن کا ۹/۱۰ حصہ بھی ماہانہ ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور سود نہیں ہے۔ ایسوسی ایشن کو کچھ رقم حکومت کی جانب سے بصورتِ گرانٹ ملتی ہے۔ معلوم نہیں کہ ایسوسی ایشن کتنی رقم کس بینک سے کس شرح پر قرض لیتی ہے۔ کیا اس قسم کی شراکت کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسوسی ایشن کے مکمل حصے کا ماخذ کیا ہے؟ اگر یہ ماخذ بنک کے سود پر مبنی رقم ہو تو کیا پھر بھی یہ شراکت جائز ہے؟

جواب: آپ نے انگلستان میں مکان کی مشکل حل کرنے کے سلسلے میں جس ہاؤسنگ ایسوسی ایشن اور اس کی اسکیم کا ذکر کیا ہے وہ شراکت کی ایک صورت ہے، اور ایک شریک کا دوسرے شریک سے اپنے حصے کا کرایہ وصول کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ایک شریک، جس نے مکان کی مالیت کا ۹/۱۰ حصہ دیا ہے، جب اپنا اصل زر واپس لے لیتا ہے اور اس کے ساتھ اپنا سرمایہ واپس ملنے تک کرایے کی شکل میں اضافہ وصول کرتا ہے تو مکان کی ملکیت، اصل خریدار کو منتقل کر دیتا ہے یعنی اپنی ملکیت اپنے شریک کو منتقل کر دیتا ہے۔ یہ سود سے بچنے کی ایک شکل ہے اور اگر انگلستان کے حالات میں اس پر عمل کیا جائے تو صحیح ہے۔

پاکستان میں بھی اس قسم کی ہاؤسنگ اسکیم کا نقشہ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے حکومت کو دیا تھا جس پر پہلے صحیح شکل میں عمل کیا جاتا رہا ہے۔ بعد میں اسے سودی بنا دیا گیا۔ یہ سودی اس صورت میں بن جائے گا جب اسے شراکت کے بجائے قرض کی شکل قرار دیا جائے کہ مکان کا ضرورت مند، ہاؤسنگ ایسوسی ایشن سے ۹۰ ہزار روپے قرض لے اور قرض پر ماہ بہ ماہ کرایے کی شکل میں سود ادا کرے۔ اگر صورت اس طرح ہو کہ مکان ایسوسی ایشن اور ضرورت مند دونوں کا مشترکہ ہو۔ دونوں مقررہ رقم کے حصص کے تناسب سے مکان کے حصے دار ہوں، اور مکان ضرورت مند کے قبضے میں دے دیا جائے۔ وہ اپنے حصے کے تناسب سے مفت رہایش رکھے اور ایسوسی ایشن کی ادا کردہ قیمت کے تناسب سے مکان کے حصے کا کرایہ ادا کرے تو یہ صورت جائز ہے۔ ایسوسی ایشن نے ضرورت مند پر یہ احسان کیا کہ اپنی رقم وصول ہونے کے بعد مکان کے اپنے متناسب حصے میں مالکانہ حق ضرورت مند کو منتقل کر دیا، بغیر اس کے کہ ایسوسی ایشن کو کوئی نقصان ہوتا۔ اس نے اپنے حصے کا عوض منافع کے ساتھ وصول کر لیا۔ گویا زیادہ قیمت پر اپنا مکان ضرورت مند کو فروخت کر دیا۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ ایسوسی ایشن کا روپیہ بنک سے نہ لیا گیا ہو، وہ روپیہ ایسا ہو جس پر سود کی ادائیگی نہ کرنی پڑے۔ جس سے شراکت کرنا ہے اس کے بارے میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کی کمائی حلال ہے یا حرام۔ یہ معلوم کیے بغیر شراکت کرنا صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۹ء)

نقد اور ادھار قیمت میں فرق

سوال: کپڑے کی مارکیٹ میں ایک شخص کی کچے (Unfinished) کپڑے کی ایجنسی ہے۔ وہ شخص خود کپڑا نقد خریدتا ہے اور اس کی ایجنسی سے ایسے لوگ خریدتے ہیں، جو اس کو مکمل طور پر تیار پختہ (finished) حالت میں بازار میں فروخت کرتے ہیں۔ ایجنسی والا ایسے خریداروں کے ساتھ مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں معاملہ کرتا ہے:

۱- بازار میں کپڑا نقد پر ۲۰ روپے گز ہو اور خریدار دس روز بعد ۲۱ روپے گز اور ۲۰ روز بعد ۲۲ روپے گز کے حساب سے ادائیگی کرے۔

۲- نقد کا معاملہ سرے سے نہ ہو اور ادھار پر صورتِ معاملہ وہی ہو جو اوپر لکھی ہے۔

۳- گاہک ۱۰، ۲۰ یا ۳۰ روز کے لیے ادھار لے اور مقررہ وقت پر ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں قیمت میں اضافہ کر دیا جائے۔

جواب: سودی کاروبار کرنا یا ایسا طریقہ اختیار کرنا جو سودی لین دین کے لیے حیلہ بازی کی حیثیت رکھتا ہو، صحیح نہیں ہے۔ نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کرنا جائز ہے لیکن رقم طے شدہ ہو۔ مبہم اور اگر مگر کی شکل میں نہ ہو بلکہ مدت اور رقم دونوں طے ہوں۔ پھر اگر رقم مقررہ مدت پر ادا نہ کی جائے تو اس میں اضافہ کسی بھی صورت میں نہ ہو۔

آپ نے جو صورتیں لکھی ہیں ان میں سے پہلی اور دوسری صورت جائز ہے بشرطیکہ بات مبہم نہ ہو۔ یہ نہ کہا جائے کہ اگر دس بارہ دن بعد ادائیگی ہوئی تو یہ شرح ہوگی اور بیس دن بعد ادائیگی ہوئی تو یہ شرح ہوگی بلکہ دونوں میں سے ایک بات طے شدہ ہو۔ مثلاً یوں کہ ادائیگی بیس دن بعد ہوگی اور رقم اتنی ہوگی۔ نیز کاروبار کو مستقلاً ادھار کی شکل میں جاری کرنا تاکہ ہمیشہ زیادہ منافع حاصل کیا جائے، صحیح نہیں ہے۔ اس صورت میں گاہک زیادہ رقم دینے پر مجبور ہوگا۔ وہ ادھار خریدے گا اور مہنگا خریدے گا۔ یہ طریقہ اسلامی اخلاق کے منافی ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۹ء)

مکان کی خریداری پر سود

سوال: یہاں انگلستان میں تقریباً دس لاکھ مسلمان مع اہل وعیال مستقل طور پر آباد ہیں۔ رہایش کے لیے وہ یا تو خود مکان خریدتے ہیں یا کرایے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں کچھ مشکلات ہوتی ہیں۔

جو حضرات خود مکان خریدتے ہیں وہ لازماً بنک یا بلڈنگ سوسائیٹیوں سے مکان رہن (mortgage) کے طور پر لیتے ہیں۔ اور ماہوار مقررہ حساب سے پندرہ، بیس یا پچیس سال میں یہ قرضے مع سود ادا کرتے ہیں۔ اس طرح انھیں مکان کی ملکیت بھی حاصل ہوتی ہے اور خود اپنے مکان میں رہنے کی آسانیاں بھی میسر ہوتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ بنک یا بلڈنگ سوسائیٹیوں سے قرضے لیے بغیر پوری قیمت نقد چکا کر مکان خریدنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ مگر ایسی صورت میں یہ حضرات سود دینے کی بہت بڑی شرعی حرمت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف جو حضرات کرایے کے مکانوں میں رہتے ہیں انھیں ماہوار کرایے میں جو رقم ادا کرنی پڑتی ہے وہ عموماً اس رقم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو مکان خریدنے کی صورت میں بنک یا بلڈنگ سوسائٹی کو ماہوار بطورِ قسط ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح یہ پہلے گروہ کی بہ نسبت مادی طور پر بہت ہی بڑے خسارے میں ہوتے ہیں۔ مزید برآں بسا اوقات کرایے کے مکان مقامی کونسل کے بڑے فلیٹوں میں ہوتے ہیں جس کی بنا پر عورتوں کے لیے پردے کی پابندی میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں اور یہ صورتِ حال اور بھی بہت سی شرعی واخلاقی قباحتوں کی موجب بنتی ہے۔ پھر فلیٹوں میں چونکہ حالت یہ ہوتی ہے کہ بہت سے انگریز اور دوسرے غیر مسلموں کے اندر اکا دکا مسلمان ہوتے ہیں اس لیے فلیٹوں کی خاص مشکلات اور پابندیوں کی وجہ سے رات کے وقت آزادانہ نقل وحرکت اور عشا وفجر کی

جماعت کے لیے مسجد آنے جانے میں دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا صورت حال کی روشنی میں براہ کرم یہ بتایئے کہ منشاے شریعت کے مطابق یہاں کے مسلمان اپنی رہایش کے لیے کون سی صورت اختیار کریں؟

جواب: دار الحرب یا دار الکفر میں مسلمان شرعاً کافر کو سود نہیں دے سکتا اور اس پر محقق علما کا اتفاق ہے۔ البتہ حربی کافر سے دارالحرب میں سود لینے کی اجازت بعض علما نے اس توجیہ کے ساتھ دی ہے کہ حربی کافر کا مال دار الحرب میں اس کی رضامندی سے لینا جائز ہے نہ کہ اس بنا پر کہ سود لینا جائز ہے۔ اس لیے مکان بنانے کی خاطر سود پر رقم لینے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کرایہ پر مکان لے کر رہنے میں جو مشکلات آپ نے بیان کی ہیں وہ اپنی جگہ، لیکن جن مسلمانوں نے دار الحرب میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے، انھیں اس طرح کی مشکلات سے خلاصی کی تدابیر نکالنے کا فرض بھی ادا کرنا ہوگا۔ مسلمان باہمی مشورے سے ایسی صورتیں نکال سکتے ہیں جنھیں اختیار کرنے سے وہ مشکلات پیش نہ آئیں جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمان ایسی کواپریٹو سوسائٹیاں تشکیل دیں جو اپنے مسلمان بھائیوں کو مکان بنانے کے لیے غیر سودی قرضے جاری کریں۔ اس سلسلے میں یوکے اسلامک مشن نے ایک لائحہ عمل تجویز کیا ہے، اس پر عمل درآمد کرنا چاہیے اور انگلستان کے مسلمانوں کو اس میں سرگرمی سے حصہ لینا چاہیے۔ مذکورہ سکیم کی تفصیلات آپ یوکے اسلامک مشن کے مرکزی دفتر واقع لندن سے حاصل کرسکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۸۳ء)

ٹریکٹر کے لیے بنک سے قرض

سوال: عرض ہے کہ مجھے ٹریکٹر کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ ایک زمین دار کے لیے لازمی اور ضروری ہے، مگر موجودہ دور میں سودی قرضے کے بغیر ایسا ممکن نہیں جب کہ مسلمان کے لیے سود حرام

ہے۔اب جوصورت پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ زرعی بنک سے جو قرضہ لیں اس کا سود نہیں ہے۔اس بنا پر ہمارے جماعتی دوستوں نے زرعی بنک سے قرضہ لیا مگر مجھے ان کے اس طریقہ کار پر شک ہے۔

مقامی زرعی بنک کے منیجر نے معاملے کی تفصیل اس طرح بیان کی:

ہم لوگ جب قرضہ جاری کرتے ہیں تو اس پر ۱۲ فیصد سود لیتے ہیں جو آج کل مارک اپ سکیم کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ہمیں ملازمین کو تنخواہ دینی ہوتی ہے۔ باہر سے جو قرضہ ہم حاصل کرتے ہیں اس پر بھی سود دینا پڑتا ہے۔اس وجہ سے یہ رقم قرض کی اصل رقم میں جمع کر دیتے ہیں جس سے ٹریکٹر خریدا جاتا ہے۔ پھر برابر اقساط مقرر کرتے ہیں۔اگر ادائیگی میں توازن نہ ہو تو ۳ فیصد مزید سرچارج بھی وصول کرتے ہیں۔ پہلے کی نسبت اب سود در سود نہیں لگاتے ،صرف جو سود پہلے لگ جاتا ہے اس کو وصول کیا جاتا ہے۔

مہربانی فرما کر مندرجہ بالا مسئلے پر غور فرمائیں اور اس مسئلے کی شرعی پوزیشن واضح فرمائیں۔

جواب: اسلامی نظریاتی کونسل نے بنک کے لیے جو غیر سودی منافع بخش کام تجویز کیے ہیں ان میں سے ایک کام یہ تجویز کیا ہے کہ وہ لوگوں کو سودی قرضے دینے کے بجائے وہ چیزیں فروخت کردے جن کے حصول کے لیے انھیں قرضہ درکار ہے۔مثلاً ٹریکٹر کے لیے کسی نے قرضہ مانگا ہے تو بنک قرض لینے والے سے کہے کہ ہم سے ٹریکٹر خرید لو اور بنک ٹریکٹر کی اصل قیمتِ خرید پر اپنا منافع لگا کر ٹریکٹر فروخت کرے۔ بنک ٹریکٹروں کی کمپنی کے ساتھ پہلے سے معاملہ طے کرے اور اس سے ٹریکٹر خرید لے۔ کمپنی بنک کے لیے ٹریکٹر الگ کر دے اور بنک کے کہنے پر وہ بنک کی طرف سے خریدار کو دے دیں۔ بروقت ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں جرمانہ بنک کے بجائے حکومت لگائے بشرطیکہ وہ سمجھتی ہو کہ جرمانہ لگانے کی معقول وجوہ موجود ہیں۔لیکن عملاً اس طرح سے نہیں ہو رہا، اس لیے بنک سے کہا جائے کہ یا تو وہ ٹھیک اسی طرح سے اس کاروبار کو شروع کرے جس طرح نظریاتی کونسل نے اس کی سفارش کی ہے۔ بصورتِ دیگر دھوکے سے سودی کاروبار کو غیر سودی نام سے جاری رکھنے کا کیا فائدہ ہے۔آپ نے جو تفصیل ذکر کی ہے اور بنک

منیجر نے جس طرح سے اسے واضح کیا ہے اس کی رو سے یہ سودی معاملہ ہے۔ اس طرح سے ٹریکٹر کا لین دین سودی لین دین شمار ہو گا۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۸۶ء)

بولی والی کمیٹی

سوال: چند تاجر مل کر اس طرح 'کمیٹی' ڈالتے ہیں کہ تمام شرکا برابر کی رقم ادا کرتے ہیں۔ اس طرح کل جمع شدہ رقم پانچ لاکھ ہو جاتی ہے اور یہ ہر ماہ کسی ایک کو دے دی جاتی ہے لیکن بذریعہ قرعہ اندازی یا کسی کی ضرورت کے تحت نہیں، بلکہ یہ رقم میز پر رکھ دی جاتی ہے اور ممبران سے کہا جاتا ہے کہ نیلامی کی طرح بولی لگائیں۔ اس طرح جو ممبر سب سے زیادہ بولی لگاتا ہے 'کمیٹی' کی رقم اس کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ہر ماہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔ پہلی دو، تین کمیٹیوں کی بولی ۵۰، ۶۰ ہزار تک پہنچ جاتی ہے جو کہ بعد کے مہینوں میں کم ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ آخری دو یا تین مہینوں میں یہ بولی چار پانچ ہزار سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس طرح حاصل ہونے والی بولی کی رقم کو یہ تاجر منافع قرار دیتے ہیں اور تمام شرکا آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ کیا یہ سود ہے؟

جواب: کمیٹی کی رقم بولی پر لینا، پانچ لاکھ روپے لے کر اس کے عوض میں ساڑھے پانچ لاکھ روپے واپس کرنا کھلم کھلا سود ہے۔ کمیٹی کی رقم دراصل قرض ہے جو کمیٹی کا رکن وصول کرنے کے بعد واپس کرتا ہے۔ اگر اس پر اضافی رقم دی جائے گی تو یہ کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعاً فَھُوَ رِبًا (ہر قرض جس پر منافع ملے وہ سود ہے) کے اصول کی روشنی میں سود شمار ہو گی۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۹ء)

کرنسیوں کا اختلاف اور ادائیگیِ قرض

سوال: میرے والد مرحوم نے سعودی عرب میں بعض احباب سے سعودی ریال قرض لیے۔ پھر پاکستان واپس آ گئے۔ یہاں والد صاحب نے یہ رقم پاکستانی روپوں میں ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ریال کی قیمت ۷ روپے تھی، اب ۱۴ روپے فی ریال ہے۔ کیا والد صاحب کی وفات کے بعد اب ہم ریال کی پرانی قیمت کے مطابق قرض ادا کریں؟ یا ریال کی موجودہ قیمت کے مطابق پاکستانی روپوں میں قرض ادا کیا جائے گا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب: یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ والد صاحب کے ذمے عائد قرضوں کو اتارنے کی فکر میں ہیں۔ حقوق العباد کی ادائیگی انتہائی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ حق داروں کے حقوق دنیا میں ادا نہ کیے گئے تو وہ انھیں آخرت میں دلوا کر چھوڑے گا [النساء ۴: ۲۹-۳۰ وغیرہ]۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے رجسٹروں میں تین طرح کی چیزیں ہیں: ایک، وہ جن کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا، وہ شرک اور کفر ہے۔ دوسرے وہ جن کو دلائے بغیر نہیں چھوڑے گا، وہ حقوق العباد ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اللہ کی مرضی پر ہیں چاہے گا تو بخش دے گا، چاہے گا تو سزا دے گا، یہ حقوق اللہ ہیں (جیسے نماز، روزہ) [کنز العمّال]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کسی کا جنازہ لایا جاتا تھا تو آپؐ پوچھتے تھے کہ اس کے ذمے کسی کا قرض تو نہیں۔ اگر جواب ملتا کہ قرض ہے، تو آپ اس کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ تم اس کا جنازہ پڑھ لو۔ اگر کوئی شخص اس کا قرض اپنے ذمے لے لیتا، تو پھر آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیتے۔ [ترمذی، کتاب الجنائز وغیرہ] یہ اس وقت کی بات ہے جب بیت المال میں سے اس طرح کے قرضوں کی ادائیگی کی گنجایش نہیں تھی، لیکن جب بیت المال مضبوط ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کے قرضوں کو بیت المال سے ادا فرماتے تھے اور اس کے بعد نمازِ جنازہ پڑھاتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَــــنْ

تَـرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ وَ مَنْ تَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ [بخاری، کتاب النفقات وغیرہ] جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور جس نے قرض چھوڑا تو وہ میرے ذمہ ہے۔

جو لوگ اس حال میں فوت ہو جائیں کہ ان کا ترکہ ان کے قرضے کی ادائیگی کے لیے کافی نہ ہو تو اسلامی حکومت بیت المال سے ان قرضوں کو ادا کرے گی۔ جس طرح جملہ حاجت مند، فقرا، مساکین، یتامیٰ اور بے اولادوں کی کفالت بھی ایسی صورت میں حکومت کے ذمے ہے، جب کہ ان کے سرپرست یا قرابت داران کی کفالت نہ کر سکتے ہوں۔

الحمدللہ آپ اس قابل ہیں کہ اپنے والد صاحب کا قرض ادا کر سکتے ہیں اور اپنے والد کے قرضوں کو اتارنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرض کے بدلے میں قرض کے مثل چیز واپس کی جاتی ہے۔ واپسی کے وقت دیکھا جاتا ہے کہ قرض میں کیا چیز دی گئی تھی۔ جو چیز بطورِ قرض لی ہو، واپسی کے وقت اس کے مثل واپس کرنا پڑتی ہے۔ آپ کے والد صاحب نے ریال لیے تھے لہٰذا جس وقت آپ رقم واپس کریں تو ریال واپس کریں یا قرض میں لیے گئے ریالوں کے بدلے میں اتنے پاکستانی روپیہ جو ادائیگی کے وقت میں مارکیٹ ریٹ کے مطابق بنتے ہوں۔ مذکورہ طریقے کے مطابق پاکستانی روپے میں واپسی قرض خواہوں یا ان کے ورثا کی رضامندی کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ پاکستانی سکّے کے بجائے ریال طلب کریں تو انھیں ریال ہی واپس کرنے ہوں گے۔ اگر ریال نہ مل سکتے ہوں تو پھر اتنے ہی ریالوں کی مالیت میں پاکستانی روپے لینے کے حق دار ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

(ترجمان القرآن، اپریل ۲۰۰۰ء)

سود اور مجبوری کی حالت

سوال: گذشتہ دنوں ایک رسالہ پڑھنے کو ملا جس میں سود کی مذمت کے بارے میں حضورؐ کے ارشادات تھے۔ یہ ارشادات پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ رنج اس لیے ہوا کہ میرے والد سودی کاروبار کرتے ہیں۔ انھوں نے رقم بنک میں جمع کروا رکھی ہے اور اس پر سود لیتے ہیں، لیکن میں انھیں کہہ بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ مجھ سے بڑے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے والد ہیں۔ میں ایک پرائیوٹ سکول میں پڑھتا ہوں۔ مجھ پر مہینہ بھر میں ۴۰۰۰ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ آپ میری رہنمائی کریں کہ کیا میں اپنے والد کے پیسوں سے کھاؤں پیوں اور ان کے پیسوں سے پڑھوں یا نہیں؟ اور یہ کہ مجھ سے قیامت کے روز اس کے بارے میں پوچھا جائے گا یا نہیں؟ میرا کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے تو میں کیا کروں؟

جواب: خوشی ہوئی کہ آپ نے اس نوعمری میں دین کا اچھا خاصا مطالعہ کیا ہے اور کر رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علمی جذبے کے ساتھ عمل کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور اسی سلسلے میں رزقِ حلال کے لیے فکرمند ہیں۔ اس عمر میں ایسا شعور اللہ تعالیٰ کی خصوصی دَین ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور آپ سے کہوں گا کہ آپ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل میں مزید برکت پیدا فرمائے اور جو شعور آپ کو ودیعت فرمایا ہے آپ کے ذریعے گھر والوں، والدین، بہن بھائیوں، اعزہ و اقارب اور اہلِ علاقہ کو بھی عطا ہو اور ملک میں اسلامی انقلاب کے لیے ایک فوج تیار ہو جائے جو لادینی نظاموں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے اور سودی نظامِ معیشت کی بجائے اسلام کا بابرکت نظامِ معیشت قائم ہو جائے۔

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے کہ آپ کے والد صاحب بنک میں رقم رکھ کر سود لیتے ہیں اور گھر والوں کے کھانے اور آپ کی تعلیم و تربیت اور خوراک و لباس میں سودی رقم شامل ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَااسْتَطَعْتُمْ (التغابن۶۴: ۱۶)
اللہ سے اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کرو۔

آپ اس وقت بچے ہیں، اپنی کفالت کے قابل نہیں ہیں۔ آپ مجبور ہیں کہ والد صاحب جو آپ کو دیں وہ آپ استعمال میں لائیں۔ اسی طرح گھر کے دوسرے بے سہارا افراد کا یہی حال ہے۔ ایسی صورت میں آپ والد صاحب سے عرض کریں کہ وہ سودی منافع اپنے استعمال میں نہ لائیں بلکہ مضطر، فقرا اور مساکین کو دے دیں کہ یہ اس کا مصرف ہیں۔

سودی لین دین کا گناہ بے شک وہی ہے جو آپ نے تحریر کیا ہے لیکن جب ایک بیماری بڑے پیمانے پر پھیل جائے اور وبا کی شکل اختیار کر جائے تو اس وقت اگر کوئی عام آدمی اس بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس قدر موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا جس قدر عام حالات میں کوئی اپنے آپ کو عیش و عشرت کا دلدادہ بنا کر بزور بیماری کو دعوت دے اور پھر بیماری کو اپنے ذوق وشوق سے بڑھاتا چلا جائے۔ اس وقت غریب عوام کی اکثریت سودی نظام کی وبا کا اس طرح شکار ہے کہ صرف وہ آدمی اس سے بچ سکتا ہے جو ایمان و عمل کے اسلحے سے لیس ہو اور اپنے پورے وسائل وذرائع اور صلاحیت اس سے بچنے میں لگا دے۔ ایسی صورت میں عوام کو ملامت کرنے اور سب کو مطعون کرنے کی بجائے اس طبقے کو نشانہ بنایا جائے جو اس صورتِ حال کا ذمہ دار ہے۔ اربابِ حکومت، بڑے کاروباری، تجارت پیشہ سرمایہ دار، جاگیر دار، وڈیرے، بیوروکریٹ اور حکومت بنانے اور ختم کرنے میں دخیل عناصر اور معاشی اتار چڑھاؤ کے ذمہ دار اصل مجرم ہیں۔ جو احادیث آپ نے لکھی ہیں ان کا بھی اصل مصداق یہی لوگ ہیں، اگرچہ اپنے جرم کے مطابق ہر خاص و عام کا اس میں حصہ ہے۔ ایسی صورت میں آپ اپنی انفرادی کوششیں جاری رکھیں اور سودی نظام کے خلاف لوگوں کو جس قدر بھی منظم کر سکتے ہوں کریں۔ ایک دو آدمیوں کو بھی روک دیں یا صرف اپنے والد صاحب محترم کو اس سے چھٹکارا دلا دیں تب بھی بہت بڑی بات ہے۔ دراصل سودی نظام کی مزاحمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نافذ کیا ہے کہ صرف سود لینے والا ہی مجرم نہیں بلکہ

دینے والا بھی اس گناہ میں شریک ہے۔ دینے والا اگرچہ مظلوم ہے لیکن اسے اس گناہ میں اس لیے شریک کیا گیا ہے کہ ظلم اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتا جب تک مظلوم ظلم کو برداشت کرنے اور قبول کرنے سے انکار نہ کردے۔ اسلام مسلمانوں کے اندر یہ صفت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ آج اگر یہ صفت زندہ ہو جائے اور مسلمان فیصلہ کرلیں کہ وہ ظلم برداشت نہ کریں گے تو پھر کوئی حکمران، حکومت کا کوئی ادارہ یا گروہ انھیں ظلم کا نشانہ نہ بنا سکے گا۔ آج اگر تمام لوگ سود دینے سے انکار کردیں تو بنک ان کا کیا بگاڑ سکیں گے۔ کون ان سے سود لے کر بنک کو دے گا۔ پولیس، فوج یا دوسرا کوئی ادارہ کیا کر سکے گا جب کہ تمام عوام ظلم کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ ایسی صورت میں ظالم کو پسپا ہونا پڑے گا۔ سودی کاروبار کا قلع قمع اسی وقت ہو سکے گا جب ہم سب اس کے خلاف مزاحمت کریں گے۔ یہی حکم شراب اور دوسرے منکرات کا ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو بیدار کیا جائے۔ لوگوں کو جس قدر بھی آپ سودی نظام کے جال سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں اسی قدر غنیمت ہے، لیکن اس کے ساتھ آپ مایوس بھی نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ وہ بندوں کے دلوں کے حال کو جانتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کون کس قسم کے حالات میں، کس قسم کے جرم کا کس مقدار میں مرتکب ہے۔ اپنی نیت، اپنی حالت اور اپنے طرزِ عمل کے لحاظ سے ہر آدمی کا اس کے مطابق حساب و کتاب ہوگا۔ ان شاءاللہ آخرت میں ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نہیں پکڑے گا جو سودی نظام کو برا سمجھتے تھے، اس سے نفرت کرتے تھے، اس کے خلاف دعوت و تبلیغ کرتے تھے اور اسے مٹانے کے لیے کوشاں تھے۔ اس جذبے کے ساتھ آپ اپنے قدم آگے بڑھائیں۔ پاکستان اور دنیا بھر میں طاغوتی نظاموں کے خاتمے کے خلاف جو تحریک برپا ہے اس کا ہراول دستہ بنیں۔ نوجوانوں کو اس میں شامل کریں۔ ان شاءاللہ وقت آئے گا کہ اسلامی تحریک ایک طوفان بن کر باطل نظاموں کو مٹا دے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو استقامت عطا فرمائے اور اپنی بندگی اور رزقِ حلال کے راستے آسان کردے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۲۹:۶۹)
وہ لوگ جو ہماری رضا حاصل کرنے کے لیے جہاد کرتے ہیں، ہم انھیں اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کرادیں گے۔

ان شاء اللہ آپ کے لیے بھی اس جہاد کی بدولت جو آپ نے شروع کیا ہوا ہے، راستے کھلیں گے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہو۔ آمین

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۷ء)

سودی ادارے میں ملازمت

سوال: میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے والا ہوں۔ اس کے بعد جس ادارے میں بھی ملازمت ملے گی، وہاں سود کا حساب کتاب رکھنا ہوگا۔ کیا یہ میرے لیے جائز ہوگا؟

جواب: جہاں تک بنک کی ملازمت کا تعلق ہے، تو وہ ناجائز ہے لیکن دوسرے ادارے جن میں اصلاً سودی کاروبار نہیں ہوتا البتہ وہ اپنے کاروبار کو چلانے کے لیے بعض اوقات سودی قرضے بھی لیتے ہیں، ان کی ملازمت جائز ہے۔ اس لیے کہ اس ادارے کا اصل کاروبار تو غیر سودی ہوتا ہے۔ جب تک نظام میں تبدیلی نہیں آتی اس وقت تک اس طرح کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا جائے گا۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۹ء)

قرضِ متبادل پر مبنی اسکیم

سوال: قرضِ متبادل پر مبنی ایک اسکیم بلا سود بنک کاری کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اس اسکیم میں دو فریقوں کے درمیان دو ایسے بلا سود قرضوں کا تبادلہ ہوتا ہے جن کی رقم اور مدت کا حاصل ضرب برابر ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی تاجر کو سال کے لیے ۱۰ لاکھ روپے قرض چاہیے تو وہ بنک کو ایک لاکھ روپے ۱۰ سال کے لیے قرض دے۔ بنک اسی وقت اِسے ۱۰ لاکھ روپے ایک سال کے لیے قرض دے دے گا۔ تاجر ایک سال بعد بنک کو ۱۰ لاکھ واپس کرے گا اور بنک تاجر کا ایک لاکھ روپیہ ۱۰ سال بعد واپس کرے گا۔ ۱۰ سال کے دوران بنک تاجر سے لی ہوئی رقم کاروبار میں لگا کر اپنا خرچ اور منافع کمائے گا۔

قرضِ متبادل کے شرعاً جائز ہونے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

(الف) قرض کی رقم پر اضافی رقم کا حصول رِبا ہے، جو قرضِ متبادل میں نہیں ہوتا۔

(ب) حدیث کے مطابق قرضِ متبادل کا بین طور پر شرعاً جائز ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں کوئی ایسی شرط نہیں ہوتی جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرتی ہو۔

(ج) قرضِ متبادل میں کوئی مالی اضافہ کسی وجہ سے بھی نہیں ہوتا۔

(د) قرضِ متبادل میں دونوں قرضوں کی اصل رقم ہی بلا کسی اضافے کے وصول کی جاتی ہے۔

(ہ) یہ قرض مشروط بھی نہیں۔ کیونکہ اس کے دونوں قرض ایک دوسرے سے مشروط تو ہیں لیکن بیک وقت لیے اور دیے جانے کے باوجود دونوں کے عقد الگ الگ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

کیا یہ اسکیم شرعاً جائز ہے؟ یہ سودی قرض ہی کی کوئی متبادل شکل تو نہیں ہے؟

جواب: قرضِ متبادل کی پیش کردہ اسکیم قرضِ حسن کی صورت قطعاً نہیں بلکہ قرضِ مشروط بالقرض ہے۔ فریق اول (بنک) قرض لیے بغیر قرض نہیں دے گا۔ یہ صورت سود کی متفق علیہ

تعریف کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَھُوَ رِبَا کی رو سے سود ہے۔ بنکوں کے سامنے قرضِ متبادل کی اسکیم پیش کر کے یہی تصور تو دیا جا رہا ہے کہ اس اسکیم کے مطابق جتنی مدت کے لیے بنک قرض دیں گے اس میں بنک کو نفع ہے۔ تھوڑی مدت کے لیے زیادہ رقم کے عوض میں زیادہ مدت کے لیے تھوڑی رقم، جو بنک بطور قرض لیں گے، یہی تو وہ نفع ہے جو قرض کے عوض میں بنک حاصل کرے گا۔ اسے اپنے قرض کے عوض میں متبادل قرض لینے میں زیادہ نفع نہیں ملے گا جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے تو اسے سود کا متبادل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اور بنک اسے کیسے سود کا متبادل سمجھ کر اختیار کرنے کے لیے تیار ہوگا، جب کہ بنک کے لیے اس میں کوئی مالی اضافہ یا نفع بھی نہیں ہے۔ اس اسکیم میں یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ قرضِ متبادل کے دونوں قرض ایک دوسرے سے مشروط تو ہیں لیکن بیک وقت دیے اور لیے جانے کے باوجود دونوں کے عقد بالکل الگ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ہماری راے میں مشروط ماننے کے بعد سودی ہونے کی بنیاد کا اعتراف کر لیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دونوں عقدوں کی تحریریں الگ الگ ہوں۔

یہ اسکیم علما کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں ہے کہ اس میں ربا ہے یا کم از کم شِبہِ ربا ہے۔ اسی لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اسے مسترد کر دیا ہے۔ بنکوں کے لیے بھی یہ نظامِ قابل قبول نہیں اس لیے کہ بنک کا مقصد محض ربا یا ربیہ کا کاروبار نہیں بلکہ معقول مقدار میں منافع کمانا ہے جو اس اسکیم سے اسے حاصل ہوتا نظر نہیں آتا۔ ایسا منافع تو شرکت و مضاربت کی صورت میں مل سکتا ہے اور شرکت و مضاربت ہی فی الحقیقت سود سے بڑھ کر نفع بخش اسکیم ہے۔

(ترجمان القرآن، جون ۲۰۰۲ء)

بنک ملازمت

سوال: اب جب کہ موجودہ حکومت اسلامی نظام کے نفاذ کے اقدامات کر رہی ہے اور بینکوں میں بلاسود کاؤنٹر کھول دیے گئے ہیں اور امید ہے کہ مستقبل میں مزید اقدامات کیے جائیں گے۔ تاوقتیکہ پورا معاشی کاروبار سود سے پاک نہ ہو جائے، کیوں نہ لوگوں کو اور خصوصاً تحریکِ اسلامی سے وابستہ افراد کو اجازت دی جائی کہ وہ بینکوں کی سروس اختیار کریں، تاکہ وہ بھی مستقبل کے معاشی نظام کے کارآمد پرزے بن سکیں بلکہ اسے چلانے والے ہاتھ بھی وہی ہوں؟

دوسرے یہ کہ جب سے بینک قومی تحویل میں لیے گئے ہیں، بینکوں کی سروس ایک سرکاری ملازمت کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اگر سرکاری ملازم ہونے میں کوئی حرج نہیں تو پھر بینک کی سرکاری نوکری کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟

تیسرے یہ کہ حکومت کا سارا ہی کاروبار سود پر چل رہا ہے۔ مثال کے طور پر میں ٹریژری آفس میں کام کرتا ہوں اور ہمارے پاس جو اکاؤنٹ بنتا ہے اس میں سودی اور غیر سودی تمام قسم کے کھاتے شامل ہیں، اس بارے میں کیا رائے ہیں؟

چوتھے یہ کہ موجودہ دور میں حکومت خود ایک تجارتی ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ حکومت کا کوئی بھی شعبہ ہو اس میں سب سرمایہ خلط ملط ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت جو رقم اپنے محکموں کو عطا کرتی ہے وہ بینکنگ کے ذریعے دیتی ہے اور اس پر لگنے والا سود بھی وہ محکمے حاصل کرتے ہیں اور اپنے ملازموں کو تنخواہ وغیرہ ادا کرتے ہیں، نیز دفتری ضروریات پوری کرتے ہیں۔

جواب: جب تک بینکوں میں صحیح طرح سے غیر سودی نظام قائم نہیں ہو جاتا اس وقت تک ان کی آمدنی رزقِ حلال کی تعریف میں نہیں آتی۔ اب بینک میں ملازمت کرنا نہ کرنا آپ کا ذاتی فعل ہے۔ اس پر خود غور کر کے فیصلہ کریں۔

رہا آئندہ بینک کا نظام چلانے کے لیے افراد کی فراہمی کا مسئلہ، تو اسلامی نظام نافذ کرنے والوں کو ضرورت پڑنے پر ماہرین بنکاری پہلے بھی ملتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ آیندہ بھی ملتے رہیں گے۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۸۵ء)

زرِ سالانہ کی پیشگی وصولی

سوال: ایک چیز فی الحال موجود نہیں کیا اس کی بیع (خرید و فروخت) جائز ہے مثلاً دسمبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہونے والا ماہنامہ ترجمان القرآن کا شمارہ فی الحال اس دنیا پر اپنا وجود نہیں رکھتا تو کیا سالانہ زرِ خریداری ادا کر کے اس کی بیع جائز ہے؟

ترجمان القرآن کی فی شمارہ قیمت ۲۰ روپے ہے جو کہ ۱۲ شماروں کی ۲۴۰ روپے بنتی ہے لیکن سالانہ خریدار کے لیے ۲۰۰ روپے ہے۔ ۴۰ روپے بچت سود کی مد میں نہیں آتی کہ آپ نے پہلے رقم لی اور اس کو کاروبار میں لگایا بعد میں اپنی مصنوعہ (مطبوعہ) چیز کو کم قیمت پر پہلے ادائیگی کرنے والے کو دے دیا؟

جواب: بیع کی ایک صورت یہ ہے کہ چیز نقد ہو اور اس کے عوض میں رقم ادھار ہو، اور دوسری صورت یہ ہے کہ رقم نقد ہو اور چیز ادھار ہو۔

اخبارات و رسائل کے معاملے میں دونوں صورتیں رائج ہیں اور دونوں جائز ہیں۔ فریقین باہمی رضامندی سے ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر رسالے یا اخبار کی رقم کسی نے وصول کی ہو لیکن رسالہ کسی وجہ سے تیار نہ ہو سکا ہو، یا خریدار تک نہ پہنچا ہو، یا رسالہ بند ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں وصول کردہ قیمت واپس کرنا ہوگی۔ یہ ساری باتیں طے شدہ ہوتی ہیں اور رسالہ اپنے اوصاف کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے، فریقین میں تنازع کا موجب نہیں

ہوتا۔ اس بنا پر اس کے لیے بیع سلم کی صورتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے[1] اور اس کے جواز میں کسی شک وشبہے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

ایک شخص جب پیشگی رقم وصول کرنے کی صورت میں رعایت کرے تو یہ سود کے ذیل میں نہیں آیا۔ نیز رسالے کی خریداری ایک لحاظ سے بیع وشرا ہے لیکن حقیقت میں ایک مشن کو پھیلانے کے لیے باہمی تعاون ہے۔ [یہاں] درحقیقت ایک آدمی مال خرچ کر رہا ہے تاکہ وہ اس کے عوض میں خود بھی علم حاصل کرے اور دوسروں کی تعلیم کا انتظام بھی ہو۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۲۰۰۱ء)

رشوت اور مسئلۂ اضطرار

سوال: میں محکمہ خوراک میں فوڈ گرین سپروائزر کی حیثیت سے ملازم ہوں اور مرکزِ خرید گندم پر تعینات ہوں۔ حکومت نے میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں گندم کی خرید وفروخت کا مکمل حساب رکھوں اور جب افسرانِ مجاز چاہیں، یہ حساب کتاب ان کی خدمت میں پیش کر دوں۔

میری تنخواہ اس وقت سات سو روپے ہے۔ محکمۂ خوراک رشوت کے معاملے میں بدنام ہے۔ لیکن میں رشوت لینے اور رشوت دینے والے کو جہنم کا ایندھن سمجھتا ہوں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ افسرانِ بالا کی جب کوئی معائنہ ٹیم آتی ہے تو ان کی جائز وناجائز ضروریات نچلے درجے کے ملازمین کی تنخواہیں کاٹ کر پوری کی جاتی ہیں۔ یہ صورتِ حال ایک ایسے شخص کے لیے ناقابلِ برداشت ہے جو اپنے گھر سے دور محض اپنی تنخواہ میں گزر اوقات کرنا چاہتا ہو۔

ہمیں اپنی ڈیوٹی کی ادائیگی کے سلسلے میں بیوپاری حضرات سے تعاون کرنا پڑتا ہے۔ بیوپاری حضرات ہم سے باردانہ خریدتے ہیں اور اس میں مال بھر کر محکمۂ خوراک کو فروخت کر دیتے ہیں۔ جس سے انھیں لاکھوں روپے منافع ہوتا ہے۔ اس منافع کا ایک خاص حصہ ڈیپارٹمنٹ

۱- بیع سلم میں رقم پہلے ادا ہوتی ہے اور چیز بعد میں مقررہ مہینہ یا تاریخ پر ادا کرنے کا وعدہ ہوتا ہے۔

میں جمع کروا دیا جاتا ہے اور سیزن ختم ہونے پر تمام ملازمین میں یہ منافع تقسیم کر دیا جاتا ہے۔قانون اس پر خاموش ہے۔ ہمارے حصے میں آنے والی رقم کو'تعاون' کا بدل قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارا تعاون یہ ہے کہ ہم انھیں باردانہ اور دیگر اشیا ذاتی ضمانت پر دیتے ہیں اور قانون بھی اس کی ہمیں اجازت دیتا ہے۔اس مال (باردانہ) کی خراب حالت میں واپسی یا عدمِ واپسی کی صورت میں گورنمنٹ ہماری تنخواہیں کاٹ لیتی ہے۔گورنمنٹ اپنا نقصان پورا کر لیتی ہے۔ہم تنخواہوں میں ہونے والی کمی یا کٹوتی کو کس طرح پورا کریں؟ ہماری یہ حالت 'اضطراری حالت' ہے۔ہم اس حالت میں متذکرہ منافع لے کر اپنا نقصان پورا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ منافع کی پوزیشن یہ ہے کہ دینے والے خوشی سے دیتے ہیں۔ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاتا اور عدمِ ادائیگی کی صورت میں بھی انھیں قانونی تعاون فراہم کیا جاتا ہے۔

کیا ایک ایسا شخص جو رشوت لینے اور دینے پر یقین نہیں رکھتا، وہ غریب فیملی سے تعلق رکھتا ہے اور ملازمت چھوڑنا اس کے بس کی بات نہیں، اس کی حلال تنخواہ میں سے کچھ رقم کاٹ کر محض افسروں کی چاپلوسی پر خرچ کر دی جاتی ہے اور اس کے احتجاج کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا اور وہ گورنمنٹ کی ڈیوٹی ایمان داری سے ادا کرتا ہے، اور ایک پیسے کا ہیر پھیر بھی گوارا نہیں کرتا، مذکورہ بالا منافع وصول کر سکتا ہے؟

محکمۂ خوراک فلور ملوں کو گندم سپلائی کرتا ہے۔کیا محکمہ کا کوئی ملازم فلور مل سے اپنی ذاتی ضروریات کے لیے مفت آٹا لے سکتا ہے؟ جب کہ فلور مل کے مالک کی رضامندی اس میں شامل ہو۔اور محکمے کے ملازمین اس کے بدلے میں غیر قانونی تعاون فراہم نہ کرتے ہوں۔

اضطراری حالت کی تعریف کیا ہے؟ درج بالا تفاصیل کی روشنی میں اگر ہماری حالت واقعی اضطراری حالت ہے تو کیا ہم اس حالت میں متذکرہ نفع سے اپنے نقصانات پورے کر سکتے ہیں؟ کیا یہ حالت اس وقت تک برقرار رہ سکتی ہے جب تک گورنمنٹ ہماری تنخواہیں معقول سطح پر نہ لے آئے جب کہ موجودہ تنخواہ میں گذر اوقات مشکل بھی ہے اور ناممکن بھی؟

ایک عالم دین کا فتویٰ ہے کہ جرائم کا سدِّ باب حکومت کا فرض ہے۔کسی بھی جرم کے اسباب کو

ختم کرنے سے پہلے مجرم کو سزا دینا قطعاً جائز نہیں ہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

جواب: ملازمت سے جو منافع حقوقِ ملازمت یا قانونِ ملازمت کے مطابق نہ ملے، ناجائز مال کی تعریف میں آتا ہے۔ اس لیے اس سے اپنا دامن بچانا ضروری ہے۔ جو تاجر ملازمین کو باردانے کے عوض میں منافع تقسیم کرتے ہیں ان کی حیثیت رشوت کی ہے۔ اگر اس رشوت کے بغیر ملازمت سے ملنے والی تنخواہ آپ کے گزرِ اوقات کے لیے کافی نہیں ہے تو کوئی دوسری ملازمت تلاش کر کے اسے چھوڑ دیں۔

محکمۂ خوراک کا کوئی ملازم فلور ملوں سے اپنی ذاتی ضروریات کے لیے مفت آٹا وصول کرے تو وہ بھی رشوت کی تعریف میں آئے گا۔

محکمے کے دو معاملے ایسے ہیں جو ظلم کی تعریف میں آتے ہیں۔ مگر محض ان کی وجہ سے حالتِ اضطراری پیدا نہیں ہوگی۔ پہلا ظلم یہ ہے کہ باردانے کے تھیلوں کا نقصان وہ بے گناہ ملازمین پر ڈالتا ہے اور دوسرا یہ کہ افسروں کے دوروں وغیرہ کے اخراجات ماتحتوں سے وصول کیے جاتے ہیں۔ اس دوگونہ ظلم کے تدارک کی مساعی مختلف اطراف سے ہونی چاہیے۔ مگر مسئلۂ اضطرار الگ ہے۔

اضطراری حالت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص کے لیے رزقِ حلال کے دروازے بند ہو جائیں، کوئی ایسی ملازمت نہ ملتی ہو جس کے ذریعے حلال روزی حاصل کی جا سکے اور اپنی اور اپنے اہل وعیال کے نان ونفقہ کے لیے حلال مال میسر نہ ہو سکتا ہو، اس تعریف کی رو سے آپ ابھی حالتِ اضطرار میں نہیں ہیں کیونکہ ایسی ملازمت مل سکتی ہے جس میں خود آپ کو حرام کا ارتکاب نہ کرنا پڑتا ہو اور اس کے عوض میں آپ کو اتنی تنخواہ مل سکتی ہو کہ آپ کا گذرِ اوقات ہو سکے۔

جرم کے اسباب کا انسداد بھی ضروری ہے اور مجرم کو اس کے جرم کی سزا دینا بھی ضروری ہے۔ اگر ایک حکومت مجرم کو سزا دیتی ہے لیکن اسبابِ جرم کا انسداد نہیں کرتی تو اس کی طرف سے مجرم کے سزا دینے کے عمل کو درست قرار دیں گے لیکن اسبابِ جرم کا انسداد نہ کرنے کو ظلم سے تعبیر کریں گے۔ جس طرح مجرم نے جرم کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اسی طرح حکومت نے بھی

انسدادِ جرم نہ کر کے اس پر ظلم کیا ہے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۸۷ء)

کم قیمت پر جبراً خریداری

سوال: میری اراضی پانچ کنال تیرہ مرلے کاروباری علاقے میں واقع ہے جس کی قیمت موجودہ حالات کے مطابق چار لاکھ روپے فی کنال کے حساب سے ۲۲ لاکھ ساٹھ ہزار روپے بنتی ہے۔ میونسپل کمیٹی اسے بطورِ قبرستان استعمال کرنا چاہتی ہے۔ وہ انگریز کے زمانے کے قانون کا سہارا لیتے ہوئے نہایت ہی قلیل قیمت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ کیا میونسپل کمیٹی کا یہ اقدام شرعاً درست ہے؟

جواب: وفاقی، صوبائی یا مقامی حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی شخص کی چیز کو برائے نام قیمت پر جبراً خرید لے۔ میونسپلٹی اگر کسی شخص کی زمین رفاہی مقصد کے لیے لینا چاہتی ہے تو مارکیٹ ریٹ پر خریدے۔ قبرستان کے لیے جگہ فراہم کرنا میونسپل کمیٹی کا فرض ہے۔ اس کے اخراجات اسے برداشت کرنا چاہییں نہ کہ ایک شخص پر اس کا بوجھ ڈال دیا جائے۔ کسی ایک شخص کی زمین مارکیٹ ریٹ سے کم قیمت پر خریدنے کا مطلب یہ ہوا کہ قبرستان فراہم کرنا اس شخص کی ذمہ داری ہے اور یہ واضح طور پر غیر معقول بات ہے۔ انگریز نے اگر کوئی قانون بنایا تھا تو وہ صرف اسی حد تک قابلِ عمل ہوگا جس حد تک وہ شریعت اور عقل کے مطابق ہوگا، بصورتِ دیگر یہ غصب شمار ہوگا اور غصب کی اجازت کسی کو بھی نہیں دی گئی۔ ہدایہ میں ہے: اَلْغَصْبُ فِی الشَّرِیْعَةِ اَخْذُ مَالٍ مُتَقَوَّمٍ مُحْتَرَمٍ بِغَیْرِ اِذْنِ الْمَالِكِ عَلٰی وَجْهٍ یُزِیْلُ یَدَهٗ[1] شریعت میں غصب کے معنی ہیں، دوسرے کے قیمتی مال کو اس کی اجازت کے بغیر اس طرح سے لینا کہ مالک کا قبضہ ختم ہو جائے۔

پس یہ مذکورہ صورت غصب کا حکم رکھتی ہے، جو حرام ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۲ء)

☆......☆......☆

1۔ ہدایہ، جلد ۳، ص ۳۷۰۔

باب ہشتم

معاشرتی مسائل

ایک گھریلو الجھن

سوال: میں یہاں سعودی عرب میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں۔ سروس کے بعد حال ہی میں پاکستان جا کر شادی کر لی ہے۔ گھر والوں نے بھی اس شادی پر اپنی رضامندی اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس شادی سے ہماری بوڑھی والدہ کو کافی حد تک گھریلو کام کاج میں مدد ملے گی۔ اور یہی بات قبل از شادی گھر والوں نے میرے سسرال کو بھی بتا دی تھی کہ ہم اس رشتے سے خوش ہیں کیونکہ جہاں اس طرح ہمارے لڑکے کا گھر بسے گا وہاں اس کی بوڑھی والدہ کو بھی آرام وسکون ملے گا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ شادی کے بعد مجھے یہاں سعودی عرب آنا پڑا۔ بیوی چند دن گزار کر اپنے گھر چلی گئی اور ابھی تک نہیں آئی۔ جب گھر والوں نے بذریعہ خط مجھے مطلع کیا اور میں نے بیوی سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ چونکہ وہاں ایک تو اکیلے رہنا میرے لیے مشکل ہے اور دوسرے گھر کی آئے دن کی باتوں سے میری طبیعت پریشان ہوتی ہے۔

والدہ کا کہنا ہے کہ ان لوگوں (میرے سسرال والوں) نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ شادی سے قبل تو اس طرح کی کوئی بات نہیں بتائی کہ لڑکی اپنے ہی گھر رہے گی اور اس طرح بوڑھی والدہ کو بے سہارا چھوڑ دے گی۔ اب اگر میں والدہ کے کہنے پر کوئی قدم اٹھاتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یہ چیز کہیں خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف نہ ہو اور اگر بیوی کو کچھ نہیں کہتا اور اس کی مرضی کے مطابق اس کو اس کے اپنے گھر ہی میں رہنے دینے پر خوش رہتا ہوں تو والدہ کے حکم کی نافرمانی ہوتی ہے، کیونکہ یہ بات والدہ کو گوارا نہیں۔ امید ہے کہ اس سلسلے میں میری رہنمائی کر کے مجھے دلی سکون واطمینان سے نوازیں گے۔

جواب: بیوی کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر بلا وجہ نہ نکلے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ اسے رہائش کے لیے ایسی جگہ دی جائے، جہاں وہ پوری

آزادی سے رہ سکے اور خاوند کا گھرانا اسے کسی قسم کی تکلیف نہ دے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے: وَالنَّاشِزَۃُ لَا نَفَقَۃَ لَھَا وَ ھِیَ الَّتِیْ خَرَجَتْ عَنْ مَنْزِلِ الزَّوْجِ بِغَیْرِ اِذْنِہٖ بِغَیْرِ حَقٍّ ناشزہ کے لیے نفقہ نہیں ہے، ناشزہ وہ عورت ہے جو خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر ناحق طور پر نکل جائے۔

فَاِنْ کَانَ لِلرَّجُلِ وَالِدَۃٌ اَوْ اُخْتٌ اَوْ وَلَدٌ مِّنْ غَیْرِھَا فِیْ مَنْزِلِھَا فَقَالَتْ صَیِّرْنِیْ فِیْ مَنْزِلٍ عَلٰی حِدَۃٍ کَانَ لَھَا ذٰلِکَ لِاَنَّھَا لَاتَاْمَنُ عَلٰی مَتَاعِھَا وَ تَسْتَحِیْ اِذَا کَانَ الْبَیْتُ وَاحِداً فَاِنْ کَانَتْ دَاراً فِیْھَا بُیُوْتٌ وَّ اَعْطٰی لَھَا بَیْتاً تُغْلِقُ وَ تَفْتَحُ لَمْ یَکُنْ لَھَا اَنْ تَطْلُبَ بَیْتاً آخَرَ اِذَا لَمْ یَکُنْ ثَمَّۃَ اَحَدٌ مِّنْ اَحْمَآءِ الزَّوْجِ یُؤْذِیْھَا اگر ایک شخص کی والدہ، بہن یا دوسری بیوی کی اولاد بھی اسی گھر میں ہے اور بیوی مطالبہ کرے کہ مجھے الگ مکان دو تو اس کا یہ مطالبہ درست ہوگا، اس لیے کہ اسے اپنے ساز و سامان کی حفاظت کی خاطر اور کسی جھجک کے بغیر رہنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ جب مکان میں ایک ہی کمرہ ہو تو اسے الگ مکان کے مطالبے کا حق ہے، لیکن کمرے کئی ہوں اور ایک کمرہ اسے مکمل طور پر دے دیا جائے اور اس کے پاس اس کے تالے کی چابی بھی ہو تو اس صورت میں وہ الگ مکان کا مطالبہ نہیں کرسکتی بشرطیکہ وہاں خاوند کے ایسے رشتہ دار نہ ہوں جو اسے تکلیف پہنچائیں۔

بچی کی شادی کر دینے کے بعد ماں باپ اس کی رہایش کے ذمہ دار نہیں، ان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اسے اپنے گھر رکھیں، البتہ بچی کی حفاظت کی خاطر ایسا کرنا ضروری ہو تو خاوند کی اجازت سے ایسا کرنا چاہیے، آپ بھی اس مسئلے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ بیوی کی حیثیت خادمہ کی نہیں ہوتی۔ خاوند کے ماں باپ کی خدمت کرنا اس کی ذمہ داری نہیں ہے، البتہ ایک اخلاقی خوبی ہے۔ آپ اپنی بیوی کو اس مقام تک پہنچانے کے لیے نعیم [صدیقی] صاحب کی بتلائی ہوئی حکمتِ عملی کو اپنا لیں، ان شاءاللہ کامیابی ہوگی۔[1]

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۸۴ء)

۱- یہ معاملہ ایسا نہیں کہ ایک، دوٹوک شرعی حکم سے حل کیا جاسکے۔ یہ ہماری موجودہ معاشرت کی پیچیدگیاں ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صبر و حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چند ضروری باتیں میں نمبروار لکھتا ہوں ان پر غور کریں اور اپنی زیرِ تشکیل ازدواجی زندگی کو ابتدا ہی میں خراب نہ کرلیں ←

جہیز کی مسنون صورت

سوال: مندرجہ ذیل امور کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں:

۱- ہمارے ہادیِ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹیوں کو جہیز میں کیا دیا تھا؟

← ۱- ہمارا معاشرہ مشترک خاندانی نظام (JOINT FAMILY SYSTEM) سے نکل کر ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے، کچھ خاندان بالکل بے راہ روی پر اتر آئے ہیں، کچھ میں والدین اور اولادوں تک کے تعلقات کمزور ہو چکے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرح معمولی پیچیدگیوں سے دوچار ہیں۔ مسائل کو حل کرنے کے لیے اس صورتِ حال کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

۲- ساس اور بہو کے قضیوں سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ پہلے ان کی دوسری شکل تھی اور بہو ساری ناخوشگواریاں برداشت کر کے خدمت کرتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ یا تو اس کے احساسات کی تلافی شوہر کی خاص رفاقت ومحبت سے ہونے لگے، یا وہ ٹی بی وغیرہ بیماریوں کی شکار ہو کر رخصت ہو جائے۔

۳- آج کی لڑکیوں سے خواہ وہ طبعاً کتنی ہی نیک نہاد اور مسلم مزاج ہوں، یہ توقع رکھنا کہ وہ ہر طرح کی باتیں تنقید وتعریض اور ڈانٹ ڈپٹ سن کر چپ چاپ شوہر کے والدین کی خدمت کرتی رہیں گی، کچھ زیادہ درست نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ ان کو عملاً شوہر کی محبت کا سرمایۂ تسکین بھی حاصل نہ ہو۔ آج کل اپنی اولادوں سے بھی اچھا طرزِ عمل اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ ان سے پیار کیا جائے، ان کے اچھے کاموں کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی جائے اور ان کی پسند وناپسند کی خواہ مخواہ مخالفت نہ کی جائے، (مثلاً یہ جوتا جو خریدا ہے یہ تو بہت فضول سا ہے، یا تمھارے کوٹ کا رنگ یا بچی کی پسندیدہ چھینٹ تو بہت گھٹیا ہے وغیرہ)۔ محبت اور پیار اور کشش کا ماحول پیدا کر کے ہی والدین یا کوئی والدہ اپنی بہو سے حسنِ سلوک کا جواب حاصل کر سکتی ہے۔

۴- ہندوستانی معاشرے کے مروجات کا جو اثر ہم پر پڑا ہے اس سے اوپر بلکہ سیدھے دورِ نبوت کے معاشرے تک ہم جا پہنچیں تو وہاں روایت یہ تھی کہ جہاں کوئی نکاح ہوا، فوری طور پر نیا گھر بس گیا۔ چاہے خیمہ لگا کر ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے ہاں یہ طرزِ عمل جاری نہ ہو سکا، مگر اب حالات نے جو سبق ہمیں دیے ہیں انھوں نے تبدیلیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا حال میں جانتا ہوں۔ اس کے شادی شدہ بیٹے شروع ہی سے الگ گھروں میں اس کے اصرار سے اپنی بیویوں کے ساتھ رہنے لگے، ابتدا میں وہ دل گرفتہ بھی ہوئے، مگر بہت جلد اس نئی زندگی نے انھیں خاص تسکین دی۔ اب صورتِ حال یوں ہے کہ دوسرے چوتھے دن وہ والدین کے ہاں مع بال بچوں کے آتے ہیں اور خوب خوش وخرم کچھ وقت گزارتے ہیں۔ ساس اور بہو والی کوئی بات نمودار نہیں ہوتی۔ ماں باپ ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ ان کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ سوائے امورِ شرعیہ کے والدین نے ہر معاملے میں ان کی تعریف وتحسین کی اور یہی حال ان کی اولادوں کا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی بیماریوں میں خبر گیری بھی کرتے ہیں اور بوقتِ ضرورت خوشی خوشی خدمت بجالاتے ہیں۔ ←

۲- کیا بیٹی کے نکاح پر اعزہ سے تحائف وصول کرنا یا والدین کا اپنی بیٹی کو جہیز دینا، جبکہ وہ اس کو وراثت میں بھی حصہ دیں، جائز ہے یا ناجائز؟

۳- ہمارے ایک دوست ہیں وہ جہیز دینے والے کو سورۂ نساء کی ابتدائی آیات بالخصوص آیت:

وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا (المائدہ ۵:۱۴) [اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا، اسے اللہ آگ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے] کی رو سے ابدی جہنمی قرار دیتے ہیں۔ اس کی وضاحت فرمائیں کہ ابدی جہنمی کون کون لوگ ہیں؟

جواب: بیٹی کو گھر سے رخصت کرتے ہوئے کوئی چیز عطیہ کے طور پر دینا اچھی بات ہے۔ اس میں نمود و نمایش نہیں ہونی چاہیے اور اولاد میں سے دوسروں کی حق تلفی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح استطاعت سے زیادہ بھی نہیں دینا چاہیے، جیسا آج کل رواج ہے۔ شریعت کا اصول ہے

← ۵- آپ یہ سمجھیں کہ اصلاً ماں کی خدمت کرنا خود آپ کا فرض ہے۔ آپ کی بیوی جس نے ابھی بیوی بن کر کچھ وقت گزارنے کا تجربہ بھی نہیں کیا، براہِ راست 'خدمت' اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔

۶- آپ کی بیوی نے جب آپ کو لکھا ہے کہ وہ تنہائی محسوس کرتی ہے یعنی دل کی باتیں بے تکلفی سے نہیں کر سکتی اور پھر یہ کہ اسے کچھ باتیں سنی پڑتی ہیں کہ جن کی اگر وہ توضیح کرے تو اس معاشرے کے معمولات کے مطابق اس پر جواب دینے اور زبان چلانے کا الزام آئے تو آپ کو چاہیے تھا کہ اس کے جواب میں آپ اسے اپنی محبت و ہمدردی کا یقین دلاتے اور تسلی دیتے کہ یہ دور عارضی ہے، وہ جس طرح خوش ہے اس طرح رہے۔ دوسری طرف آپ والدہ کو خط میں اپنی فرماں برداری کا یقین دلاتے ہوئے لکھتے کہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ حالات درست ہو جائیں تو اس طرح شاید آئندہ کے لیے بہتری کی صورت پیدا ہو جاتی۔

۷- سب سے بڑا مسئلہ بیوی کے حقوق اور والدہ کے حقوق میں توازن قائم کرنے کا ہے۔ دونوں طرف سے جو متفرق باتیں سامنے آئیں انھیں خوبصورتی سے ٹال جائیں اور کسی چیز کو وجہ نزاع نہ بننے دیں۔ نیز کسی ایک فریق کی طرف داری اختیار کر کے سارا جرم دوسرے فریق پر نہ ڈال دیں۔

۸- یہ سب کچھ اگر ممکن نہ ہو تو پھر یہ سارا کھیل کسی فتوے کے زور پر حل نہیں ہو سکتا۔

احتیاطاً میں یہ خط شعبۂ استفسارات کے ناظم صاحب کے حوالے کر رہا ہوں تاکہ اگر وہ کوئی چیز درست کرنا چاہیں یا اضافہ کرنا چاہیں یا کوئی حکم بتانا چاہیں تو آپ کو لکھیں۔ میرا خط تو ایک دوستانہ مشورے کی نوعیت رکھتا ہے۔ (نعیم صدیقی)

کہ مالک اپنے مال میں جائز تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اولاد پر خرچ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ جب تک نصِ صریح سے ثابت نہ ہو کہ باپ اپنی بیٹی کو رخصتی کے وقت کچھ نہیں دے سکتا، اس وقت تک جہیز کے عدمِ جواز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اپنے دوست کے حوالے سے سورۂ نساء کی ابتدائی آیات خصوصاً آیت ۱۴ کا جو حوالہ دیا ہے وہ موضوع سے غیر متعلق ہے۔ جہاں تک حضرت فاطمہؓ کے جہیز کا تعلق ہے تو طبقات ابنِ سعد اور مسند احمد کی روایات کی روشنی میں حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کے موقع پر آپؐ کو جو جہیز دیا گیا وہ [ان اشیا پر مشتمل تھا:] ایک چارپائی، ایک بڑی چادر، چمڑے کا تکیہ (جو کھجور کی چھال یا خوشبودار گھاس اذخر سے بھرا ہوا تھا)، ایک مشکیزہ، دو گھڑے اور ایک آٹا پیسنے کی چکی۔[1]

سورۂ نساء کی مذکورہ آیات میں تو کفار کو جہنمی قرار دیا گیا ہے، اور ان لوگوں کو بھی جو اسلامی نظام کو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ اپنے دوست کو سمجھائیں کہ بلا علم فتاویٰ جاری نہ کریں۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۳ء)

رسومات میں غیر اسلامی امور

سوال: میری اور میرے ہم خیال احباب کی کوششوں سے ہماری برادری نے غیر شرعی اور غیر اسلامی رسم ورواج کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن خوشی اور غم کے وہ مظاہرے جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں، مباح ہیں اور ہمارے کلچر کا حصہ ہیں، ان کو باقی رکھنے کا ارادہ ہے۔ ہماری برادری میں جب لڑکی کے والدین، لڑکے کے والدین سے شادی کا وعدہ کر لیتے ہیں تو منگنی کی رسم ہوتی ہے۔ لڑکے والے مٹھائی لے کر لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں جو اپنی حیثیت کے مطابق خاطر مدارت کرتے ہیں اور مٹھائی میں اضافہ کر کے واپس کر دیتے ہیں۔ یہ مٹھائی منگنی کی شہرت کے لیے عزیزوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ لڑکا اور

۱- مسند احمد، ج ۱، ص ۱۵۴، مسندات علی۔ طبقات ابن سعد، ج ۸، ص ۱۴، ذکر سیدۂ فاطمہ۔

لڑکی پورے کنبے اور بعض اوقات برادری کی موجودگی میں ایک صوفے پر بیٹھتے ہیں۔ لڑکا لڑکی کو انگوٹھی پہناتا ہے، اس کے بعد عام طور پر لڑکی اس لڑکے سے پردہ شروع کر دیتی ہے۔ منگنی کی تقریب میں فریقین مالی طور پر زیرِ بار ہوتے ہیں۔ اس نقصان کو پورا کرنے اور خوشی میں شریک ہونے کے لیے قریبی عزیز دونوں کو تحفے دیتے ہیں اور کچھ نقدی دیتے ہیں جس کو سلامی کہتے ہیں۔ اس میں جو رواج شریعت کے خلاف ہو اس کی نشان دہی کیجیے تاکہ ہم برادری کے فیصلے کے مطابق ان کو چھوڑ دیں۔

جواب: آپ نے اپنے خاندان میں شریعت قائم کرنے کا جو عہد کیا ہے یہ نہایت مبارک قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی علمی اور عملی رہنمائی بھی فرمائے اور ایسی استقامت دے جو دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے۔

شادی بیاہ کی رسموں میں اسراف وتبذیر اور فخر ومباہات اور قرضوں کے بوجھ تلے دبا دینے والا معاملہ درست نہیں ہے۔ منگنی کے موقع پر استطاعت کے مطابق لڑکے والے لڑکی والوں کے ہاں مٹھائی لے کر آئیں تو درست ہے۔ مٹھائی تقسیم کرنا اور کھانا بطور مہمان کے کھانا صحیح ہے۔ تحفوں کا تبادلہ بھی صحیح ہے۔

لڑکے اور لڑکی کو شادی سے پہلے منگنی کے موقع پر ایک صوفہ پر بٹھانا صحیح نہیں ہے۔ یہ خلاف شرع ہے، اس لیے اس رسم کو چھوڑ دیا جائے۔ ایسے موقع پر دولہا یا دلہن کو تحفہ دینا، یا ہدیہ دینا صحیح ہے، لیکن نیت یہ نہ ہو کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ جس نے ہدیہ دیا ہے، کل اگر اسے شادی کے موقع پر ہدیہ نہ دیا جائے اور حالات اجازت نہ دیتے ہوں کہ وہ بھی بدلے میں ہدیہ دے تو اس پر ناراضی نہ ہو۔ ہدیوں کو کھلے عام دینے کی روایت کی بجائے انفرادی طور پر رازدارانہ طریقے سے شادی سے پہلے دے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ تاہم کھلے طریقے پر دینے کی بھی ممانعت نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اخلاص ہو اور عوض کی طلب نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسے لوگوں کی مساعی کو قبول فرمائے اور اصلاح کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اسے کامیابی سے ہمکنار فرمائے۔

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۹۶ء)

مشترکہ خاندانی نظام

سوال: میری شادی کو ۱۰ برس ہوگئے ہیں۔ میرے شوہر جماعت اسلامی کے کارکن ہیں، تحریکی لٹریچر اور رسائل کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جب بھی اپنے شوہر سے الگ گھر کا مطالبہ کرتی ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ موقع ملنے پر لے دوں گا ابھی میرے بھائی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوئے ہیں۔ ۱۰ سال میں یہ موقع نہیں آسکا۔ میرے میاں ٹیچر ہیں۔ ہمارے پانچ بچے ہیں۔ گھر کا سارا خرچ وہی اٹھاتے ہیں۔ اب ان کے تینوں چھوٹے بھائی معقول آمدنی رکھتے ہیں، ایک سعودی عرب میں ملازم ہے، دوسرا محکمہ جنگلات میں اور تیسرا بھائی ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے۔ کیا ان حالات میں الگ گھر کے لیے میرا مطالبہ جائز نہیں، جب کہ مجھے سسرال والوں کے ساتھ رہنے میں دشواری بھی ہے؟ ان حالات میں شرعاً میرے شوہر کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اسلام عدل واحسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، منکرات اور ظلم وزیادتی سے روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (النحل ۱۶: ۹۰) اللہ تعالیٰ عدل واحسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، منکر اور ظلم سے روکتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

گھروں کو عدل واحسان اور صلہ رحمی کا نمونہ بنانا اور ہر طرح کی بے حیائی اور منکرات اور ظلم وزیادتی سے پاک کرنا، اسلام کا اولین تقاضا ہے۔ خاندان اور معاشرے اور ریاست میں ہر جگہ ان تین مثبت بنیادوں کو قائم کیا جائے گا اور مذکورہ تینوں برائیوں سے روکا جائے گا۔ گھر اور خاندان کے تمام افراد کی طرح ایک شخص کی بیوی کے بھی حقوق ہیں اور ان حقوق میں سے اولین حق یہ ہے کہ اسے نان ونفقہ اور رہایش دی جائے۔ ایسی رہایش جس میں وہ آزادی کے ساتھ اپنے

شوہر کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کر سکے اور اس کی پرائیویسی پوری طرح قائم ہو۔ جس میں اس کے اذن کے بغیر داخلہ نہ ہو اور اس کی چیزیں محفوظ ہوں۔ شوہر اپنی استطاعت کے مطابق اسے ایسی رہائش فراہم کرے گا۔ ایک ایسی حویلی جس میں بہت سے کمرے ہوں، ان کمروں میں ایک شخص کے ماں باپ، بہن بھائی رہائش پذیر ہوں تو اس میں ایک کمرہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں اس کی بیوی رہائش پذیر ہو اور وہ آزادی کے ساتھ اس کمرے میں آ جاسکتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس کی اور اس کی بیوی کی مختص رہائش گاہ ہو۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ مشترکہ رہائش گاہ میں عدل ہو، کسی کی حق تلفی نہ ہو، کوئی شخص کسی کی مختص رہائش گاہ میں آزادانہ آمد و رفت نہ رکھے بلکہ وہ استیذان کے ضابطوں کو ملحوظ رکھے۔ لوگوں کے آرام اور خلوت کے اوقات کا خیال رکھے۔ ایک حویلی یا چار دیواری میں رہنے والے شرم و حیا، پردے اور ستر کے آداب کا خیال رکھیں۔ ایک چار دیواری میں ایک آدمی اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا ہو تو لازم ہے کہ بھائی ایک دوسرے کے حرم میں آنے جانے کے شرعی ضابطوں کے تابع ہوں۔

مشترکہ رہن سہن میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اخراجات کا بوجھ عدل کے ساتھ سارے لوگوں پر پڑے، کسی ایک پر بوجھ پڑے گا تو تعلقات زیادہ دیر اچھے نہیں رہیں گے۔ ایک شخص پر جہاں اس کی بیوی کے حقوق ہیں وہاں ماں باپ، بہن بھائیوں کے حقوق بھی ہیں۔ اسے سب کا خیال رکھنا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کے حقوق کی ادائیگی کی خاطر اسے بسا اوقات ان کے ساتھ رہنے کی ضرورت اور حاجت بھی ہوتی ہے۔ جب تک وہ اس قابل نہ ہو جائیں کہ الگ الگ رہ سکیں، اس وقت تک انھیں اکٹھا رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے ایک شخص اگر اپنی بیوی کو ایسی رہائش دیتا ہے جس میں اسے مذکورہ بالا تحفظات حاصل ہوں تو اس کے بعد وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اسے مشترکہ رہائش گاہ کی چار دیواری سے الگ مکان خرید کر اس میں ٹھہرایا جائے۔ بیوی کو ایسے مطالبے کا حق نہیں ہے حَقُّ الزَّوْجِ أَنْ يُّمْسِكَ زَوْجَتَهٗ بِمَنْزِلِ الزَّوْجِيَّةِ وَ يَمْنَعَهَا مِنَ الْخُرُوْجِ مِنْهُ۔[1] شوہر کا یہ حق ہے کہ بیوی کو اپنے گھر میں رکھے اور اس کو باہر نکلنے سے روکے۔

۱- فقہ السنۃ ج ۲، ص ۱۸۵، مطبع دار الکتاب العربی بیروت

البتہ اگر بھائی ایک دوسرے کی مدد کے محتاج نہ رہیں، مشترکہ رہایش میں انھیں ایسی سہولتیں حاصل نہ ہوں کہ پرائیویسی قائم رکھ سکیں اور پردے اور ستر کے آداب کی پابندی کرسکیں، خواہ جگہ تنگ ہو یا بہتر جگہ کی طرف منتقلی پیشِ نظر ہو تو باہمی مشورے سے متبادل انتظام کرسکتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عموماً مشترکہ خاندانی نظام کا رواج ہے، جس کے نتیجے میں لوگ سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ہمدردی اور غمگساری سے پیش آتے ہیں۔ جب خاندان کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ الگ الگ رہایشوں کا انتظام کرلیتے ہیں۔ حالات کے مطابق نیک نیتی کے ساتھ اکٹھی رہایش رکھنے اور الگ الگ رہایشوں کو اختیار کرلینے کی گنجایش کتاب وسنت اور ماضی کے اسلامی معاشروں کے تعامل سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ یَسْـئَـلُـوْنَکَ عَـنِ الْیَتٰمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَیْـرٌ وَّاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَاَعْنَتَکُمْ اِنَّ اللّٰـہَ عَـزِیْـزٌ حَکِیْمٌ (البقرۃ ۲:۲۲۰) آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے: ایسا طریقہ اختیار کرنا، جس میں ان کی بہتری ہو، اچھا ہے اور اگر تم انھیں اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمھارے بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے مصلح کو مفسد سے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمھیں مشقت میں ڈال دیتا۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

لہٰذا جس طرح یتیم کے مال کا معاملہ ہے اسی طرح بھائیوں کا آپس میں مشترکہ رہایش اور بود و باش اختیار کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس میں ایسا طریقہ اختیار کرنا، جس میں سب کے لیے سہولت ہو، کسی کی حق تلفی نہ ہو اور شرعی آداب کی خلاف ورزی نہ ہو، ضروری ہے۔

مشترکہ رہایش ہو تو اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس میں کسی کے آرام وسکون اور عزت وآبرو کو خطرہ نہ ہو۔ ایک شخص کی بیوی کو مشترکہ رہایش سے کوئی جسمانی اور ذہنی تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ سسرال کے لوگ اس کے حقوق اور آرام کا پورا خیال رکھیں اور اس کے لیے مشترکہ رہایش میں احکامِ شرعیہ پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

آپ نے اپنے بارے میں جو سوال کیا ہے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ کو مشترکہ رہایش میں پرائیویٹ کمرہ اور الگ رہایش میسر ہے تو پھر شوہر کی اس بات کی کہ اس کے بھائی ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکے، رعایت کریں۔ انھیں مزید موقع دیں تاکہ وہ اپنے بھائیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے بعد مکمل طور پر الگ رہایش اختیار کرنے کی پوزیشن میں آجائیں۔ آپ کے شوہر بھی حالات کا جائزہ لے کر یہ راے قائم کریں کہ جو کام انھیں کچھ عرصے بعد کرنا ہے، گھریلو ماحول بہتر کرنے کی خاطر ابھی کر سکتے ہیں، تو یہ بھی مناسب ہوگا۔

الگ رہایش میں جہاں مشترکہ رہایش کے مسائل سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے وہاں تنہائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور باہمی تعاون کے سلسلے میں رشتے داروں اور بہن بھائیوں کا اس طرح تعاون حاصل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے جس طرح مشترکہ رہایش گاہ میں مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۹۹ء)

جہیز اور وراثت

سوال: ہماری تین بچیاں اور ایک بیٹا ہے۔ میں ایک بیٹی کی شادی کر چکی ہوں اور دوسری کی تین ماہ بعد ان شاء اللہ ہو رہی ہے۔ میں اپنی بچیوں کو جو کچھ بھی دے رہی ہوں یہ بات ذہن میں رکھ کر دے رہی ہوں کہ میرے بیٹے کے ساتھ جائیداد کے لیے کوئی نہ جھگڑے۔ اس موقع پر زیور اور گھر کے تمام سامان کے روپ میں بیٹی کا قانونی حق دے دوں، مگر کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ شادی کے موقع پر جہیز الگ چیز ہے اور جائیداد کا حصہ الگ چیز ہے جب کہ ہماری اتنی طاقت تو نہیں کہ شادی پہ الگ دوں اور جائیداد کا حصہ الگ۔ اس معاملے میں آپ سے مشورہ درکار ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر جو سامان دوں وہ 'جہیز' نہ ہو بلکہ میں چاہتی ہوں کہ اس کا 'قانونی حق' ادا کروں۔

جواب: جہیز کا تعلق وراثت سے نہیں ہے، نہ یہ ایسا حق ہے جو ماں باپ کے مال میں حق وراثت کو ختم کرتا ہے۔ یہ بیٹی کا ایک اضافی اور مستقل حق ہے کہ جب وہ آپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہے تو آپ کو چاہیے کہ حسبِ توفیق کچھ ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ اسے رخصت کریں۔

آپ اپنے مالی حالات اور بچی کی حقیقی ضروریات کو سامنے رکھ کر ایک مناسب فہرست بنالیں اور پھر یہ دے کر اسے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کر دیجیے۔ جو کچھ دیں وہ اس تصور کے ساتھ دیں کہ یہ بیٹی کا اس موقع پر حق تھا، یہ حق تمام بیٹیوں اور بیٹوں کو ملے گا۔ آپ کا ایک بیٹا ہے تو اس کی شادی کے موقع پر اسے بھی حسبِ استطاعت یہ حق ملے گا۔

یہ ایک استثنائی حق ہے جو ہر ایک کے لیے ہے۔ اس کے بعد دیگر مواقع کے حقوق قائم رہیں گے۔ اس بنیاد پر کسی کو وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکے گا کہ اسے شادی کے موقع پر بہت کچھ دے دیا گیا تھا۔ شادی کے موقع پر دیا ہوا، حساب و کتاب میں نہیں آئے گا۔ زندگی میں کوئی اور موقع ایسا آجائے جس میں اولاد کو بطورِ خاص کچھ عطیات دینے ہوں تو ان میں بھی اسی پہلو کو مدِّنظر رکھنا ہوگا کہ استطاعت ہو تو سب کو مساوی عطیات دیے جائیں اور ہر ایک کی حاجت اور ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اگر کسی بیٹی کو جہیز دیا گیا تھا لیکن بعد میں اسے کوئی ضرورت پیش ہو تو پھر بھی اس کی حاجت کا خیال رکھا جائے۔

اس وقت آپ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر جہیز دیں اور یہ سمجھ لیجیے کہ اگر اس وقت بہت زیادہ جہیز اس نیت سے دیا گیا کہ بعد میں بیٹے کے ساتھ کوئی قانونی جھگڑا نہ رہے تو ایسا صحیح نہ ہوگا کیونکہ جملہ قانونی اور اخلاقی حقوق پھر بھی باقی رہیں گے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۸ء)

مہر کا استحقاق

سوال: ایک مولوی صاحب سے ایک دن میں نے سنا کہ لڑکی جتنا حقِ مہر مانگے، مانگ سکتی ہے اور پھر اگر یہ رقم لڑکی اپنے باپ یا بھائی کو دینا چاہے تو دے سکتی ہے۔ اگر لڑکی حق مہر مانگ سکتی ہے تو کیا نکاح کے وقت مانگ سکتی ہے یا منگنی کے دنوں میں؟

عملاً اکثر لوگ اپنی بہنوں اور لڑکیوں کو بیچتے ہیں اور مقصود حقِ مہر کی بجائے دولت بٹورنا ہوتا ہے۔ وضاحت فرمائیں کہ حقیقت کیا ہے اور قرآن وحدیث کی رو سے اسلام حقِ مہر کو کہاں تک جائز قرار دیتا ہے؟

جواب: مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے جس کی قیمت آج کل کے حساب سے سو روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، عورت جتنا مہر چاہے رکھوا سکتی ہے۔ لیکن اعتبار اس مقدار کا ہوگا جو نکاح کرتے وقت فریقین طے کرلیں۔ اور ادائیگی اسی طرح کرنا ہوگی جس طرح طے ہوئی ہو۔ اگر فوری ادائیگی کا فیصلہ ہو تو فوری ادائیگی کرنا پڑے گی اور بعد میں دینا قرار پایا ہو تو بعد میں دینا ہوگا۔ مہر عورت کی ملکیت ہوتا ہے وہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتی ہے۔ باپ کو دینا چاہے یا خاوند کو معاف کردے، دونوں صورتوں کی اجازت ہے۔ لیکن ایسا عورت کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے۔ اس بات کو رواج دے دینا کہ عورت کا مہر نکاح سے پہلے اس کے والد کو دیا جائے اور وہ اسے اپنی ضروریات میں استعمال کرے، صحیح نہیں ہے۔ البتہ والد اگر مہر کی رقم وصول کر کے لڑکی کے لیے جہیز وغیرہ بنا دے اور لڑکی کی ملکیت میں دے دے تو یہ درست ہے۔ بہر حال کچھ لوگ شریعت کی دی ہوئی رخصت کو اپنی اغراض پورا کرنے کا ذریعہ بنائیں تو اسے روکنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا کیا جائے۔ دعوت وتبلیغ اور ترغیب وترہیب کے ذریعے معاشرے میں بھلائیوں کو نشوونما دینے کی جدوجہد سے غلط رسوم اور دنیا پرستی کی بیماریوں کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اس کا احساس رکھتے ہیں انھیں اس میدان میں کام کرنے والی قوتوں کے ساتھ جدوجہد میں بھرپور حصہ ادا کرنا چاہیے۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۸۴ء)

تنسیخِ نکاح

سوال: ہمارے محلے کے لڑکے کا نکاح یہاں سے ستر کلومیٹر دور، اس کی خالہ زاد بہن کی بیٹی سے ہوا۔ نکاح کے علاوہ خیر سگالی کے طور پر کپڑے اور سامانِ خورد و نوش بھی لڑکی والوں کو دیا گیا۔ بعد ازاں لڑکی والوں نے وٹہ کے طور پر رشتہ اور خاصی رقم کا مطالبہ کر دیا۔ جب لڑکے والوں نے مطالبات پورے نہ کیے تو لڑکی کے والدین نے رخصتی سے قبل قریبی عدالت میں تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کر دیا۔ عدالت نے بذریعہ نوٹس لڑکے کو طلب کیا۔ لڑکا اس خیال سے عدالت میں نہ گیا کہ اس طرح تعلقات میں مزید خرابی آئے گی۔ اب پتا نہیں عدالت نے کیا دلیل قائم کی کہ تنسیخِ نکاح کا فیصلہ سنا دیا اور لڑکی کسی اور جگہ بیاہ دی گئی۔ کیا واقعی نکاح منسوخ ہوگیا ہے یا عدالت کو معاملات پر غور کا موقع نہیں مل سکا؟ شریعتِ اسلامی بالخصوص فقہ حنفی کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب: نکاح کو فسخ کرنے کی شریعت میں شرائط ہیں۔ اگر کوئی عدالت ان کو نظر انداز کر کے نکاح فسخ کرے گی تو نکاح فسخ نہیں ہوگا۔ اس لیے ایسی صورت میں دوسری جگہ نکاح کرنے کے لیے شوہر سے طلاق حاصل کرنی چاہیے۔ لڑکے کو عدالت میں حاضری دینا چاہیے تھی۔ اس نے عام بلاوے پر حاضری نہیں دی تھی تو اسے وارنٹ کے ذریعے بلایا جانا چاہیے تھا اور جوابِ دعویٰ سننے کے بعد تنسیخِ نکاح کی ڈگری جاری کی جانی چاہیے تھی اور اس کے دلائل ذکر کرنے چاہیے تھے۔ شریعت جج کو فسخِ نکاح کے کلی نہیں بلکہ مشروط اختیار دیتی ہے۔ شرائط کو پورا کیے بغیر فیصلہ کالعدم ہوتا ہے۔ اب لڑکے کو چاہیے کہ بالائی مجاز عدالت میں اپیل دائر کرے، یا وفاقی شرعی عدالت میں جج کے فیصلے کو غیر شرعی قرار دینے کی درخواست دے۔ نیز ساری تفصیلی صورتِ حال لکھ کر اور جج صاحب کے فیصلے کی نقل کو اس کے ساتھ منسلک کر کے استفسار کرے تو تفصیلی جواب دیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۹ء)

مسئلۂ طلاق

سوال: ایک مسئلہ درپیش ہے۔ ایک شخص کے تعلقات اپنے سسرال والوں سے کشیدہ ہو گئے۔ آدمی ایک علیٰحدہ گاؤں میں رہتا تھا اور اس کی بیوی کسی علیٰحدہ گاؤں میں اپنے میکے میں تھی۔ پھر اس آدمی نے غصے میں آ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر طلاق نامہ تحریر کیا۔ بیوی کا نام اور بیوی کے والد کا نام لکھا۔ لفظ طلاق تین دفعہ لکھ دیا۔ اب وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جو اس طلاق نامے کو اس کی بیوی تک پہنچا دیتا، اس کو ایسا آدمی نہ مل سکا۔ اسی اثنا میں اس آدمی اور سسرال والوں کے تعلقات ٹھیک ہو گئے۔ اس کے والد اس کی بیوی کو گھر لے آئے۔ اس کو دوسرے رشتہ داروں اور گھر والوں نے سمجھایا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر اس نے طلاق نامہ اٹھا کر آگ میں پھینک دیا۔ اب کیا لفظِ طلاق تین دفعہ لکھنے سے طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟ اگر واقع ہو جاتی ہے تو پھر اس کی کیا صورت ہو گی؟

جواب: طلاق کے سلسلے میں آپ کے استفسار کا جواب یہ ہے کہ طلاق اگر بیوی کے نام با قاعدہ خط کی شکل میں ہو اور اس میں یہ نہ لکھا گیا ہو کہ خط ملنے پر طلاق واقع ہو گی بلکہ بلا شرط طلاق دی گئی ہو تو کلماتِ طلاق تحریر کرنے کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور اسی وقت سے عدت بھی شروع ہو جاتی ہے۔ چاہے طلاق کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

اور اگر طلاق با قاعدہ خط کی شکل میں نہ ہو مثلاً شروع میں بیوی کو مخاطب کر کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وغیرہ اور تمہیدی کلمات نہ لکھے گئے ہوں جیسے کہ خطوط کی روایت ہے، صرف بیوی کا نام لکھ کر طلاق لکھی گئی ہو تو ایسی صورت میں طلاق کی نیت ہو تو طلاق ہو گی ورنہ نہیں۔

آپ نے جو صورت لکھی ہے اس سے اس قدر بات واضح ہو جاتی ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق دینے کی نیت رکھتا تھا اور اس نے طلاق نامہ لکھا ہے لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ طلاق نامے کے الفاظ کیا تھے۔ آیا اس میں یہ شرط تھی کہ جب میرا خط تمھیں ملے تو تمھیں طلاق ہے یا اس شرط کے

بغیر طلاق دے دی تھی۔ بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ اس قسم کی شرط کوئی نہ تھی اس لیے یقیناً تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں۔ اور تین طلاقیں تحریر کرنے کے بعد لڑکے کے والد صاحب کے لیے جائز نہ تھا کہ لڑکی کو اپنے گھر لے آتے جب کہ ان کو طلاق کا علم تھا۔ اب اس کا فوری تدارک ہونا چاہیے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ لڑکی کو ماں باپ کے گھر بھیج دیا جائے اور وہ عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ شادی کرے۔ دوسرے شوہر کے ساتھ بھی اگر اس کا نباہ نہ ہو سکے اور دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے تو اس کی عدت گزارنے کے بعد پھر دوبارہ پہلا شوہر نکاح کر کے اسے اپنے گھر لا سکتا ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب رد المحتار میں ہے:

وَاِنْ كَانَتْ بَيِّنَةً لٰكِنَّهَا غَيْرَ مَرْسُوْمَةٍ اِنْ نَوَى الطَّلَاقَ يَقَعُ وَ اِلَّا لَا، وَ اِنْ كَانَتْ مَرْسُوْمَةً يَّقَعُ الطَّلَاقُ نَوٰى اَوْ لَمْ يَنْوِ ثُمَّ الْمَرْسُوْمَةُ لَا تَخْلُوْا اِمَّا اَنْ اَرْسَلَ الْكِتَابَ بِاَنْ كَتَبَ: اَمَّا بَعْدُ! فَاَنْتِ طَالِقٌ، فَلَمَّا كَتَبَ هٰذَا يَقَعُ الطَّلَاقُ وَ تَلْزَمُهَا الْعِدَّةُ مِنْ وَقْتِ الْكِتَابَةِ وَ اِنْ عَلَّقَ طَلَاقَهَا بِمَجِيْءِ الْكِتَابِ بِاَنْ كَتَبَ: اِذَا جَاءَكِ كِتَابِيْ هٰذَا فَاَنْتِ طَالِقٌ فَجَآءَ الْكِتَابُ فَقَرَاَتْهُ اَوْلَمْ تَقْرَأْ يَقَعُ الطَّلَاقُ كَذَا فِي الْخُلَاصَةِ۔[1] اگر تحریر پڑھی جا سکنے والی ہو (کاغذ یا دیوار پر ہو یا زمین میں اس انداز سے ہو کہ پڑھی جا سکتی ہو اور سمجھی جا سکتی ہو) لیکن با قاعدہ خط کی شکل میں نہ ہو (مثلاً: شروع میں بیوی کے نام کا عنوان نہ دیا گیا ہو اور تمہید وغیرہ نہ ہو) اور نیت طلاق کی ہو تو طلاق ہوگی ورنہ نہیں۔ اور اگر باقاعدہ خط کی شکل میں ہو تو بہر صورت طلاق واقع ہوگی، نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ البتہ اگر طلاق مطلقاً دی گئی ہو تو فوراً طلاق ہو جائے گی جیسے تمہیدی کلمات کے بعد لکھا ہو: 'تجھے طلاق ہے'۔ اگر مشروط کی گئی ہو مثلاً لکھا ہو کہ جب میرا خط تجھے ملے تو طلاق ہے تو ایسی صورت میں خط کے ملنے پر طلاق واقع ہوگی (نہ ملنے کی صورت میں طلاق واقع نہ ہوگی)۔

مذکورہ صورت میں طلاق نامہ تو بیوی کو نہیں ملا بلکہ بیوی سسرال والوں سے راضی نامہ ہونے کے بعد گھر لے آئے اور طلاق نامہ جلا دیا گیا۔ لیکن سوال سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ طلاق نامے

۱- رد المحتار، ج۲، ص۴۲۴۔

میں بیوی کو خط ملنے کی شرط کا ذکر تھا یا نہیں۔ غالب گمان یہی ہے کہ اس شرط کا ذکر نہ تھا اور نہ سوال میں اس کا ذکر ہوتا۔ اس لیے قطعی طور پر تین طلاق واقع ہو گئیں۔ اور بیوی سے فوری طور پر جدائی لازمی ہو گئی ہے۔

(ترجمان القرآن، ستمبر۱۹۹۲ء)

ناروا پابندیاں اور طلاق

سوال: اچھے بھلے دین دار گھرانوں میں یہ مثالیں مل جاتی ہیں کہ شوہر بیوی کو پابند کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین سے یا بھائیوں سے میل ملاپ نہ رکھے۔ بعض کسی ناخوش گوار واقعے کی بنیاد پر حکم لگا دیتے ہیں کہ فلاں سے ملیں تو تین طلاقیں...... ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

جواب: اسلام میں صلہ رحمی کی خصوصی تاکید کی گئی ہے، اور اسے قربِ الٰہی اور تعلق باللہ کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک مومن اور مسلمان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ نمازیں پڑھے، روزے رکھے، زکوٰۃ ادا کرے اور حج کے لیے جائے۔ وہاں اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ شفقت اور رحم کے ساتھ پیش آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: رحمٰن، رحم کرنے والوں پر رحم کرتا ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الادب)

دوسری حدیث میں ہے: مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ احسان سے پیش آئے۔ (بیہقی، فی شعب الایمان)

پھر عام مخلوق اور عامۃ المسلمین سے حسن سلوک کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (البقرہ۲:۲۱۵) آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے، جو بھی خرچ کرو، وہ والدین، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات میں سے صرف دو ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحم (رشتہ داری) عرش کو پکڑے اس کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ کہتی ہے جس نے مجھے جوڑے رکھا اللہ اس سے تعلق رکھے گا اور جس نے مجھے قطع کیا اللہ اس سے قطع تعلق کرے گا۔ (مسلم، کتاب البر والصلۃ) ایک دوسری روایت میں حضرت جبیر بن مطعمؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ (مسلم، کتاب البر والصلۃ) قطعی رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔

کسی مسلمان سے عموماً اور قرابت داروں سے خصوصاً کسی شرعی وجہ کے بغیر قطعِ تعلق ممنوع اور ناجائز ہے۔ اسلام اس قسم کے قطعِ تعلق کی شدید مذمت کرتا ہے۔ سوائے اس کے کہ خود شریعت ہدایت کرے کہ فلاں طرح کے آدمی سے میل جول اور ہمدردی اور تعلق نہ رکھو مثلاً کفار اور مشرکین اور فساق و فجار سے موالات، یعنی دلی دوستی جائز نہیں ہے اور ان سے تعلقات کے لیے شریعت نے حدود مقرر کر دی ہیں۔ ان حدود کے مطابق ان سے رابطہ رکھا جاسکتا ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے دوستی اور تعلقات قائم کرنا خلافِ شرع ہے۔

خوش گوار گھریلو زندگی کے لیے ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ جو شوہر بیوی کو اس کے رشتہ داروں سے ملنے سے منع کرے، وہ کس طرح یہ توقع کر سکتا ہے کہ بیوی اس سے خوش دلی سے حسنِ سلوک کرے گی۔ روزمرہ گھریلو امور صرف ضابطہ کے امور تو نہیں، ان میں لطف و سکون تو دل کی کیفیت سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ پھر جو افراد دین کے داعی ہوں، جن کے دین دار ہونے کی شہرت ہو، انھیں بدرجۂ اَولیٰ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے غلط افعال سے دین کی غلط نمائندگی اور بدنامی نہ ہو۔ طلاق جیسے ابغض الحلال کو محض کسی سے ملنے یا نہ ملنے سے مشروط کرنا تو جہلا کو بھی زیب نہیں دیتا کجا کہ پڑھے لکھے لوگ یہ کام کر کے اپنی اور اپنی رفیقۂ حیات کی زندگی کو عذاب میں ڈالیں۔ طلاق کے لیے جو طریقِ کار شریعت نے تجویز کیا ہے، اس میں ٹھنڈے دل سے بار بار سوچنے کا موقع فراہم ہوتا ہے، اسے زبان کی ایک حرکت سے ضائع کر دینا نہایت قابلِ مذمت ہے۔ طلاق کو کھیل نہ بنانے اور اس کی سنگین نوعیت کے پیشِ نظر فقہا کا عمومی موقف یہی ہے کہ اس

طرح کی شرط پوری ہونے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔اس سے بچنے کی تدبیر ہو سکتی ہے جو کسی عالم دین سے معلوم کی جا سکتی ہے۔لیکن ایسے شخص کو اچھی طرح تنبیہ کیا جانا ضروری ہے، خواہ اس کے بزرگوں کی طرف سے ہو، یا برادری یا معاشرے کے کسی ادارے کی طرف سے۔

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۹۶ء)

لے پالک بچے کی ولدیت

سوال: ہمارے ایک عزیز نے ایک بچہ گود لے لیا ہے۔کیا وہ قانونی طور پر باپ کے نام کی جگہ اپنا نام لکھ سکتے ہیں؟ سکول میں داخلے کے وقت، میٹرک کے امتحان کے وقت اور نکاح کے وقت، بچے کے باپ کا نام کیا لکھا جائے گا؟

جواب: اسلام نے نسب کی حفاظت کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔رشتوں کے اندر اختلاط، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کا سبب بن سکتا ہے۔جس عزیز نے کسی کے بچے کو گود لیا ہے، اگر وہ قانونی طور پر باپ کی جگہ اپنا نام لکھ دیں تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہی کہ یہ اس کا باپ بن جائے گا اور باپ چچا بن جائے گا۔چچا کی بیٹی کے ساتھ نکاح جائز ہوتا ہے اور بہن سے حرام، لہٰذا یہ اپنی بہن سے، جو غلط نسبت کی وجہ سے اس کی چچا زاد بن گئی ہے، نکاح کر سکے گا اور اپنی چچا زاد بہن سے نکاح نہ کر سکے گا کہ وہ اب اس کی حقیقی بہن بن گئی ہے۔اسی طرح جس کا بیٹا کہلائے گا اس سے وراثت لے گا حالانکہ وہ اس سے وراثت کا حق دار نہیں ہے، بلکہ اپنے باپ کا وارث ہے، لیکن نسبت بدلنے کی وجہ سے اس کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔اس لیے اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔یہ قولِ زُور اور منکر (جھوٹی اور بری) بات ہے۔صرف پیار اور شفقت کے طور پر کسی کو بیٹا کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقتاً کسی ایسے شخص کو اپنا بیٹا کہنا جو اس کا بیٹا نہ ہو جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اسکول میں بھی اپنے باپ کی طرف نسبت کرے اور نکاح کے وقت بھی۔

(ترجمان القرآن، فروری ۲۰۰۱ء)

ازدواجی زندگی اور اولاد

سوال: اولاد نہ ہونا ایک اہم معاشرتی اور نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس حوالے سے قرآن کی یہ آیت رہنمائی کرتی ہے جس کا مفہوم ہے کہ خدا کچھ کو لڑکے دیتا ہے، کچھ کو لڑکیاں دیتا ہے، اور کچھ کو ملے جلے، اور کچھ کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ [الشوریٰ ۴۲:۴۹] لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس جوڑے کی اولاد نہ ہو، کیا اس کی زندگی خوش گوار اور خوش وخرم ہوسکتی ہے؟ قرآن وحدیث سے اس میں کیا رہنمائی ملتی ہے؟

جواب: اصل سوال یہ ہے کہ انسان کو اس زندگی میں حقیقی مسرت اور سکون کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

انسان کا جو مقصدِ وجود ہے اسے اسی کو اپنا نصب العین اور مقصدِ وجود بنانا چاہیے، اسی کی خاطر دوڑ دھوپ ہونی چاہیے، اس میں اگر انسان مصروف ہو، اس کا حق ادا کر رہا ہو، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کر رہا ہو، فرائض ادا اور منکرات سے اجتناب کر رہا ہو، تو ایسا انسان مطمئن اور خوش ہوتا ہے۔ انسان سکون واطمینان اور خوشی کی زندگی اسی صورت میں گزارتا ہے، جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر وعبادت اور اطاعت وفرماں برداری میں زندگی گزارے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَاكَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل ۱۶:۹۷) جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

اور یہ بھی فرمایا: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ ۲۰:۱۲۴) اور جو میرے 'ذکر' (درس نصیحت) سے منہ موڑے گا، اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

معلوم ہوا کہ حقیقی مسرت ذکرِ الٰہی، اللہ کی اطاعت اور اس کی رضا پر راضی رہنے سے ہے۔ مال و دولت، منصب اور اقتدار آدمی کے لیے سکون واطمینان کا ذریعہ نہیں۔ یہ سامانِ راحت تو ہیں لیکن عینِ راحت نہیں۔

ایک مسلمان مرد یا عورت جب بالغ ہو جائیں تو انھیں ازدواجی زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ ایسی صورت میں فرض ہے جب اس کے بغیر گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو۔ اگر ایسا کوئی خطرہ نہ ہو، لیکن حاجت اور استطاعت ہو، تو پھر ازدواجی زندگی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَابْتَغُوْا مَاكَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (البقرۃ ۲:۱۸۷) اور تلاش کرو اسے جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی نسل کی بقا کے لیے نکاح کو ذریعہ بنایا ہے۔ نکاح اور ازدواجی زندگی کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کے اس تکوینی نظام میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے جو اس نے نوعِ انسانی کی بقا کے لیے مقرر کیا ہے۔ نکاح کے نظام سے ایک طرف انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدّر اولاد کو، جسے مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے جملے سے بیان کیا گیا ہے، حاصل کرنے کے لیے تدبیر کرتا ہے، یعنی اولاد حاصل کرنے کی کوشش اور وسیلہ اختیار کرتا ہے، اور دوسری طرف نوعِ انسانی کی بقا میں مددگار و معاون بنتا ہے۔ اس لیے یہ عبادت بھی ہے اور تحصیلِ اولاد کا ذریعہ بھی۔ مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد مقدر کی ہوگی تو اس تدبیر کے ذریعے مل جائے گی، ورنہ نہیں ملے گی۔

اس لیے انسان محض شہوت رانی کی نیت سے نکاح نہ کرے بلکہ مستقل طور پر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے اور زندگی کی رفیقہ بنانے اور اولادِ صالحہ کے حصول کی نیت کرے۔ اگر اولاد کی نعمت حاصل ہو جائے تو اللہ کا شکر ادا کرے، نہ ملے تو راضی برضا رہے اور صبر کو وظیفہ بنائے۔ بہت

سے انبیا ایسے گزرے ہیں جو طویل زندگی میں لا اولاد رہے۔ آخری عمر میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد دی، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، اور بعض کو بیٹیوں کے ساتھ نرینہ اولاد ملی لیکن فوت ہوگئی، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور بہت سے وہ گزرے ہیں جن کو نکاح کا موقع نہیں ملا، جیسے حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام، اور جیسے مدین کے بزرگ، بعض اولاد سے محروم رہے، بہت سے ائمہ اور نیک خواتین کو بھی اس کا موقع نہیں ملا، جیسے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور رابعہ بصریؒ لیکن ان کی زندگی انتہائی خوش گوار، پرسکون اور اطمینان والی تھی۔

پس اولاد کے بغیر بھی آدمی خوش گوار زندگی بسر کرسکتا ہے، جب کہ اللہ کی بندگی اور ذکر میں مشغول ہو۔ اولاد بعض اوقات آدمی کے لیے سکون و اطمینان کے بجائے فتنہ بن جاتی ہے اور ماں باپ کی نافرمان ہوتی ہے۔ آج کل تو بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں کہ اولاد ماں باپ کو قتل کر دیتی ہے یا چور، ڈکیتی، دہشت گردی یا نشے میں مبتلا ہو کر ماں باپ کے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہے۔ قرآنِ پاک میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کا واقعہ آیا ہے۔ اس میں حضرت خضر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ایسے بیٹے کو قتل کر دیتے ہیں جس سے خطرہ تھا کہ وہ بالغ ہونے کے بعد ماں باپ کو اپنی سرکشی اور کفر کی بنا پر تنگ کرے گا۔

مسلمان معاشرے میں رہتے ہوئے ایک انسان تنہائی محسوس نہیں کرتا۔ یتیم کو باپ کے بدلے میں باپ، بھائی سے محروم کو بھائی کے بدلے میں بھائی، اور اولاد سے محروم کو اولاد کے بدلے میں اولاد (عزیزوں، بہن بھائیوں کی اولاد) میسر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ [الحجرات ۴۹:۱۰] (ایمان والے آپس میں بھائی ہیں) اور المسلم اخو المسلم [بخاری، کتاب المظالم، باب ۳] (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے)۔

اس لیے اولاد کے بغیر خوش گوار زندگی کا سامان اللہ کی بندگی، صبر اور اہل ایمان سے بھائی چارے کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(ترجمان القرآن، جنوری ۲۰۰۲ء)

بچیوں کا رشتہ اور دعائیں

سوال: بچیوں کی تعلیم وتربیت کی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ اللہ کی توفیق سے اس پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کی۔ ۲۵ سال ایسے گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ مگر جب بچیوں کی شادیوں کا معاملہ آیا تو حالات ایسے ہوئے کہ مستقل فکر نے جسمانی اور ذہنی مریض بنا دیا۔ بچیوں کی شادی کی عمر گزرتی جارہی ہے لیکن کوئی صورت بنتی نظر نہیں آرہی، جب کہ ہم فرض نمازوں کے علاوہ بھی دعائیں کرتے ہیں اور دوا (شادی کرانے والیوں سے رابطہ) بھی۔ لوگ وظائف پڑھنے کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔ کیا قبولیتِ دعا میں ان کی کوئی افادیت ہے؟ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

جواب: آپ نے لڑکیوں کی شادی میں تاخیر سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا ذکر کیا ہے۔ فی الواقع یہ مسئلہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر فکر کی دعوت دیتا ہے۔ آج نہ صرف لڑکیوں کے لیے بلکہ لڑکوں کے لیے بھی مناسب رشتے کا ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ قرآنِ کریم میں سورہ القصص کی آیات ۲۳-۲۸ کا مطالعہ فرمائیں تو حضرت موسیٰ کی دعا کا ذکر ملتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے چند لمحات میں ہی انھیں جائے امن اور مناسب رشتے سے نوازا۔ آیت ۲۴ میں یہ دعا موجود ہے۔

دعا کے متعلق یہ تصور ٹھیک نہیں ہے کہ قبول نہیں ہوتی۔ آپ دعاؤں پر خصوصی توجہ دیں۔ قرآن وحدیث کی دعائیں بھی وظائف ہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ایک اچھا وظیفہ ہے۔ ظاہری تدبیر کے ساتھ اذکار اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۲۰۰۲ء)

☆......☆......☆

باب نہم

عالم نسواں

خواتین کو لکھائی سکھانا

سوال: ہمارے امام مسجد صاحب بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور جمعیتِ علماے پاکستان کے حامی ہیں، تعلیمِ نسواں سے متعلق مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے یہ اعلان نشر کرتے رہتے ہیں کہ انھیں لکھائی کی تعلیم دینا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ مفتی محمد خلیل خان قادری کی کتاب حقوق الاولاد مع احکام العقیقه کا حوالہ دیتے ہیں۔

اس کتاب میں مفتی صاحب نے قرآن کی روشنی میں ۸۰ اصول مرتب کیے ہیں۔ صفحہ ۳۱ پر 'خاص دختر کے حقوق' کے عنوان کے تحت اصول نمبر ۶۸-۶۹ میں لکھتے ہیں کہ لکھنا ہرگز نہ سکھائے کہ احتمالِ فتنہ ہے۔ (امام ترمذی)

آگے مزید رقم طراز ہیں: حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لقمان نے ایک لڑکی کو دیکھا کہ مکتب میں سکھائی جا رہی ہے فرمایا: یہ تلوار کس کے لیے صیقل کی جاتی ہے۔

امام ابن حجر فرماتے ہیں: اس حدیث میں ممانعتِ کتابت کی علت کی طرف اشارہ ہے کہ عورت لکھنا سیکھ کر خود بھی فاسد غرضوں کی طرف راہ پائے گی اور فاسقوں، بدکاروں، آوارہ مزاجوں اور اوباشوں کو بھی اس تک رسائی کا بڑا موقع ملے گا، جو لکھنا نہ جاننے کی حالت میں نہ ملتا، کیونکہ آدمی وہ بات لکھ سکتا ہے جو کسی کی زبانی کہلا کے نہ بھیج سکے۔ نیز خط ایلچی سے زیادہ پوشیدہ ہے۔ اس میں حیلہ و مکر کی بہت جلد راہ ملے گی۔ لہٰذا عورت لکھنا سیکھ کر صیقل کی ہوئی تلوار ہو جاتی ہے (انتہیٰ)۔ ہندی مثل نے بھی اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اے بوری کوئی دیت ہے سنوران ہتھیار

اور ظاہر ہے کہ کتابت ایک عظیم نافع چیز ہے۔ اگر عورتوں کے لیے اس فنِ کتابت میں حرج نہ ہوتا تو جمہور علما اور عظیم مومنینِ سلف سے کر لے آج تک اس کے ترک پر کیوں اتفاق

کرتے۔ تیرھویں صدی ہجری کے آخر تک تیرہ سو سال کی مدت میں صرف گنتی کی چند عورتیں ایسی ملتی ہیں جو کتابت جانتی تھیں۔ جب کہ ہر زمانے میں لاکھوں مرد کاتب ہوئے۔ خود حضور اقدسؐ ارشاد فرماتے ہیں: عورتوں کو بالا خانوں میں نہ رکھو اور انھیں لکھنا نہ سکھاؤ، کاتنا سکھاؤ اور سورۂ نور کی تعلیم کرو۔ (ابنِ حبان، بیہقی)

امام ترمذی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کردہ ایک حدیث بھی اسی معنی میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں عام حکم فرما دیا تھا کہ عورتوں کو لکھنا نہ سکھاؤ اور بالا خانوں پر نہ ٹھہراؤ۔ (ابنِ حبان، بیہقی)

امام مسجد صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے علاوہ تفسیرِ مظہری، مولانا ابوداؤد صادق صاحب کی کتاب اصلاح معاشرہ، انھی کے زیرِ ادارت ماہنامہ رضائے مصطفیٰ، مفتی احمد یار خان کی کتاب پردہ کا شرعی حکم، انھی کی کتاب اسلامی زندگی میں بھی یہی مسئلہ بیان ہوا ہے۔ نیز علامہ فیض احمد اویسی نے بہاولپور سے بھی یہی فتویٰ بھیجا ہے۔

مہربانی فرما کر قرآن وسنت کے حوالے سے اس مسئلے پر روشنی ڈالیں۔

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابنِ ماجہ، مقدمہ باب ۱۷) طلبِ علم ہر مسلمان پر فرض ہے۔

خواتین بھی مردوں کی طرح شرعی احکام، فرائض، واجبات، سنن، مستحبات آداب کی مخاطب ہیں۔ ان کے لیے بھی کتاب وسنت عقلی تجرباتی اور دوسرے علوم وفنون سے اتنی مقدار میں واقفیت ضروری ہے کہ وہ اپنی شرعی اور انسانی ذمہ داریاں ادا کرسکیں۔

علم کے لیے سب سے بڑا ذریعہ قلم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں تعلیم بالقلم کا ذکر فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ (العلق ۹۶:۱-۵) پڑھو، اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے

ذریعے علم سکھایا۔

یہاں 'انسان' کو تعلیم دینے کا ذکر ہے نہ کہ صرف 'مرد' کو، اور عورت بھی انسان ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص خواتین کے لیے تعلیم کا قائل ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے لیے تعلیم بالقلم کو بھی تسلیم کرے۔

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے ایک خاتون سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ جب آپؐ کے نکاح میں آئیں تو آپ نے اس خاتون سے کہا کہ اسے خوشخطی سکھائیں۔[۱]

بدائع الصّنائع کے مصنف مشہور فقیہ علامہ علاؤ الدین کاسانی، کی بیوی فاطمہ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔ ان کے والد تحفۃ الفقہا علاؤ الدین سمرقندی اور ان کے خاوند علاؤ الدین کاسانی کے فتاویٰ ان کے دستخطوں کے بغیر جاری نہیں ہوتے تھے۔ ان دونوں فقیہوں کے فتاویٰ پر فاطمہ کے دستخط ضرور ثبت ہوتے تھے۔[۲]

مشہور محدث حافظ ابن عساکر فرماتے ہیں کہ میرے شیوخ اور اساتذہ میں سے اسی (۸۰) کے قریب خواتین اساتذہ ہیں۔

جن لوگوں کو خواتین کے بارے میں مغالطہ لگا ہے کہ انھیں لکھنا پڑھنا سکھانا ٹھیک نہیں ہے ان کے مغالطے کی بنیاد وہ روایت ہے جسے آپ نے بھی نقل کیا ہے:

اس حدیث کے بارے میں علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسے حاکم نے اپنی صحیح میں درج کیا ہے اس پر ابن جوزیؒ نے تعجب کیا ہے کہ اس کے راوی ابراہیم شامی کا حال ان سے کیسے مخفی رہا۔ وہ شامی محدثین کے نام جھوٹی روایتیں روایت کرتا ہے۔[۳]

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۸۵ء)

۱- فتوح البلدان بلاذری۔

۲- المرأة بين الفقة والقانون، ص ۱۶۵۔

۳- الموضوعات، جلد ۲، ص ۲۶۸۔ امام البانیؒ نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: سلسلة الاحاديث الضعيفة۔ (مرتب)

خواتین سے ضروری رابطہ

سوال: ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران اکثر مسلمان خواتین 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' کا جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کرتی ہیں۔ کیا یہ درست ہے یا غلو کے زمرے میں آتا ہے۔اسی طرح ٹیلی فون پر ضروری پیغامات دینا ہوتے ہیں، جب کہ خواتین یہ کہہ کر فون بند کردیتی ہیں کہ مرد گھر پر موجود نہیں۔اس مسئلے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: مردوں کے لیے عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کو اس کا جواب دینا سنت سے ثابت ہے۔امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں باب تسلیم الرجال علی النساء کا مستقل عنوان قائم کر کے اس کے تحت دو روایتیں ذکر کی ہیں۔

ایک حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ کی روایت کہ ہم جمعہ کے دن بہت خوش ہوتے تھے۔ ابوحازم نے، جو ان سے روایت کرنے والے ہیں، نے پوچھا: آپ کس وجہ سے خوش ہوتے تھے؟ تو انھوں نے جواب دیا: اس لیے کہ ہماری ایک بڑھیا اسی روز چقندر کو جو کے آٹے کے ساتھ ملا کر ہمارے لیے ہنڈیا میں پکاتی تھی۔ہم جمعہ کی نماز پڑھ کر اس کے پاس آتے اور اسے سلام کہتے۔ پھر وہ ہمیں چقندر کھانے کے لیے پیش کرتی تھی۔اسی وجہ سے ہم خوش ہوتے تھے۔ہم نمازِ جمعہ کے بعد کھانا کھاتے تھے اور اس کے بعد آرام کرتے تھے۔

دوسری روایت حضرت عائشہؓ کی ہے۔فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: عائشہؓ! یہ جبریل تمھیں سلام کہہ رہے ہیں۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: وعلیہ السلام۔اس لیے مردوں اور عورتوں کو آپس میں سلام کرنا جائز ہے۔اور اگر فون پر کسی مرد نے سلام کہہ دیا ہے تو اس کا جواب دینا چاہیے۔جب باقی گفتگو ضرورتاً کی جائے تو سلام بھی ضرورتاً کرنا چاہیے اور اس کا جواب بھی دینا چاہیے۔بخاری کے محشی لکھتے ہیں: ابن بطال نے مہلّب سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ مردوں کا عورتوں کو سلام کہنا اور عورتوں کا مردوں کو سلام کہنا جائز ہے،

جبکہ فتنے کا خطرہ نہ ہو۔کوفہ کے علما کہتے ہیں کہ عورتوں کو سلام کی ابتدا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔امام مالکؒ کے نزدیک یہ جائز ہے اور دلیل سہل بن سعد کی مذکورہ روایت ہے۔ ہمارے نزدیک راجح جواز ہے۔لیکن ابن بطال نے جس طرح کہا ہے وہ بالکل درست ہے کہ کوئی بھی جائز کام اس وقت ناجائز ہو جاتا ہے جب کہ وہ ناجائز کام کا سبب بن جائے۔ اگر سلام، نامہ و پیام اور کلام کی کھلی اجازت دی جائے تو یہ برائی اور فتنے کا سبب بن جائے گا، اسی لیے اس میں مرد اور عورت کے حالات کو مدِّ نظر رکھا جائے گا اور قیودات کے ساتھ محدود دائرے میں اس کی اجازت دی جائے گی۔ اگر خطرہ ہو تو منع بھی کیا جائے لیکن اتنا غلو بھی ٹھیک نہیں ہے کہ فون پر کسی طرف سے سلام ہو تو نیک نیتی کے ساتھ جواب بھی نہ دیا جائے۔ جو خاتون نیک نیتی کے ساتھ خاموشی اختیار کرسکتی ہے وہ نیک نیتی کے ساتھ جواب بھی دے سکتی ہے۔اگر باقی بات اس نے کرنا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تو پھر صرف وعلیکم السلام کہنے میں کیوں تنگی محسوس کی جائے۔ جواب کی اجازت تو کوفہ کے علمانے بھی دی ہے اور حدیثِ عائشہؓ سے بھی ثابت ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۹۶ء)

قریبی اعزہ سے پردہ

سوال: پردے کے حوالے سے ایک مسئلہ درپیش ہے، براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔

۱- ایک گھر میں والدین کی موجودگی میں رہنے والے شادی شدہ بھائیوں کی بیویاں اپنے دیور، جیٹھ سے چہرے کا مکمل پردہ کریں یا صرف اظہارِ زینت سے پرہیز کریں یعنی سر، کان، گردن اور سینہ پر کپڑا اوڑھے رہیں؟

۲- جس حدیث میں دیور کو موت کہا گیا ہے اس کو بعض حضرات ضعیف سمجھتے ہیں۔ان کا موقف یہ ہے کہ جو ہستی تمام انسانوں کو جوڑنے والی ہو وہ خاندان کو پھاڑنے کی بات نہیں کرسکتی۔ اس حدیث سے خاندان میں بدظنی پیدا ہوتی ہے اور بدظنی سے آپس میں نفرت اور بیگانگی پیدا ہوتی

ہے۔ جب کہ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ حسنِ ظن، محبت اور یگانگت کا درس ہے۔ اسلام دینِ رحمت ہے نہ کہ زحمت اور والدین کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

جواب: دیور اور دوسرے عزیز واقارب سے اصل حکم تو یہی ہے کہ چہرے کا بھی پردہ کیا جائے تاہم اس بات کی گنجایش ہے کہ اگر کسی برائی اور فتنے کا خطرہ نہ ہو تو بقدرِ ضرورت چہرے سے پردہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ آج کل آزادانہ اختلاط سے پرہیز کرتے ہوئے اس گنجایش سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جب گھر میں کوئی نہ ہو تو دیور کو بھی گھر میں نہیں رہنا چاہیے اور اسی طرح دیگر غیر محرموں کو بھی تنہائی میں غیر محرم عورت سے نہیں ملنا چاہیے۔ حدیث شریف کا مطلب ہے کہ بعض اوقات دیور اور دوسرے قریبی عزیز چونکہ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور ان پر اعتماد بھی ہوتا ہے اس لیے شیطان ان کو برائی میں زیادہ آسانی سے مبتلا کرسکتا ہے، لہٰذا انھیں زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ موجودہ دور میں تو محرموں کے ساتھ بھی برائی کے واقعات پیش آئے ہیں اس لیے شرعی حدود کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ حسنِ ظن کے ساتھ شرعی تدابیر پر بھی عمل ہونا چاہیے۔ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں بدظنی کے مواقع پیدا ہوتے ہیں جس سے پورا گھرانہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی تفسیر میں تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز پردہ ایک جامع کتاب ہے۔ آپ اپنے اہلِ خانہ اور دوسرے دوستوں کو اس کتاب کا مطالعہ کرائیں۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۳ء)

پردے میں غلو

سوال: ہمارے گاؤں میں گلی کے دونوں طرف ہمارے گھر ہیں اور خواتین کو آمد ورفت کے لیے دکانوں کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے۔ دکانوں میں عموماً لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک رائے یہ دی گئی ہے کہ اگر آنے جانے والوں کو کوئی زحمت نہ ہو تو گلی کے اوپر پل سا تعمیر کر دیا جائے تاکہ خواتین پردے میں جاسکیں۔ اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں بتائیں۔ کیا ایسا پل تعمیر کرنا درست ہے؟

جواب: جہاں تک خواتین کے لیے گلی میں پل بنانے کا تعلق ہے تاکہ خواتین کا پردہ نہ ٹوٹے تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی خواہش حضرت عمرؓ نے کی تھی کہ عورتیں پردے میں بھی نظر نہ آئیں، لیکن ان کی اس خواہش کو پورا نہ کیا گیا اور ازواجِ مطہرات اور دوسری خواتینِ اسلام کو اپنے ضروری کاموں کے لیے باپردہ نکلنے کی اجازت مل گئی۔[بخاری، کتاب النکاح] اس کے باوجود کہ ان کے باپردہ جسم پر لوگوں کی نظریں پڑیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہؓ سے فرمایا: قَدْ اُذِنَ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِکُنَّ (بخاری) تمھیں اجازت دے دی گئی ہے کہ تم اپنے ضروری کام کے لیے نکلو۔ اس لیے آپ کی یہ تجویز ایک طرح کا غلو ہے اور شریعت اس غلو کی قائل نہیں ہے۔ آپ خواتین کو صرف یہ تلقین کریں کہ وہ جب گلی میں نکلیں تو اچھی طرح پردہ کر کے نکلیں اور اسی وقت نکلیں جب انھیں نکلنے کی فی الواقع کوئی ضرورت ہو، بلاوجہ آمد ورفت سے پرہیز کریں۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۸ء)

رشتوں میں تاخیر

سوال: آج کل مختلف وجوہات سے رشتے طے کرنے میں تاخیر کی جاتی ہے اور لڑکے اور لڑکی کی عمریں کافی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات نسبت طے کرنے کے بعد طویل مدت کچھ مسائل کے حل کے انتظار میں گزار دی جاتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ نکاح کر دیا جاتا ہے اور رخصتی تعویق میں پڑ جاتی ہے۔ ان امور کے بارے میں شریعت کا منشا کیا ہے؟ اس دوران لڑکے کے فون پر رابطے وغیرہ کے بارے میں بھی جواز اور عدم جواز کے مسائل سامنے آتے ہیں۔

جواب: نکاحِ اور رخصتی کے سلسلے میں شرعی ہدایت یہ ہے کہ مناسب رشتہ مل جائے تو پھر دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر زوجین میں قرابت بھی ہو، ذہنی ہم آہنگی بھی ہو، شادی ان کی ضرورت بھی ہو کہ وہ دونوں عنفوانِ شباب میں ہوں، تو ایسی صورت میں رسوم و رواج کے چکر میں پڑنے، جہیز تیار کرنے، کثیر الاخراجات ولیموں کے اہتمام وغیرہ میں وقت نہیں لگانا چاہیے بلکہ سادہ سی مجلسِ نکاح منعقد کر کے رخصتی کر دینا چاہیے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں پاکیزگی کی خواہش ہو جس میں عفت و عصمت کی حفاظت کا اہتمام مقصود ہو، جس میں احکامِ شرعیہ کا قیام اور نفاذ مطلوب ہو، اس میں ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کی حامل شادیوں کو رواج نہیں دیا جاتا۔ اگر نوجوان جوڑوں کو شادی کے لیے چار چار، پانچ پانچ سال انتظار میں رکھا جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ انھیں فتنہ میں ڈال دیا جائے اور ان کو سخت امتحان سے دوچار کر دیا جائے۔ یہ تو ظلم کی ایک قسم ہے جو دین و دنیا دونوں تباہ کر دینے والی ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تمھیں ایسا آدمی پیغام نکاح دے جس کے دین اور اخلاق تمھیں پسند ہوں تو شادی کر کے رخصت کر دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور وسیع پیمانے پر فساد برپا ہوگا [بخاری، کتاب النکاح]

اور فرمایا: تین آدمیوں کی مدد اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے، وہ غلام جو رقم دے کر آزادی چاہتا

ہے،اس نے معاہدہ کرلیا ہے اور رقم ادا کرنا چاہتا ہے۔دوسرا وہ شخص جو پاک بازی کے لیے نکاح کرتا ہے۔تیسرا مجاہد فی سبیل اللہ۔(ترمذی،کتاب فضائل الجہاد۔ابن ماجہ،کتاب العتق۔ نسائی،کتاب النکاح)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نوجوانو! جو شادی کے اخراجات (مہر،نان،نفقہ،سکونت) پیدا کرسکتا ہوتو وہ شادی کرے کہ یہ نظروں کو نیچے رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہوتو وہ روزے رکھے کہ یہ اس کی شہوت کو دبانے اور کمزور کرنے والے ہیں۔(متفق علیہ)

پھر نکاح نبی اکرمؐ کی ایک سنت ہے اسے جس قدر جلدی ادا کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔پتہ نہیں کل حالات میں ایسا بگاڑ آجائے کہ شادی ممکن نہ رہے۔یہ محض اپنی شہوت کو پورا کرنے اور گھر بسانے کا نام نہیں ہے بلکہ عبادت ہے اور ایسی عبادت کہ اگر اس کو ادا کرنے کا فوری انتظام نہ کیا جائے تو گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ بھی ہے۔اس لیے اس میں تعجیل کرنا چاہیے۔اگر دیر کی جائے تو اس سے نسلِ انسانی کے اس دنیا میں پھیلنے کی حکمتِ عملی متاثر ہوتی ہے۔نکاح سے ایسی نیکیاں ظہور میں آتی ہیں جو آخرت میں نکاح کرنے والوں کے لیے رفعِ درجات کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھتے تھے اس لیے وہ نکاح میں کسی نام ونمود اور ٹھاٹھ باٹھ کو شامل نہیں کرتے تھے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جس میں اخراجات کی آسانی ہو(بیہقی فی شعب الایمان) اور نکاح کی اس قدر اہمیت ہے کہ اسے ایمان کی تکمیل قرار دیا گیا ہے۔چنانچہ فرمایا: جب ایک آدمی شادی کرتا ہے تو اپنے آدھے دین اور آدھے ایمان کی تکمیل کرتا ہے۔نکاح کے بعد باقی آدھے میں وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرے(بیہقی فی شعب الایمان)۔

نکاح کی اس دینی اہمیت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طرح سے واضح فرمایا۔ارشاد ہے: جو میرے دین کو پسند کرتا ہو وہ میری سنت کی پیروی کرے اور میری ایک سنت نکاح ہے۔

(بیہقی فی السنن الکبریٰ) اور فرمایا: جو آدمی نوعمری (یعنی نوجوانی) میں شادی کر لیتا ہے تو اس کا شیطان واویلا مچاتا ہے اور کہتا ہے، ہائے میری ہلاکت! اس نے تو اپنے دین کو بچالیا۔ (ابویعلیٰ فی المسند) ایک روایت میں ہے: شیطان کے پاس نیک لوگوں پر اثر انداز ہونے کے لیے عورتوں سے بڑھ کر کوئی ہتھیار نہیں سوائے ان لوگوں کے جو شادی کر لیں، ایسے لوگ بے حیائی سے پاک ہیں۔ (مسند احمد)

اس راستے کو چھوڑ کر محض منگنی کر دینا اور نکاح اور رخصتی کو مؤخر کر دینا، نکاح کے مقصد پر ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ ایسے لوگ شاید یہ چاہتے ہیں کہ پاک دامنی اور پاک بازی خالص نہ رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ برائی کے لیے بھی چور دروازے کھلے رکھے جائیں۔ لیکن کیوں؟ محض اس لیے کہ ان کا نام ونمود ہو جائے ایسے نام ونمود اور ایسے ٹھاٹھ باٹھ کا کیا فائدہ جس کے نتیجے میں برائی کے لیے راستہ ہموار ہو اور نوجوان یا تو تکلیف برداشت کریں یا پھر زنا میں مبتلا ہوں۔

دینی شعور رکھنے والے نوجوان جوڑوں کے لیے، جن کی شادی طے کر کے تاخیر کی جارہی ہو، مناسب ہے کہ وہ اپنی عفت اور عصمت کے تحفظ کی خاطر اپنے والدین کو بالواسطہ یا براہِ راست یہ بات پہنچائیں کہ وہ شریعت کے تقاضوں کو پورا کریں اور انھیں فتنے کے حوالے نہ کریں۔ فتنے میں پڑنے سے بہتر ہے کہ وہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے، والدین یا والدہ سے بات کر لیں اور کہہ دیں کہ نکاح اور شادی کو مؤخر کر کے آزمائش میں ڈال دینا صحیح نہیں ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے لیے نکاح کی بات کھل کر کرنا بہتر ہے اس برائی سے جسے چھپ کر کیا جائے۔

رشتہ طے ہو جانے کے بعد نکاح اور رخصتی کا انتظار کرنے کی بجائے نکاح اور رخصتی میں جلدی کی جائے۔ محض نکاح کافی نہیں ہے، رخصتی بھی ضروری ہے تاکہ ہر کسی کو پتہ ہو کہ یہ جوڑا آپس میں میل جول کا حق رکھتا ہے۔ محض نکاح ہو اور رخصتی نہ ہو تو میل ملاپ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس سے عرف میں حیثیت اور عزت مجروح ہوتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تہمت کے مواقع سے بچو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ

اعتکاف میں تھے کہ ایک زوجۂ مطہرہ ملاقات کے لیے تشریف لائیں آپ انھیں رخصت کرنے گئے تو دو آدمی گزر رہے تھے۔ آپؐ نے انھیں بلایا اور فرمایا کہ یہ آپ کی ماں ہیں۔ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ کے بارے میں ہم بدگمانی کر سکتے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: شیطان انسان کے بدن میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ (بخاری، کتاب الاعتکاف، باب ۱۱) اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شک و شبہے سے بچنا چاہیے اور لوگوں کو اس کا موقع نہیں دینا چاہیے اس لیے بھی کہ ایک اسلامی معاشرے میں مشکوک قسم کی سرگرمیاں روا نہیں رکھی جاتیں۔ اس لیے کہ اس سے لوگ برائی پر جری ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ برائی کرنے والوں کو معاشرہ میں سزا نہیں ملتی۔ رہی یہ بات کہ بغیر نکاح کے فون پر رابطہ اور کھلی کھلی باتیں کرنا تو اسے حدیث میں فتنہ کہا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پٹرول کے قریب بیٹھ کر دیا سلائی جلائی جائے۔ ایسی صورت میں خطرہ ہے کہ دیا سلائی سے پٹرول میں آگ بھڑک اٹھے۔ بغیر نکاح کے فون پر بات چیت سے تشنگی بڑھتی ہے۔ خطرہ ہے کہ یہ بات چیت ملاقات پر آمادہ کرے گی اور پھر سلسلہ مزید بڑھتا چلا جائے گا۔ اس لیے اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ یہ وہ شیطانی ہتھیار ہے جس کے سامنے تین تین سو سال عبادتیں کرنے والے بھی شکست کھا گئے۔ اس لیے معمولی درجے کے متقی اور پرہیز گار نوجوان اس کا کیسے مقابلہ کر سکیں گے۔

اسی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا سے بچو، عورتوں کے ساتھ اختلاط سے بچو، اس لیے کہ ابلیس گھات میں دیکھتا رہتا ہے، جھانکتا رہتا ہے، اور اس کے جال میں متقی لوگوں کو قید کرنے کے لیے عورتوں سے بڑا کوئی پھندا نہیں ہے (مسند احمد)۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا: حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں ہیں جو مشتبہ ہیں ان کو بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ بس جو مشتبہات سے بچ گیا تو اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو مشتبہات میں پڑا تو وہ حرام میں پڑ جائے گا۔ جیسے چرواہا، جو ممنوعہ علاقے کے اردگرد اپنے جانوروں کو چراتا ہے قریب ہے کہ اس کے جانور ممنوعہ علاقے میں چرنے لگیں۔ (بخاری)

عطیہ سعدی سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ اس وقت تک متقین کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ان چیزوں سے بچنے کی خاطر، جن میں مبتلا ہونا خطرناک ہے، ان چیزوں کو بھی نہ چھوڑ دے جن میں بظاہر کوئی خطرہ نہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ہمارا موجودہ معاشرہ شریعت کے ان اصولوں کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اخلاقی زوال وانحطاط کا شکار ہے۔ اس میں اختلاطِ مرد وزن نے ہولناک بیماریوں کو جنم دیا ہے۔ روز بروز روح فرسا واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان آگے آئیں، اپنی سیرت وکردار اور طرزِ عمل سے معاشرے کے لیے بہترین نمونہ پیش کریں اور قیادت کا فریضہ سرانجام دیں۔ ان کے بڑوں کا بھی فرض ہے کہ وہ شریعت کے مطابق چلیں، اپنی اولاد کو جان بوجھ کر آزمایش اور تکلیف سے دوچار نہ کریں اور ان کو اپنے فرائض اور سنن ادا کرنے کے مواقع فراہم کریں۔ ورنہ وہ بھی قیامت کے روز جواب دہ ہوں گے۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۶ء)

لڑکی کی رضامندی

سوال: میری ایک ماموں زاد بہن نے ۵ سال قبل، اپنے بھائی کے ذریعے سے رشتہ ازدواج کی خواہش ظاہر کی تھی۔ زید نے اثبات میں جواب دیا۔اس دوران دونوں کے درمیان راز داری سے خط وکتابت ہوتی رہی۔اب زید نے اپنے والد کولڑکی کے والد کے پاس بھیجا جنھوں نے انھیں پوری صورت حال سے آگاہ کیا۔لیکن میرے ماموں نے ساری بات سمجھنے اور جاننے کے باجود رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ادھر لڑکی اپنے بڑے بھائی کے ذریعے واضح کر چکی ہے کہ وہ زید کی جدائی برداشت نہ کر سکے گی۔لڑکے کا بھی کہنا ہے کہ اسے جو خصوصیات اپنی ہم سفر میں چاہییں، وہ کسی دوسری لڑکی میں نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ اس نوعیت کی محبت نہیں جیسی آج کل معاشرے میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ ہمارے گھرانے دینی ہیں۔لڑکی اور لڑکا دونوں پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں۔دونوں کا کہنا ہے کہ ہم کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں گے جس سے دونوں خاندانوں کی بدنامی ہو۔یقیناً خط وکتابت ان کی غلطی ہے، لیکن کیا رشتہ نہ دینا درست رویہ ہے؟ کتاب وسنت سے لڑکی کے والدین کے لیے کیا رہنمائی ملتی ہے؟

جواب: رشتوں کے سلسلے میں شریعت نے جو ضابطے طے کیے ہیں اگر لوگ ان کی پابندی کریں تو وہ مشکلات سے دوچار نہ ہوں۔شریعت نے نکاح کے معاملے میں والد یا ولی کے حق کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ نکاح کا معاملہ اس کے ذریعے طے کیا جائے۔نکاح کے خواہش مند براہِ راست لڑکی سے معاملہ طے کرنے کی بجائے اس کے والد یا ولی سے معاملہ طے کریں۔پھر نکاح کے لیے والد ایک مجلسِ نکاح منعقد کرے اور اس میں نکاح کیا جائے۔رہی یہ بات کہ نکاح کس سے کیا جائے، اگر اس معاملے میں لڑکی اور والد کے انتخاب میں اختلاف پیدا ہو جائے تو شریعت نے لڑکی کے حق کو فائق رکھا ہے۔نکاح اسی جگہ کیا جائے گا جہاں لڑکی چاہتی ہو۔اور والد کو برادری یا پنچایت یا

عدالت مجبور کرے گی کہ وہ لڑکی کی خواہش کے مطابق اس کا نکاح کرے۔ اس میں صرف ایک شرط ہے وہ یہ کہ لڑکی ایسے لڑکے سے شادی کا مطالبہ نہ کرے جو اس سے خاندانی، دینی اور پیشے کے لحاظ سے کمتر حیثیت کا مالک ہو۔

آپ نے اپنی ماموں زاد بہن کا جو قصہ نقل کیا ہے اس میں ان سے ایسی غلطی نہیں ہوئی جس کی سزا انھیں اس شکل میں دی جائے کہ ان کا آپس میں نکاح نہ کیا جائے۔ والد کو شرعاً اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ لڑکی کی جائز خواہش کو نظر انداز کر کے دوسری جگہ اس کا نکاح کرے۔ اس قسم کے جبر کی اسلام میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثیبہ (وہ عورت جس کی ایک مرتبہ شادی ہو چکی ہو اس کے بعد وہ مطلقہ یا بیوہ ہو چکی ہو) اپنے نفس کی زیادہ حق دار ہے اپنے ولی کے مقابلے میں، اور باکرہ سے اس کے نکاح کے بارے میں اذن لیا جائے گا اور اس کا اذن اس کی خاموشی ہے۔ (مسلم، ترمذی، ابوداؤد، سنن نسائی، ابن ماجہ) حضرت خنساءؓ بنت حذام انصاریہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کا نکاح کر دیا تھا درآں حالیکہ وہ ثیبہ تھیں۔ انھوں نے اس نکاح کو ناپسند کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کو رد کر دیا۔ (بخاری، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا عورتوں سے ان کے نکاح کے بارے میں اذن طلب کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میں نے عرض کیا کہ اگر باکرہ سے اذن لیا جائے اور وہ شرم کی وجہ سے خاموش رہے تو پھر کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی خاموشی اس کا اذن ہے۔ اور ایک روایت میں ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی خاموشی اس کا اذن ہے۔ (متفق علیہ)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک باکرہ لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر ہوئی اور ذکر کیا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کر دیا ہے، درآں حالیکہ وہ اس نکاح کو ناپسند کرتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دے دیا۔(مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی)

یہ تمام روایات نیل الاوطار، باب ماجاء فی الاجبار والاستئمار سے نقل کی گئی ہیں۔ان روایات اور اس طرح کی دوسری روایات کو نقل کرنے کے بعد علامہ شوکانی ؒ لکھتے ہیں: ان احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ باکرہ بالغہ کا نکاح جب اس کی اجازت کے بغیر ہوگا تو نکاح صحیح نہ ہوگا۔ یہ اوزاعی، سفیان ثوری، اہلِ بیت اور حنفیہ کا مسلک ہے اور ترمذی نے اسے اکثر اہل علم کا مسلک قرار دیا ہے۔(نیل الاوطار، ج ۶، ص ۲۵۵)

ترمذی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ولی کی اجازت بھی ضروری ہے لیکن اختلاف کی صورت میں عدالت فیصلہ کرے گی: فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَهٗ (ترمذی، باب ماجاء لانکاح الابولی) اگر ولی اور لڑکی میں اختلاف ہو جائے تو پھر سلطان یعنی عدالت ولی ہوگی، اس کا جس کا کوئی ولی نہیں۔

ان سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کے ماموں کو اپنی بیٹی کے معاملے میں وہی فیصلہ کرنا چاہیے جو وہ چاہتی ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہِ راست اختیار کرنے کی توفیق سے نوازے۔آمین

(ترجمان القرآن، جون ۱۹۹۹ء)

لڑکی کی رضامندی: ایک وضاحت

سوال: ترجمان القرآن (جون ۱۹۹۹ء) میں آپ کا جواب بعنوان 'لڑکی کی رضامندی' شائع ہوا جو فی نفسہٖ درست موقف پر مبنی ہے، لیکن اس میں غصے یا ردِ عمل کی ایک بڑی بنیاد خط و کتابت وغیرہ کا سلسلہ ہے۔ ماضی کے معاشروں کی نسبت عصرِ حاضر کے مسائل و معاملات میں بہرحال تغیر واقع ہوا ہے۔ جس میں خط و کتابت، فون، ای میل، کلاس نوٹس اور تہنیت کارڈ وغیرہ سب کے موثر ہونے کا امکان موجود ہے۔ آپ نے اپنے جواب میں اس براہِ راست سلسلۂ جنبانی پر کلام نہیں کیا، جو میری ناقص عقل کے مطابق فتنے کا باعث بن سکتا ہے۔ براہِ کرم وضاحت فرمایئے، تاکہ سماجی سطح پر فتنے سے بچا جاسکے۔

جواب: آپ نے جس فروگزاشت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ حیا اسلامی تہذیب کا امتیاز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے۔ (ابن ماجہ، کتاب الزہد)

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی کہ آپ باکرہ پردہ نشین سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ [بخاری، کتاب الادب، باب ۷۲، ۷۷] اس میں اس بات کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں کسی بھی سطح پر رابطے رکھیں اور نامہ و پیام اور خط و کتابت اور میل ملاپ سے کام لیں۔ ہمارے معاشرے میں تو جس لڑکی کی نسبت ہو جاتی ہے تو وہ شادی سے پہلے منگیتر کے سامنے کسی بھی مجلس میں نہیں آتی۔ کسی دینی یا دنیوی ضرورت کے بغیر لڑکے اور لڑکی کے آپس میں سلام و کلام اور آمنے سامنے ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلامی سوسائٹی مخلوط مجالس اور خفیہ دوستیوں اور راز و نیاز کے سلسلوں سے پاک سوسائٹی ہوتی ہے۔ اس لیے جس جوڑے نے آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کے ذریعے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا فیصلہ کیا اس نے

اسلامی تہذیب کی خلاف ورزی کی اور شرم وحیا کی چادر کو تار تار کیا۔

میں نے اپنے جواب میں اس پر اس لیے کلام نہیں کیا تھا کہ سوال میں غلطی کے مرتکب جوڑے نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ انھوں نے ایسا کر کے شدید غلطی کی ہے۔ سوال ان کے اس طرزِ عمل کے بارے میں نہیں تھا بلکہ اس غلطی کے وقوع پذیر ہونے کے بعد مستقبل میں لڑکی کی مرضی کے علی الرغم شادی کے نہ کر دینے کا تھا۔ اس لیے میں نے اصل سوال پر کلام کرنے پر زیادہ توجہ دی اور غلطی کے ارتکاب پر بحث کرنے کی بجاے اسے محض غلطی کہنے پر اکتفا کیا لیکن اس سکوت اور اجمال کا نقصان بھی ہوسکتا ہے اور لوگ اس سے غلط نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں جیسے کہ آپ نے توجہ دلائی۔ اس لیے اس کا نوٹس لینا ضروری تھا۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۹۹ء)

رشتے میں حسب نسب کا لحاظ

سوال: آپ نے ترجمان القران، جون ۱۹۹۹ء میں لکھا ہے کہ [نکاح اسی جگہ کرایا جائے، جہاں لڑکی چاہتی ہو] شرط صرف یہ ہے کہ لڑکی ایسے لڑکے سے شادی کا مطالبہ نہ کرے جو اس سے خاندانی، دینی اور پیشے کے لحاظ سے کم تر حیثیت کا مالک ہو۔ اگر اسلام میں بھی ہندو مت کی طرح ادنیٰ اور اعلیٰ کی تمیز ہے تو پھر ہم ذات برادری کے چکر سے کیسے نکل سکتے ہیں؟ ایک موچی یا حجام کو جو محنت مزدوری کرتا ہے، کم تر کیوں سمجھا جائے؟ میرے خیال سے اگر لڑکے کی سیرت اچھی ہے، رزقِ حلال کے ذرائع ہیں، تو خاندان اور پیشے کی قید لگانا درست نہیں۔ ایک دینی رسالے میں اس طرح کی بات لوگوں کو دین سے دور کرتی ہے۔

جواب: 'مسئلہ کفاءت' کے بارے میں آپ نے جو لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اسلام میں فضیلت کا دارومدار ایمان اور علم وعمل پر ہے۔ حسب نسب اور پیشہ، فضیلت کے معیار نہیں ہیں۔ جن فقہا نے 'کفاءت' کا لحاظ کیا ہے وہ اس حقیقت کو مانتے ہیں۔ انھیں اس بات سے اختلاف نہیں ہے

اور اسی بنا پر تمام فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر ایک شخص مسلمان ہو تو کسی بھی حیثیت اور درجے کی خاتون کا اس سے نکاح جائز ہے۔ اگر لڑکی اور اس کے اولیا دونوں راضی ہوں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ فقہا نے 'کفاءت' کے مسئلے کو اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت اور اسلامی حکومت میں کسی عہدے اور منصب کے لیے اس کے امتیاز کی وجہ سے نہیں بلکہ دنیوی فوائد اور نقصانات کے لحاظ سے تسلیم کیا ہے۔ اس لیے کہ مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ مرد اور عورت کا آپس میں نکاح ہو جائے بلکہ اسے باقی اور مستحکم رکھنے اور دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات کو استوار کرنے کا بھی ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے لوگ دینی حیثیت کے ساتھ دوسری حیثیتوں کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ اسلام ان کی دینی حیثیت کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ دوسری حیثیتوں کو ملحوظ رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا: اَلْمَرْأَةُ تُنْكَحُ عَلٰى دِيْنِهَا وَمَا لِهَا وَ جَمَالِهَا فَعَلَيْكَ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ (ترمذی، کتاب النکاح) عورت کے ساتھ نکاح اس کے دین، مال اور جمال کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ پس تم دین والی کو ترجیح دو۔

جس طرح ایک لڑکا، لڑکی کی مختلف خوبیوں کو پیش نظر رکھتا ہے، اس طرح لڑکی اور لڑکی کے اولیا بھی لڑکے کے اندر مختلف خوبیاں تلاش کرتے ہیں۔ دین داری کے ساتھ وہ ان خوبیوں کو پیشِ نظر رکھ کر ردّ و قبول کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اس صورت میں ہے کہ جب لڑکی نے ایک شخص کو پسند کر لیا درآں حالیکہ وہ دنیوی خوبیوں کے لحاظ سے اس کے مقابلے میں کمتر درجے کا تھا اور ورثا اس پر راضی نہ ہوئے تو پھر کس کی بات کا اعتبار ہوگا؟ اسی طرح اگر ورثا نے ایسے شخص کو پسند کر لیا جو دنیوی وسائل کے لحاظ سے اس سے کم تر درجے کا نہیں تھا، لیکن لڑکی راضی نہیں ہے تو پھر کیا ہوگا؟ دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے کہ پھر کسی ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جس پر دونوں راضی بھی ہوں اور وہ لڑکی سے دنیوی درجے میں کم تر بھی نہ ہو۔ اگر ایسی صورت پر اتفاق نہ ہو سکے تو پھر لڑکی کی رضا مقدم ہوگی بشرطیکہ لڑکا درجے میں اس سے کم تر نہ ہو۔ اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ لڑکی کو شوہر کے تابع ہو کر رہنا ہے اور تابع کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی پوزیشن میں ہو کہ متبوع

کی اتباع کر سکے۔اس کی طرف سے کوئی بھی رکاوٹ نہ ہواور خاندان کی طرف سے بھی رکاوٹ نہ ہو۔ دنیوی، دینی اور اخلاقی لحاظ سے درجات کا فقہا نے جو اعتبار کیا ہے اس پر شروع دن سے تعامل ہے۔دینی اور اخلاقی حیثیت کے ساتھ پیشے کی حیثیت کو اس حد تک شریعت نے ملحوظ رکھا ہے کہ اگر لڑکی ان حیثیتوں میں لڑکے سے فائق ہو تو پھر مشورے اور اتفاق سے نکاح ہو، اس کے بغیر لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے۔اس میں لڑکی ،لڑکے اور دونوں خاندانوں کا فائدہ ہے اور نکاح کے رشتے کے دوام اور استحکام کا موجب ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے دنیوی سہولتوں میں فرق پڑتا ہے۔ایک حجام و دھوبی اور صفائی کے پیشے سے تعلق رکھنے والے شخص کو اٹھنے، بیٹھنے اور رہن سہن کی وہ سہولتیں حاصل نہیں ہوتیں جو ایک علمی گھرانے کی چشم و چراغ لڑکی کو حاصل ہوتی ہیں۔ایسی صورت میں اگر نکاح ہو گیا تو کتنی دیر تک گزارہ ہو سکے گا؟ لڑکی کے رشتہ دار کتنے عرصے تک تعلقات قائم رکھ سکیں گے؟ اس کے مقابلے میں اگر باہمی مشورے اور رضامندی سے ایسا ہو تو پھر امید پیدا ہو جاتی ہے کہ رشتہ مستحکم رہے گا اور لڑکی اور اس کے اولیا مشکلات برداشت کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔اس لیے ہمیشہ دین دار لوگ بھی اپنی لڑکی کے لیے رشتہ دیکھتے وقت دینی حیثیت کے ساتھ دوسری سہولتوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔دوسری سہولتوں کو پیشِ نظر رکھنا دین کے منافی نہیں ہے کیونکہ دین اس کی اجازت دیتا ہے۔ دین تو صرف اس بات کی مخالفت کرتا ہے کہ دین کو نظر انداز کر کے محض دنیوی حیثیتوں کی بنا پر رشتے قائم کیے جائیں یا دنیوی حیثیتوں کو فضیلت اور مقام و مرتبے کا معیار سمجھا جائے۔

(ترجمان القرآن ،اکتوبر ۱۹۹۹ء)

خواتین اور سفر

سوال: بغیر محرم کے سفر کے سلسلے میں چند سوالات درپیش ہیں۔ ان کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر کیا ہے؟

۱- کسی خاتون کا ایک شہر کے اندر ایک مقام سے دوسرے مقام تک بذریعہ ٹیکسی، رکشہ یا کسی اور سواری میں تنہا سفر کرنا جو ۲۰-۲۵ کلومیٹر طویل ہو۔

۲- ایک شہر سے دوسرے شہر تک، بغیر محرم بذریعہ بس یا ریل سفر کرنا۔

۳- گھریلو ڈرائیور یا دفتری ملازم ڈرائیور کے ہمراہ سفر کرنا۔

۴- چند خواتین کا مشترکہ طور پر ایک نامحرم کے ہمراہ سفر کرنا۔

۵- محرم کے بغیر ۲-۳ گھنٹے کا فضائی سفر کرنا۔

۶- نامحرم کا عمر میں ۶۰ سال سے اوپر ہونا۔

۷- خاتون کا بڑی عمر کا ہونا۔

۸- دور دراز مقام پر عورت کا بغیر محرم، خواتین کے درمیان چند روز قیام کرنا۔

۹- شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ عورت کا بغیر محرم سفر کرنا، کیا دونوں میں کوئی فرق ہے؟

۱۰- تبلیغی مقاصد کے لیے سفر کرنے اور نجی سفر کرنے میں کیا محرم و نامحرم کے حکم میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے؟

جواب: شریعت نے سفر کے لیے خواتین کو کچھ اصولی ہدایات دے دی ہیں جن کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک عورت ایک دن رات کا سفر بغیر محرم کے نہ کرے اور ایک روایت میں تین دن رات کے سفر کا ذکر ہے۔

دوسری ہدایت یہ ہے کہ کوئی خاتون کسی غیر محرم مرد کے ساتھ تنہائی اختیار نہ کرے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ایک عورت کسی مرد کے ساتھ تنہائی نہ کرے گی مگر ان کا تیسرا شیطان ہوگا۔

(ترمذی، کتاب الرضاع، باب ۱۶)

فقہا نے تین دن رات محرم یا خواتین کی جماعت کے بغیر سفر کرنے کو ناجائز کہا ہے اور ایک دن رات کے سفر کو محرم یا خواتین کی جماعت کے بغیر، خلافِ اولیٰ کہا ہے۔ اسی طرح وہ تنہائی بھی جائز نہیں ہے، جس میں کوئی دوسرا نہ آ سکتا ہو اور دروازے بند ہوں۔ ان دو اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔ ان اصولوں کی روح یہ ہے کہ سفر تھوڑا ہو یا زیادہ، اس کو پرامن بنانا ضروری ہے لیکن اس کا اہتمام مختلف خواتین کے لحاظ سے مختلف ہے۔ اس لیے اس کا کوئی متعین ضابطہ نہیں دیا جا سکتا بلکہ حالات کے لحاظ سے ایک خاتون اپنے شوہر اور گھر کی دوسری خواتین اور نظمِ جماعت کے مشورے سے اس کا تعین کرے گی۔ بعض اوقات دو تین خواتین ایک گاڑی میں متعارف معتمد علیہ اور قابلِ اطمینان ڈرائیور کے ساتھ سفر کر سکتی ہیں لیکن ناواقف ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ نہیں۔ اس طرح کی صورتوں کے لیے شریعت میں استفت قلبك (اپنے دل سے فتویٰ پوچھو) کا اصول آیا ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں اسے 'رائے مبتلیٰ بہٗ' کہا جاتا ہے، یعنی جو خاتون یا شخص مسئلے سے متعلق ہے، اس کی رائے کا اعتبار ہوگا۔ جہاز، بس، گاڑی میں سفر کرنے کی جو مختلف صورتیں ہیں، ان سب میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ فتنے کا خطرہ نہ ہو اور حفاظت کا انتظام ہو۔ بعض اوقات ایک نیک اور بزرگ عمر کے آدمی کی معیت میں خواتین کی ایک جماعت اطمینان سے سفر کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں بغیر محرم کے سفر کی اجازت ہوگی۔ ۲۰، ۲۵ میل یا اس سے کم مسافت کے بارے میں فیصلہ مذکورہ اصولوں کی روشنی میں باہمی مشورے سے کیا جانا چاہیے۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ آج کل ڈکیتی، دہشت گردی، عصمت وعفت پر حملے کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں، ان سے حفاظت کا بھی پورا اطمینان کر لیا جائے۔ شہروں میں بسوں اور ویگنوں میں، ٹیکسیوں اور رکشوں میں اکثر سفر پرامن ہوتا ہے لیکن بعض ٹیکسیوں اور رکشتوں والے ڈکیتیوں میں ملوث لوگوں سے منسلک ہوتے ہیں، ایسے حالات میں مشتبہ اور مشکوک رکشہ ڈرائیور کے ساتھ سفر سے اجتناب کرنا چاہیے۔ خصوصاً ایسے وقت اور جگہ میں جس میں ڈرائیور کوئی کارروائی کرنے

کی پوزیشن میں ہو۔

اس اصولی جواب میں بیش تر سوالوں کا جواب آ گیا ہے۔اس کی رو سے سوال نمبرا سے لے کر سوال نمبر۵ تک میں بیان کردہ ساری صورتیں جائز ہوسکتی ہیں، اگر سفر میں کسی قسم کے فتنے کا خطرہ نہ ہو، اور یہ صورتیں ناجائز ہوں گی اگر کسی قسم کا خطرہ ہو۔ یہ فیصلہ شخصِ متعلق کو خود کرنا ہے کہ خطرہ ہے یا نہیں۔شریعت اس چیز کو اس پر چھوڑتی ہے۔

چھٹے سوال کا جواب یہ ہے کہ نامحرم کا عمر میں ۶۰ سال سے اوپر ہونا، خاتون کا بڑی عمر کا ہونا، یہ چیزیں فتنے سے اطمینان پیدا کرتی ہیں بشرطیکہ متعلقہ خاتون کو اطمینان بھی ہو اور وہ ایسی صورت میں اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ سمجھتی ہو۔ساتویں سوال کا جواب وہی ہے جو ایک سے پانچ تک کے سوالات کا ہے اور آٹھویں سوال کے بارے میں عرض ہے کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے لحاظ سے بھی بعض اوقات فرق واقع ہوتا ہے۔

تبلیغی سفر اور نجی سفر اپنے احکام کے لحاظ سے برابر ہیں کہ دونوں میں فتنے سے اطمینان لازمی ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۹۷ء)

خواتین اور جینز کا استعمال

سوال: میری خالہ کافی عرصے کے بعد امریکہ سے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ آئی ہیں۔ان کی بیٹیاں جینز پہنتی ہیں، لیکن جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں تو سارے کپڑے چادر سے چھپا کر نکلتی ہیں۔سر کے بال تک چھپے ہوئے ہوتے ہیں، جوتیاں اور تھوڑی تھوڑی جینز نظر آ رہی ہوتی ہیں۔ میں نے بہت دفعہ اپنی کزن کو جینز پہننے سے منع کیا۔لیکن وہ کہتی ہیں کہ جینز پہننا کوئی گناہ نہیں ہے۔ نہ یہ مردوں کی مشابہت ہے اور نہ کافروں کی۔ وہ یہ جواز پیش کرتی ہیں کہ آج پوری دنیا میں عورتیں پینٹ پہن رہی ہیں۔امریکہ میں بھی مسلم عورتیں پہنتی

ہیں۔ایران، سعودی عرب، دبئی، ترکی اور خود پاکستان میں بھی عورتیں پہنتی ہیں۔اب ہم اگر کسی لڑکی کو پینٹ پہنا ہوا دیکھیں تو ہم اسے کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اب یہ لباس مسلمانوں میں بھی رواج پا چکا ہے۔کافروں کی مشابہت یہ تب ہوتی جب اسے صرف کافر ہی پہنتے۔ اگر پینٹ چست نہ ہو، ڈھیلی ڈھالی ہو، شرٹ پینٹ کے اندر نہ ہو بلکہ باہر ہو، اور کم از کم رانوں تک ہو، اور ستر نمایاں نہ ہو، تو پینٹ جائز ہے۔رہی یہ بات کہ یہ مردوں کی نقل ہے، تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں جس طرح عورتوں اور مردوں کی شلواریں ایک جیسی ہوتی ہیں، اسی طرح سب جگہ پر پینٹ بھی مردوں اور عورتوں کی ایک جیسی ہیں۔اگر کوئی لڑکی پینٹ کوٹ پہنے یا مردانہ قمیص شلوار پہنے، یا کوئی خاص مردوں کا لباس پہنے تو وہ مردوں کی نقل ہوگا اور اسی طرح کوئی عورت کافر عورتوں کا مخصوص لباس پہنے تو وہ کافروں سے مشابہت ہے۔اگر آپ میرے سوال کا جواب دے دیں تو مجھے اور میری کزن کو مسئلے کا اسلامی حل مل جائے گا۔

جواب: لباس کے بارے میں اصولی ہدایات سورۃ الاعراف، آیات ۲۶ – ۲۸، ۳۱ – ۳۲ میں دی گئی ہیں۔ان میں سے ایک اصولی ہدایت یہ ہے کہ لباس تقویٰ کا ہو۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لباس التقویٰ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

......انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعۂ ستر پوشی اور وسیلۂ زینت وحفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت اس معاملے میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر وغرور اور تکبر وریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو اور پھر ان ذہنی امراض کی نمایندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمایش کرنے لگتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا اشتہار بن جاتی ہے۔[1]

ایک قوم کا دوسری قوم کے مشابہ بننے سے یہی مراد نہیں ہے کہ ان کے شعار کو اپنائے بلکہ ان

۱- تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۰، الاعراف، حاشیہ ۱۶۔

کے طور طریقوں، وضع قطع، تراش خراش کو اپنانا بھی ان کے مشابہ بننا ہے۔ پھر دوسری قوموں کے ساتھ مشابہت کے علاوہ مسلمانوں میں ایسے لوگ اور ایسے طبقات جو دوسروں کی تہذیب و روایات اور ان کے رہن سہن کو اپنائے ہوئے ہوں، ان کے لباس کو پہنتے ہوں، ان کے ساتھ بھی مشابہت نہ ہو، بلکہ صلحا اور متقین جو اسلامی تہذیب و اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ وصحابیات اور مرد و خواتین سلفِ صالحین کے لباس کی یاد تازہ کرتے ہوں، ان کی پیروی اور نقالی کرنے والے ہوں، ان کے ساتھ مشابہت کرنے والے اہل تقویٰ اور اسلامی اقدار و روایات کو اپنانے والوں کی شکل اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ظاہر کا اثر باطن پر بھی ڈال دے گا۔ تواضع اور انکساری کا لباس آدمی میں تواضع و انکساری پیدا کرتا ہے اور تکبر و غرور کا لباس آدمی میں تکبر و غرور پیدا کرتا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اس آیت کی تفسیر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

لباس تقویٰ کے لفظ میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ ظاہری لباس کے ذریعے ستر پوشی اور زینت، تجمل، سب کا اصل مقصد تقویٰ اور خوفِ خدا ہے جس کا ظہور اس کے لباس میں بھی اسی طرح ہونا چاہیے کہ اس میں پوری ستر پوشی ہو، کہ قابلِ شرم اعضا کا پورا پردہ ہو، وہ ننگے بھی نہ رہیں، اور لباس بدن پر ایسا چست بھی نہ ہو جس میں یہ اعضا مثل ننگے کے نظر آئیں۔ نیز اس لباس میں فخر و غرور کا انداز بھی نہ ہو بلکہ تواضع کے آثار ہوں، اسرافِ بے جا بھی نہ ہو، جو اللہ کے نزدیک مبغوض ومکروہ ہے۔ لباس کے ساتھ اخلاق و اعمال کی درستی بھی ہو، جو لباس کا اصل مقصد ہے۔[1]

آپ نے جینز کی جو صورت تحریر کی ہے، وجہ بے شک وہی ہو جو آپ نے لکھی ہے کہ ساتر ہو، اس میں مردوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو، لیکن یہ ہمارے معاشرے کی نہیں، بلکہ مغربی معاشرے کی ایجاد اور مغرب کا لباس ہے۔ آپ تو بے شک اسے اس طرح استعمال کریں گی جو ساتر ہوگی، لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے تو یہ ساتر نہیں ہے بلکہ اصل میں یہ مغربی لباس کی نقالی ہے۔ اس کے بجائے آپ اسلامیت اور پاکستانیت کو پھیلائیں، پاک و ہند کے دینی گھرانوں کو

۱- معارف القرآن، سوم، ص ۵۳۶۔

پیشِ نظر رکھیں۔ آپ پاکستان اور عالمِ اسلام کی صالحات کی پیروی کریں۔ اس سے دینی اور اسلامی ذہنیت نشوونما پائے گی، آخرت کی فکر پیدا ہوگی اور نیک خواتین کی طرح آپ میں بھی نیکی کا جذبہ پیدا ہوگا۔

نیک لوگوں کا لباس نیکی اور برے لوگوں کا لباس برائی کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ انسان کا لباس اور انسان کی صحبت تو آدمی پر اثر انداز ہوتی ہی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بکریوں والوں میں مسکنت اور تواضع پائی جاتی ہے اور اونٹوں کی دموں کو پکڑ کر چلنے والوں میں فخر و غرور پایا جاتا ہے۔ لباس دراصل ذہناً اہلِ لباس کی صحبت کے مترادف ہے [یعنی آپ جس قسم کے لوگوں کا لباس پہنتے ہیں گویا کہ آپ اُن کے ہم نشین بنتے ہیں] اور اس پر وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو صحبت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہماری طرف سے آپ کی کزن سے گزارش ہوگی کہ وہ جینز کے استعمال کو ترک کر دیں۔ اس پر ان کو ان شاء اللہ اجر ملے گا۔

آپ کی کزن نے ایران، سعودی عرب اور پاکستان کے جن اونچے گھرانوں کی خواتین کا حوالہ دیا ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ یہ وہ خواتین ہیں جو مغربی تہذیب کی نقالی کرتی ہیں اس لیے آپ ان سے کہہ دیجیے۔ کہ ان کی بجائے دنیا کے اسلامی گھرانوں کی خواتین کو اپنے لیے نمونہ بنائیں جو مغربی تہذیب سے متاثر اور اس کی دلدادہ نہیں۔ وہ مغربی تہذیب کو باعثِ عزت و فخر سمجھنے کی بجائے اسلامی تہذیب و روایات کی قدر کرتی ہیں اور اس میں شرف و وقار سمجھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق سے نوازے۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۷ء)

نماز باجماعت میں شرکت

سوال: ہمارے ملک کی کچھ مسجدوں میں خواتین کے لیے نمازِ جمعہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اور اب رمضان میں تراویح کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ یہ خیال رکھا گیا ہے کہ تمام شرعی حدود و قیود کی پاسداری ہو، مثلاً یہ کہ ان کے آنے جانے کے راستے مردوں سے الگ اور محفوظ ہوں، ان کی نماز کی جگہ پردے میں اور مردوں سے دوری پر ہو، وضو اور طہارت کا معقول انتظام ہو، ساؤنڈ سسٹم مناسب ہو، لیکن بعض ائمہ اور علما مخالفت کر رہے ہیں اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ خاتون کے گھر اور کمرے کی نماز، صحن اور مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ خواتین کو مسجد میں بلانا مناسب نہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: خواتین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس پر کتاب و سنت ناطق ہیں اور امت کا اجماع ہے۔ علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (اور ایک روایت میں مسلمة کے لفظ کا اضافہ بھی ہے) جو تحصیلِ علم کی فرضیت پر نصِ صریح ہے۔ تحصیلِ علم گھر میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے باہر نکلنا اور استاد کے پاس جانا پڑتا ہے۔ یہ صورت عملاً ممکن نہیں ہے کہ خواتین اپنے گھروں میں رہیں اور کوئی خاتون گھر گھر جا کر انھیں تعلیم دے۔ تاہم بالفرض اس صورت کو اختیار کر لیا جائے تو اس میں ایک خاتون کا گھر سے نکل کر دوسری جگہ جانا لازم آئے گا۔ حدیث میں تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہؓ سے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ نے تمھیں اجازت دی ہے کہ تم اپنی حاجت کے لیے باہر نکلو۔ (بخاری، کتاب الوضوء، باب خروج النساء الی البراز) جن حاجات کے لیے باہر نکلنے کی اجازت ہے ان میں تحصیلِ علم بھی شامل ہے۔ خواتین کی تعلیم و تربیت کے جو مختلف مواقع میسر ہیں ان سے استفادہ کیا جائے گا اور انھیں ان مواقع سے استفادے کی ترغیب دی جائے گی۔ ان مواقع میں جمعہ، عیدین، وعظ اور درسِ قرآن کے اجتماعات شامل ہیں۔ اسی طرح اب دینی مدارس بھی قائم کر دیے گئے ہیں جن میں

بچیوں کو قرآن وحدیث، عربی زبان اور فقہِ اسلامی کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان میں تحریکی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ ان مدارس میں بچیوں کو داخل کرنا بھی جائز ہے اور ہمارے ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے علما نے ایسے مدارس قائم کیے ہوئے ہیں جن میں طالبات باقاعدہ قیام پذیر ہوتی ہیں اور ان کے تحفظ کا پورا پورا اہتمام ہوتا ہے۔ دراصل اس سلسلے میں لوگ اِفراط وتفریط کا شکار ہیں۔ جس چیز کو شریعت نے منع کیا ہے اس کے ساتھ جائز چیز کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور پھر مطلوب اور غیر مطلوب میں بھی فرق نہیں کرتے۔

شریعت نے خاتون کو مَحرم کے بغیر یا خواتین کی جماعت کے بغیر سفر کرنے سے روکا ہے۔ لیکن مسافتِ سفر سے کم مسافت میں وہ مَحرم کے بغیر بھی باہر نکل سکتی ہے، جب کہ فتنے کا خوف نہ ہو اور ولی یا شوہر کی طرف سے اجازت ہو۔

مسجد میں نماز باجماعت میں شرکت کی اسے ترغیب تو نہیں دی گئی لیکن اجازت دی گئی ہے۔ پانچ وقت کی نماز ہو یا نمازِ جمعہ، عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ گھر میں نماز پڑھے اور یہ بھی جائز ہے کہ مسجد میں آ کر نماز باجماعت ادا کرے۔ اس کے مقابلے میں مرد کے لیے گھر میں بلاعذر شرعی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

عیدین میں چونکہ مقصود اہلِ اسلام کی شوکت کا اظہار بھی ہوتا ہے اس لیے عیدین میں خواتین کی شرکت کی ترغیب آئی ہے۔ اس لیے جو لوگ خواتین کے لیے مسجد میں نماز کا اہتمام کرتے ہیں ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح مسجدوں میں آ کر نمازیں پڑھیں تاکہ انھیں ثواب زیادہ ملے، بلکہ مقصد نمازِ جمعہ، عیدین اور دیگر مواقع پر خطبات اور مواعظ اور دروس سے استفادے کی ترغیب دینا ہے۔ تعلیم وتربیت کے لیے گھر سے باہر نکلنا، مسجد میں جانا، مدرسے میں حاضر ہونا، اسکول، کالج اور یونی ورسٹی میں جانا کسی کے نزدیک بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے ملک کے علما ایک عرصے سے اس کی فکر کر رہے ہیں۔ انھوں نے مساجد کے ساتھ خواتین کے لیے گیلریاں وغیرہ بنوانے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے اور بعض خواتین کو اس بات

کی ترغیب بھی دیتے ہیں کہ وہ مسجدوں میں آئیں اور وعظ اور درس سے استفادہ کریں۔

جن احادیث میں خواتین کی نمازوں کو گھروں میں افضل قرار دیا گیا ہے وہ تعلیم و تربیت کے لیے مسجد اور مدرسے میں جانے سے متصادم نہیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کسی بھی دور میں تحصیلِ علم کے لیے خواتین کو مسجدوں اور مجالسِ تعلیم و تعلّم اور وعظ و تبلیغ میں جانے سے نہیں روکا گیا بلکہ اس پر تعامل رہا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تو جیسا کہ آغاز میں ذکر کیا گیا ہے، تحصیلِ علم ممکن ہی نہیں۔

نیز موجودہ دور میں جب کہ مغرب خواتین کو اسلام کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہمارے ملک میں مغرب زدہ خواتین لادینیت کے فروغ کے لیے میدانِ عمل میں نکلی ہوئی ہیں، جلسے منعقد کرتی اور جلوس نکالتی ہیں، اخبارات میں بیانات دیتی ہیں اور اسلامی اقدار و روایات اور احکامِ شریعت کا مذاق اڑاتی ہیں، ضروری ہے کہ اسلام پسند خواتین کو تحریکی کام کی تربیت دی جائے تاکہ وہ پُرامن حالات میں شرعی حدود میں رہ کر اسلام کے لیے باہر نکلنے کی تربیت حاصل کر سکیں اور مغرب زدہ خواتین کو جواب دے سکیں۔ مغرب زدہ خواتین کے مقابلے میں اسلام پسند خواتین ہی کو آگے آنا چاہیے۔ مردوں کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ خود ان خواتین کے مقابلے میں میدان میں نکل کر کام کریں۔ اس لیے خواتین کے لیے نمازِ جمعہ اور دیگر مواقع سے استفادے کا انتظام وقت کی ضرورت ہے اور خواتین کے دینی حقوق کے حوالے سے شریعت کے منشا کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔

نمازِ جمعہ کی طرح تراویح کے لیے بھی خواتین کا انتظام ہونا چاہیے تاکہ جو خواتین پورا قرآنِ پاک سننا چاہیں وہ سن سکیں نیز تراویح کے موقع پر قرآنِ پاک کے مضامین کا جو خلاصہ پیش کیا جاتا ہے یا کوئی دوسرا تعلیمی و تربیتی پروگرام ہوتا ہے، اس سے بھی استفادہ کر سکیں۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۶ء)

عورت کی امامت

سوال: روزنامہ پاکستان لاہور کی اشاعت ۱۴نومبر ۹۱ء میں 'ڈاکٹر جاوید اقبال اور ناصرہ جاوید، علم دوستی اور روشن خیالی کا مظہر گھرانہ' کے عنوان سے ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویو لینے والی بھی ایک خاتون صحافی ہے۔ موصوفہ رقمطراز ہیں:

ڈاکٹر جاوید اقبال کی خوب صورت لائبریری میں جب میں نے فقہ، قانون، تاریخ اور علوم وفنون کی کتابوں کا ذخیرہ دیکھا تو میں پوچھنے پر مجبور ہوگئی کہ ان کتابوں کے مطالعے سے اور فقہی مسائل پر غور کے بعد آپ کے نزدیک اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ اور حدیث میں سے دو واقعات سنائے:

۱- ایک بار رسولؐ نے ایک خاتون کو امامت کے لیے مقرر کیا اور وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک امامت کرتی رہیں۔

۲- اسی طرح امام شافعیؒ کو شریعت اور سنت کی تعلیم ایک خاتون نے دی اور جب وہ فوت ہوئے تو اس خاتون نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

جواب طلب بات یہ ہے کہ کیا اسلام میں عورت کی امامت جائز ہے؟

جواب: جو لوگ بغیر علم کے امام بن جاتے ہیں یا امام بن جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اسی طرح کی امامت کرتے ہیں جس طرح کی امامت کے بے سند واقعات ڈاکٹر جاوید اقبال نے بیان کیے ہیں، محض اس بنیاد پر کہ: ع

مستند ہے ان کا فرمایا ہوا

تاریخ وسیرت کا ذخیرہ خواتین کی امامت کے تذکرے سے خالی ہے۔ اگر خواتین کی امامت جائز ہوتی تو جلیل القدر خواتین حضرت فاطمہؓ الزہرا، ازواجِ مطہرات اور دیگر خواتینِ اسلام کے تذکرے اس سے خالی نہ ہوتے۔ آپ خود سوچیں کہ اگر امامت میں خواتین کا حصہ ہوتا تو اس کا استحقاق معروف اور مشہور خواتین کو ہوتا یا ایک غیر معروف خاتون کو۔ امامت تو دور کی بات

ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح حدیث ہے کہ عورت کی نماز اپنے گھر میں مسجد کی نماز سے بہتر ہے اور گھر میں بھی سامان کے حفاظتی کمرے میں نماز، گھر کے دوسرے کمروں (جن میں آمد و رفت ہوتی ہے) سے بہتر ہے۔(ترمذی)

نیز عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے اپنے شوہروں سے اجازت لے کر جائیں۔اس لیے شوہروں کو آپؐ نے تلقین فرمائی کہ اگر عورتیں نماز پڑھنے کے لیے مسجدوں میں جانا چاہیں تو انھیں منع نہ کرو۔نیز فرمایا: عورتوں کی نماز عورتوں کی آخری صف میں بہتر ہے بہ نسبت عورتوں کی پہلی صف کے۔(کیونکہ عورتوں کی پہلی صف مردوں کی آخری صف سے قریب ہوگی اور ان کی آخری صف مردوں سے دور ہوگی)۔امتِ مسلمہ کا ہمیشہ سے تعامل چلا آرہا ہے کہ کسی بھی دور میں عورتیں امام نہیں بنیں۔حیرت ہے کہ جو لوگ تحقیق کے مبادی سے بھی واقف نہیں ہیں وہ محقق بن جاتے ہیں۔ڈاکٹر جاوید اقبال اگر اسلام کے حوالے سے بات کرنا چاہتے ہیں تو انھیں قرآن وحدیث اور امتِ مسلمہ کی تاریخ سے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ انھیں اگر اس پورے ذخیرے سے بزعمِ خویش کوئی ثبوت ملا ہے تو وہ دو خواتین کے واقعات ہیں جو بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ عورتوں کے لیے یہ مقام و مرتبہ نہیں ہے ورنہ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہوتی۔ان کے بیان کے مطابق اگر ان کی بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف دو خواتین کو پوری اسلامی تاریخ میں ان کا حقیقی مقام ملا۔(نعوذ باللہ) گویا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے دور سے آج تک پوری اسلامی تاریخ میں عورتوں کو ان کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔اور اب اس دور میں بزعمِ خویش ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب عورتوں کو ان کے حقوق دے کر انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں۔بات صرف اتنی ہے کہ خاتون، خواتین کی امام بن سکتی ہے۔اس طرح سے کہ مرد امام کی طرح صف سے آگے ہو کر تنہا نہ کھڑی ہو بلکہ صف میں کھڑی ہو۔اور یہ بھی صرف جواز کے درجے میں ہے اگر کسی خاتون یا خواتین کو اس کا شوق ہو تو وہ امامت کر سکتی ہیں۔لیکن یہ بھی معمول نہیں بن سکتا۔امِ ورقہؓ شہیدہ کو نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے اس بات کی اجازت دی تھی اور وہ اپنے گھر کی خواتین کو امامت کراتی تھیں۔

قَدْ رُوِیَ عَنْ اُمِّ وَرْقَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَذِنَ لَھَا اَنْ یُّؤَذَّنَ لَھَا وَیُقَامُ وَتَؤُمُّ نِسَآءَ اَھْلِ دَارِھَا۔ (المغنی لابن قدامہؒ) بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ورقہؓ کو اجازت دی تھی کہ ان کے لیے اذان دی جائے اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنے گھر کی خواتین کی امامت کیا کریں۔

یہ بات قطعاً غلط ہے کہ امام شافعیؒ کا جنازہ کسی خاتون نے پڑھایا تھا۔ اس موضوع پر مزید تفصیل اور تحقیق کی ضرورت ہو تو آپ اس موضوع پر تحریر کردہ کتب کا مطالعہ کریں۔ ان کتب میں سے ایک عمدہ کتاب مولانا گوہر رحمان کی کتاب عورت کی سربراہی اور دوسری مولانا فضل الرحمٰن بن محمد کی تصنیف ہے جسے انجمنِ اہلِ حدیث، مسجد مبارک، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۲ء)

خواتین کے لیے شہادت کا درجہ

سوال: میں نے قرآن پاک کی تفسیر میں پڑھا ہے کہ مرد شہید کے لیے خدا نے طرح طرح کے انعامات کے وعدے کیے ہیں۔ آپ قرآن وسنت کے حوالے سے یہ واضح فرمائیے کہ خواتین اس درجے کو کیسے پاسکتی ہیں اور ان کو وہ مراعات کن کاموں سے مل سکتی ہیں؟

جواب: خواتین شہادت کے درجے کو شہادت کی تمنا کر کے پاسکتی ہیں۔ وہ یہ ارادہ رکھیں کہ اقامتِ دین اور دین کی سربلندی اور غلبے کے لیے انھیں جب بھی بلایا جائے گا تو وہ نکلیں گی، اور اگر جان دینے کی ضرورت پیش آئی تو جان کی قربانی بھی دیں گی۔ ایسی صورت میں وہ محض ارادے کے سبب سے شہید لکھی جائیں گی۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کو کسی وجہ سے کر نہیں پاتا تو اس کے لیے وہ نیکی لکھ دی جاتی ہے اور جو اسے عملی جامہ پہنا لے تو اسے ۱۰ گنا سے لے کر ۷۰۰ گنا تک ثواب ملتا ہے۔ (بخاری کتاب الرقاق،

مسلم، کتاب الایمان)

اللہ تعالیٰ کا کتنا فضل و احسان ہے کہ محض ارادے سے، بغیر کسی عملی قربانی کے، اس کی قربانی شہادت کی شکل میں لکھ دی جاتی ہے۔ خواتین کو جہاد کے لیے اس وقت پکارا جاتا ہے جب تعداد کم ہونے کی وجہ سے مرد جہاد کے لیے کافی نہ ہوں اور خواتین کے بلاوے کی ضرورت ہو۔ ایسی صورت میں ان کے لیے فرض ہوتا ہے کہ وہ میدان میں نکل آئیں۔ عام حالات میں ان کا جہاد، حج اور تعلیم و تعلم ہے۔ خواتین تعلیم و تربیت کا کام کریں، یہ بڑا جہاد ہے۔ یہ وہ اصل جہاد ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہے۔ ۲۳ سال تک قرآن پاک پڑھا اور پڑھایا۔ یہی تو اصل جہاد تھا۔ پہلی چیز تو جہاد کا علم اور جذبہ ہے۔ اس کے بعد جہاد کا عمل ہے۔ اسی طرح پہلی چیز شہادت کا علم ہے۔ اگر شہادت کا علم کسی کو نہ ہو، تو دنیا شہادت کے لیے تمنا کب اور کیسے کر سکتی ہے۔

بنابریں واضح ہو گیا کہ علم' جہاد اور شہادت کا موقوف علیہ ہے۔ علم کے اوپر سوائے نبوت کے اور کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ خواتین اپنے دائرے میں رہ کر سنتوں پر عمل کریں تو ان کی موت شہادت کی موت ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے، میری امت میں فساد کے وقت، میری سنت کو زندہ کیا اس کے لیے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ (ترمذی، کتاب العلم)

سنتوں کو زندہ کرنا شہادت ہے تو اقامتِ دین کی سنت تو تمام سنتوں کا موقوف علیہ ہے۔ پس اس سنت کو زندہ کرنا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا جہاد ہے اور ان کو زندہ کرتے ہوئے جو عورت فوت ہو گئی، تو شہید ہوگی۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، فروری ۲۰۰۱ء)

بیوٹی پارلر کا کاروبار

سوال :۱- میں بیوٹیشن کا کورس کر کے بیوٹی پارلر کھولنا چاہتی ہوں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا اس کی کمائی جائز ہے یا نہیں، کیونکہ اس میں میک اپ کیا جاتا ہے؟[۱]

۲- کیا بال کاٹنا گناہ ہے؟ اگر چٹیا موجود ہو، صرف سامنے سے تھوڑی سے لٹیں کاٹ دی جائیں تو یہ بھی ناجائز ہے؟

جواب: جو کام جائز ہو اس کی اجرت بھی جائز ہوتی ہے اور جو کام ناجائز ہو یا ملا جلا ہو اس کی آمدن بھی ناجائز ہوتی ہے اس لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ بیوٹی پارلر کھولنے کا ارادہ ترک کر دیں کیونکہ اس میں زیادہ تر ناجائز کاموں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور اس کی خاطر آپ جو کورس کرنا چاہتی ہیں اس کا خیال بھی دل سے نکال دیں۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۸۷ء)

۱- بیوٹی پارلر میں سیدھا سادا میک اپ ہی نہیں کیا جاتا جیسے کہ آپ نے معصومانہ انداز میں لکھا ہے۔ حدیث میں جو واضح ہدایات عورتوں کے بالوں اور بھنوؤں اور آرائشوں کے متعلق ہیں، ان کی خوب اچھی طرح خلاف ورزی ہوتی ہے۔ نیز جسم کے ممنوع الکشف حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولا جاتا ہے اور نوبت حمام کرنے تک بھی پہنچتی ہے۔ پھر اس تمدن کا پیدا کردہ ایک خاص مقصد 'حسن پرستی' اور 'حسن کا جنون' ذہنوں پر حاوی ہونا اور جنسی امور میں نظر فریبی کے طریقے ہیں۔ عورتیں ایسے مقامات پر جمع ہو کر نئے دور کی بے تکلفی کے سبب قابلِ اخفا امور پر ایسے انداز سے گفتگو کرتی ہیں کہ ان کی فطری دولت 'حیا' کا بہت زیاں ہوتا ہے۔ خاص طور سے ایسی جگہیں جہاں کھاتے پیتے اور اونچے گھرانوں کی بیگمات جمع ہوتی ہیں اور ان کے درمیان غریب یا کمزور طبقے کی عورتیں آ پھنسیں تو وہ سخت مرعوبیت اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں اور شریف خاندانوں کی نوعمر لڑکیاں (طالبات وغیرہ) تو کئی منازل بیوٹی پارلر میں طے کر لیتی ہیں۔ ان اڈوں میں غلط راستوں پر ڈالنے والی عورتیں بھی بہکا دینے کے لیے آ پہنچتی ہیں۔ کورس کے ساتھ ساتھ متعلقہ احادیث اور کچھ اور دینی لٹریچر بھی پڑھیں۔ (نعیم صدیقی)

خواتین، گھریلو فرائض اور تحریکی ذمہ داریاں

سوال: مسلمان عورت پر فریضۂ اقامتِ دین کے سلسلے میں کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور وہ اپنے گھریلو فرائض، جو اپنے شوہر، اولاد، گھر، والدین اور رشتہ داروں کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتے ہیں، کے ساتھ ان ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوسکتی ہے؟ وہ اپنے وقت کا کتنا حصہ گھریلو فرائض کی ادائیگی کے لیے مختص کرے اور کتنا حصہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے؟ نیز اس سلسلے میں عورت اپنے گھر والوں، خاوند، بچوں اور دیگر اہلِ خانہ کے مطالبات اور تحریکی نظم کے درمیان صحیح توازن کس طرح قائم کرسکتی ہے، خصوصاً جب کہ تحریکی نظم (ناظمۂ حلقہ) کی طرف سے یہ تقاضا ہو کہ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ تحریکی خواتین اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ تحریک کے لیے وقف کردیں اور گھر والوں کا تحریکی تعلق کے باوجود، یہ موقف ہو کہ عورت کو اپنے گھریلو فرائض کی قیمت پر تحریکی سرگرمیوں میں حصہ لینا بہرحال مناسب نہیں ہے؟ نیز اس بات پر بھی روشنی ڈالی جائے کہ آیا ایسے شوہروں کے رویے کو تحریکی پروگراموں کے دوران میں گفتگو اور تنقید کا موضوع بنایا جاسکتا ہے؟ اسی طرح، خواتین کے فطری اعذار مثلاً ماہانہ بیماری، حمل، زچگی وغیرہ کے دوران میں نظم کا رویہ اپنی کارکنوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا انھیں اپنی تحریکی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں رعایت دی جانی چاہیے یا نہیں؟

جواب: ۱- امت مسلمہ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ معروف کو قائم کرے اور منکر کو مٹائے۔ اور سب سے پہلا معروف اسلامی نظام کا قیام ہے اور قیام کے بعد یہ کہ اسے قائم رکھا جائے۔ یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے اس لیے امتِ مسلمہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے ایک جماعت قائم کردے جس کی اولین ذمہ داری یہی ہو کہ وہ اس کام کو سرانجام دے۔

۲- تحریکِ اسلامی اس فرض کو ادا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے جو صرف اس پر نہیں بلکہ

امت مسلمہ پر فرض ہے۔امتِ مسلمہ کے ایسے افراد جو اقامتِ دین کا نظریہ رکھتے ہوں اور اپنے طور پر کسی نہ کسی شکل میں اقامتِ دین کے لیے جدو جہد کر رہے ہوں یا تحریکِ اسلامی کی حمایت ومعاونت کر رہے ہوں یا کسی بھی ایسی تحریک کی حمایت ومعاونت کر رہے ہوں جو اقامتِ دین کے لیے جدو جہد کر رہی ہو تو وہ اپنے فرض کو ادا کرنے والے شمار ہوں گے۔

۳۔ یہ حکم ہر دور کے لیے ہے اور اس میں حالات کے اتار چڑھاؤ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔اس دور کو اس لحاظ سے ہنگامی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اسلامی نظام قائم نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کے ہنگامی دور میں اقامت دین کے فریضے کو ادا کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہر شخص مرد یا عورت میدان میں نکل کھڑا ہو بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ تحریکِ اسلامی اس کام کو کرے اور اس کے افراد اپنے دنیاوی کاموں پر اس کام کو ترجیح دیں۔ان کا اصل کام یہ ہو اور باقی کام ثانوی ہوں۔لیکن ایسی صورت میں یہ حکم نہیں ہے کہ اسی کام کو کریں باقی تمام کاموں کو چھوڑ دیں۔ باقی کام بھی کریں، لیکن ان کو ثانوی حیثیت دے کر۔اس سے خود بخود یہ اصول نکل آیا کہ اعذار کی صورت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا اور معذور افراد کے بجائے دوسروں سے کام لیا جائے گا۔

۴۔ چھوٹے بچوں کو دودھ پلانا، تحفظ کی معروف اور قابلِ اطمینان صورت کا میسر نہ آنا، حمل اور اسقاط ایسے اعذار ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اور ناظمہ کا فرض ہے کہ ان اعذار کو ملحوظ رکھ کر ڈیوٹی لگائے۔اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ اس انداز سے کام شروع کر دیا جائے کہ خاوند اس پر مطمئن نہ ہو۔اگر خاوند کا عدمِ اطمینان بے جا ہے تو اس وقت تک اس درجے میں کام لیا جائے جس سے خاوند مطمئن ہو اور بتدریج اس کو اعتماد میں لے کر آگے قدم بڑھائے جائیں۔

اقامتِ دین کے لیے بعض مراحل بہر حال ایسے آتے ہیں جن میں ہر مرد اور عورت کو، چاہے وہ معذور ہو یا غیر معذور، لازماً شرکت کرنا پڑتی ہے اور ان مراحل کو ایک مومن مرد یا عورت کا

ضمیر بھی خود بخوبی محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن تمام کے تمام مراحل ایسے نہیں ہیں کہ ان میں ہنگامی حالت کے حوالے سے عذرِ شرعی کو بھی معتبر نہ قرار دیا جائے۔ اصولی باتوں کے سلسلے میں یہ پہلی اصولی بات ہے۔ دوسری اصولی بات یہ ہے کہ جن مردوں اور عورتوں نے تحریکِ اسلامی میں شمولیت کر لی ہے انھیں سمجھنا چاہیے کہ انھیں اس کام کو دوسرے کاموں پر اوّلیت دینی ہے اور اس سلسلے میں نظم کی پابندی کرنی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ اس تحریک کے فرد کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لیے اعذار کے سلسلے میں کارکنوں کو اپنے سربراہ ناظم یا ناظمہ کو مطمئن کرنا چاہیے اور بلا اجازت غیر حاضری سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اختلاف کی صورت میں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کے بجائے بالائی نظم سے رجوع کرنا چاہیے۔

۵- خاوند کے بارے میں صرف ایسے وقت میں گفتگو کی جا سکتی ہے جب کسی معاملے میں اس سے متعلق کوائف مطلوب ہوں اور بیوی کے لیے شرعاً ضروری ہو جائے کہ وہ اس کے کوائف سے دوسروں کو آگاہ کرے۔ اس کے بغیر اس کی برائی بیان کرتے پھرنا غیبت کی تعریف میں آتا ہے۔

۶- آپ نے جن جزئیات کے بارے میں سوالات کیے ہیں ان میں سے ہر ایک کا جواب مذکورہ اصولوں کی روشنی میں معلوم کر لیں اور ضرورت پیش آئے تو متعلقہ ناظمہ سے ان کی روشنی میں تصفیہ کر لیں۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۸۶ء)

جنت کی نعمتیں اور خواتین

سوال: ایک بات ایسی ہے جس کے متعلق بہت دنوں سے آپ سے پوچھنے کا سوچ رہی ہوں۔ کیونکہ اگر میں کچھ زیادہ اس کے بارے میں غور کرتی ہوں تو میرا دل بار بار مجھے تنبیہ کرتا ہے کہ دیکھ، کہیں کفر کی سرحد میں تو داخل نہیں ہو رہی ہے؟ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ مسئلہ کن الفاظ میں آپ تک پہنچاؤں، اللہ تعالیٰ میرے قلم کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے!

جب ہم قرآنِ پاک کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر جگہ عورتوں اور مردوں کو یکساں احکامات دیے گئے ہیں اور بعض جگہ ان کو ان کی معاشرتی حیثیت کے لحاظ سے الگ الگ احکامات بھی دیے گئے ہیں۔ خوش خبریاں اور وعیدیں بھی دونوں کو اکثر جگہ ساتھ ساتھ ہی دی گئی ہیں لیکن بعض سورتوں مثلاً سورۂ رحمٰن اور سورۂ واقعہ میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں مردوں کے لیے خوبصورت حوروں کا ذکر ہے، جو بے انتہا خوبصورت ہوں گی اور جن کو کسی انسان اور جن نے نہیں چھوا ہوگا۔ ان سورتوں میں جس طرح ان کا ذکر آتا ہے۔ اس کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے باقی تمام خوش خبریاں صرف مردوں کے لیے ہی ہیں۔ عورت ہونے کی وجہ سے میرے دل میں سخت احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی ہوتا ہے۔ براہِ کرم مجھے اس سلسلے میں مطمئن کریں۔

جواب: قرآنِ پاک نے سورۂ رحمٰن یا دیگر سورتوں میں اہلِ ایمان کے لیے جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں مومنینِ صالحین اور مومناتِ قانتات دونوں اپنے اپنے درجے اور مرتبے کے مطابق حصہ دار ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے لحاظ سے ان کے مابین فرق نہیں رکھا گیا۔ سورۂ رحمٰن کی آخری آیات کے اسلوبِ بیان سے آپ کو جو شبہہ لاحق ہوا ہے، اگر آپ ان کا بغور مطالعہ فرماتیں، تو یہ اشکال پیدا نہ ہوتا۔

ان آیات میں دو طرح کی حوروں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو اپنے ایمان اور عملِ صالح کی بنا پر

جنت میں داخل ہوں گی۔ انھیں حسین وجمیل اور کنواری بنا دیا جائے گا اور دوسری وہ جو جنت میں اہلِ ایمان کے سرور وراحت کا سامان کرنے کے لیے پیدا کی جائیں گی۔ وہ ایمان اور عملِ صالح کی بدولت جنت کی مستحق نہ ہوں گی بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت میں داخل ہوں گی۔ پہلے درجے کی حوریں اہلِ جنت کی بیویاں ہوں گی اور ان کے ساتھ ان کے قصروں میں رہیں گی اور دوسرے درجے کی حوریں اہلِ جنت کی سیر گاہوں میں لگائے ہوئے خیموں میں ہوں گی۔ فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ (الرحمٰن ۵۵:۷۰)[اس میں نیک سیرت حسین وجمیل حوریں ہوں گی] سے مومنات صالحات کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (الرحمٰن ۵۵:۵۶)[ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنھیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہو گا] میں بھی انھی کی صفات کا بیان ہے۔

اس طرح سے مو[illegible] صالحات کے لیے پردہ اور ستر کے اسلوب میں ان نعمتوں کا ذکر آ گیا، جن کا مومنین صالحین کے لیے تذکرہ کیا گیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں خواہ کوئی عورت کنواری مرگئی ہو یا کسی کی بیوی رہ چکی ہو، جوان مری ہو یا بوڑھی ہو کر دنیا سے رخصت ہوئی ہو آخرت میں جب یہ سب نیک خواتین جنت میں داخل ہوں گی تو جوان اور کنواری بنا دی جائیں گی اور وہاں ان میں سے جس خاتون کو بھی کسی نیک مرد کی رفیقۂ حیات بنایا جائے گا وہ جنت میں اپنے اس شوہر سے پہلے کسی کے تصرف میں نہ آئی ہوگی۔[۱]

حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ (الرحمٰن ۵۵:۷۲)[خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں ہوں گی] کی تشریح میں فرماتے ہیں:

خیموں سے مراد غالباً اس طرح کے خیمے ہیں جیسے امرا اور رؤسا کے لیے سیر گاہوں میں لگائے جاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ ان کے قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے ہوں گے، جن میں حوریں ان کے لیے لطف ولذت کا سامان فراہم کریں گی۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ پہلے خوب سیرت اور خوب صورت بیویوں کا ذکر کیا

۱- تفہیم القرآن، پنجم، ص ۲۶۸، الرحمٰن، حاشیہ ۴۶۔

جا چکا ہے۔ اس کے بعد ان حوروں کا ذکر الگ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ ان بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی۔ اس خیال کو مزید تقویت اس حدیث سے حاصل ہوتی ہے جو حضرت امِ سلیمؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم سے پوچھا: دنیا کی عورتیں بہتر ہیں یا حوریں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: دنیا کی عورتوں کو حوروں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو ابرے کو استر پر ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا: کس بنا پر؟ آپؐ نے فرمایا: اس لیے کہ ان عورتوں نے نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں اور عبادتیں کی ہیں۔ (طبرانی)

اس سے معلوم ہوا کہ کہ اہلِ جنت کی بیویاں تو وہ خواتین ہوں گی جو دنیا میں ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کرتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ اپنے ایمان اور حسنِ عمل کے نتیجے میں داخلِ جنت ہوں گی اور بذاتِ خود جنت کی نعمتوں کی مستحق ہوں گی۔ یہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق یا تو اپنے سابق شوہروں کی بیویاں بنیں گی اگر وہ بھی جنتی ہوں، یا پھر اللہ تعالیٰ کسی دوسرے جنتی سے ان کو بیاہ دے گا جب کہ وہ ایک دوسرے کی رفاقت پسند کریں۔[1]

ان آیات میں اشارتاً اور احادیث میں صراحتاً بیان کر دیا گیا کہ ایمان اور عمل صالح رکھنے والی خواتین پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوگا۔ انھیں جنتی حوروں سے زیادہ حسن عطا کیا جائے گا۔ انھیں جوان اور کنواری بنا دیا جائے گا اور انھیں اپنے دنیوی شوہر کے ساتھ بیاہ دیا جائے گا، جب کہ وہ اس کا اہل ہو۔ یا شوہروں میں سے کسی ایک کے ساتھ بیاہ دیا جائے گا جو اس کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو اور دنیا میں اس کے ساتھ زیادہ اچھے طریقے سے پیش آیا ہو اور اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو تیسری صورت یہ ہوگی کہ اس کے حسبِ منشا اور مقام و مرتبے کے مناسب مومنِ صالح سے بیاہ دیا جائے گا۔

آپ کو قرآن کے اس اسلوب سے جو غلط فہمی واقع ہوئی ہے اس کی بنیادی وجہ مرد اور عورت کی اسلامی حیثیت پر توجہ نہ کرنا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور لازم و ملزوم ہیں۔ شوہر بیوی کے لئے اور بیوی شوہر کے لیے نعمت ہے۔ لیکن قرآنِ پاک نے عورت کو جس بلند مقام پر کھڑا کیا ہے اس تک ایک عام انسان کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ قرآنِ پاک نے مرد اور عورت میں سے مرد کو طالب اور عورت کو مطلوب قرار دیا ہے۔ اس لیے اسلامی معاشرے میں 'خِطبہ' [پیغامِ نکاح] مرد کی طرف سے دیا جاتا ہے اور مرد بارات لے

۱- تفہیم القرآن، پنجم، ص ۲۶۸، الرحمٰن، حاشیہ ۴۶۔

کرعورت کے گھر آتا ہے، اسے بیاہ کر لے جاتا ہے اور اس کے لیے سکونت اور نان نفقہ کا انتظام کرتا ہے۔ اس لیے آخرت میں بھی اس کی عظمتِ شان کو برقرار رکھنے کی خاطر صراحتاً مردوں کے لیے نیک سیرت، شرمیلی نگاہوں والی اور خوب صورت خواتین کو نعمت قرار دیا گیا ہے۔ رہی خواتین کے لیے نیک سیرت اور خوب صورت مردوں کی نعمت، تو اس کی طرف ضمناً اسی صراحت میں اشارہ کر دیا گیا۔ یہ اسلوب عورت کی پاکیزگی، تقدس اور شانِ حیا کے عین مطابق ہے۔ خصوصاً باکرہ عورت سے تو جب ایجاب وقبول کے وقت نکاح کا اذن طلب کیا جاتا ہے تو وہ بسا اوقات زبان سے صراحتاً اذن دینے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خاموشی کو اذن قرار دیا اِذْنُھَا صَمَاتُھَا [بخاری، کتاب الحِیَل، باب ۱۱]۔ ایسی صورت میں کیسے ایسا انداز اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے جنتی خواتین مردوں کی طلب گار نظر آئیں۔ یہ انداز مناسب نہ تھا۔ اس لیے سورۂ رحمٰن یا کسی دوسری سورت کے اسلوب کا اسلام کے مجموعی تہذیبی نظام اور اقدار کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس اسلوب میں مرد اور عورت کے مقام، مزاج اور اوصاف کو ہر مقام پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ البتہ احادیث میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد یہ اشکال باقی نہیں رہتا کہ سورۂ رحمٰن کے آخر میں ذکر کردہ نعمتیں مردوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس لیے ساری نعمتیں جو اس سورت میں ذکر کی گئی ہیں وہ بھی مردوں کے لیے مخصوص شمار نہ ہوں گی بلکہ اول سے لے کر آخر تک تمام نعمتیں مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے مشترک ہیں، حتیٰ کہ مردوں کے لیے نیک سیرت اور خوب صورت عورتیں اور عورتوں کے لیے نیک سیرت اور خوب صورت مرد ہوں گے۔ اس لیے خواتین کو کسی قسم کے احساسِ محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ انھیں قرآنی ارشاد فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی (آل عمران ۳:۱۹۵) کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(ترجمان القرآن، نومبر، دسمبر ۱۹۹۱ء)

عورتوں کا قبرستان میں جانا

سوال: کیا عورت کا قبرستان میں جانا بالکل منع ہے؟ میں قبرستان صرف اس لیے جانا چاہتی ہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا دیا تھا جو چار ماہ کا ہو کر قضائے الٰہی سے وفات پا گیا۔ بس صرف اس کی قبر پر جانا چاہتی ہوں، لیکن میرے خاوند مجھے جانے نہیں دیتے۔

جواب: نوجوان عورتوں کے لیے ایسی صورت میں قبرستان میں جانا جب کہ مقصد رونا، پیٹنا اور بے صبری کا مظاہرہ کرنا نہ ہو، ممنوع تو نہیں ہے لیکن بہتر بھی نہیں ہے۔ البتہ عمر رسیدہ خواتین عبرت حاصل کرنے اور آخرت کو یاد کرنے کی خاطر جانا چاہیں تو بلا کراہت جائز ہے۔ آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے شوہر کی رائے پر عمل کرتے ہوئے صبر کا مظاہرہ کریں۔ بیٹے کی قبر پر پہنچ کر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سے صبر نہ ہو سکے اور شرعی حدود سے تجاوز ہو جائے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۸۶ء)

بالوں کی چٹیا اور غسل

سوال: چٹیا یا جوڑا بندھا ہوا تھا، فجر کو غسل واجب کے لیے بالوں کی جڑوں کو گیلا کیا، کچھ دیر بعد کنگھی کر کے بال سکھانے کے لیے جوڑا کھول دیا۔ کیا یہ درست ہے؟ عادت کے مطابق جوڑا بندھا تھا، سوتے میں کھل گیا، تو کیا صبح اسے باندھ کر غسل واجب کے لیے جڑیں گیلی کی جاسکتی ہیں، یا اگر بال کھلے رہے ہوں تو جڑوں کے علاوہ ہر بال کو پوری لمبائی تک گیلا کرنا ضروری ہے؟ بسا اوقات سردی کی وجہ سے سر درد یا کچھ اور تکلیف ہو جاتی ہے، یا گیلے کیے ہوئے بال اگلی رات تک جا کر سوکھتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اوپر سے سر اور بالوں کی جڑیں گیلی کر لی جائیں اور پشت پر لمبے بال نہ گیلے کیے جائیں؟

واضح رہے کہ جوڑے سے میری مراد وہ فیشنی جوڑا نہیں جسے اونچا کر کے باندھا جاتا ہے بلکہ میری مراد یہ ہے کہ سہولت کے لیے بالوں کو کوئی پن وغیرہ استعمال کیے بغیر اکٹھا کر لیا جائے۔

جواب: عورت کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ اس کے بال گندھے ہوئے ہوں تو بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچا دے اس کا غسل ہو جائے گا، لیکن بال کھلے ہوں تو پھر بالوں کے درمیان بھی پانی پہنچانا ہوگا۔

وَلَيْسَ عَلَى الْمَرْأَةِ اَنْ تَنْقُضَ ضَفَائِرَهَا فِي الْغُسْلِ اِذَا بَلَغَ الْمَاءُ اُصُوْلَ الشَّعْرِ وَ لَيْسَ عَلَيْهَا بَلُّ ذَوَائِبِهَا۔ هُوَ الصَّحِيْحُ كَذَا فِي الْهِدَايَةِ، وَلَوْ كَانَ شَعْرُ الْمَرْأَةِ مَنْقُوْضاً يَجِبُ اِيْصَالُ الْمَاءِ اِلٰى اَثْنَائِهٖ[۱] عورت پر لازم نہیں ہے کہ وہ غسل میں اپنی مینڈیاں کھول دے جب کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچتا ہو، اس پر زلفوں کا تر کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ یہی بات صحیح ہے۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ اور اگر بال کھلے ہوں تو پانی ان کے درمیان پہنچانا بھی ضروری ہے۔

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۸۴ء)

۱- فتاوٰی عالمگیری، ج۱، ص۱۳۔

مصنوعی بالوں کی پیوند کاری

سوال: آج کل بالوں کی پیوند کاری ہو رہی ہے، یعنی جلد میں آپریشن کے ذریعے مصنوعی بال لگائے جاتے ہیں۔ایک جھلی پر (مصنوعی) بال چپکا کر سر پر جہاں بال نہ ہوں وہاں جھلی چپکا دی جاتی ہے۔مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں بال ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔کیا اس صورت میں غسل اور وضو ہو جاتے ہیں یا نہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کا جسم و جان امانت کے طور پر عطا کی ہے۔اس امانت کا حق اس طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق استعمال کیا جائے۔لہٰذا ترک واختیار میں شریعت سے انحراف اس امانت کا ناجائز تصرف ہوگا۔

بالوں کی پیوند کاری تغیر لخلق اللہ کے زمرے میں آتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے مصنوعی اور غیر فطری کاموں سے منع کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ (الروم۳۰: ۳۰) اس فطرت پر قائم ہو جاؤ جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی یہی بالکل درست دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث جو حدیث کی معتبر ترین کتب میں مذکور ہیں، ان میں آپؐ نے صریح الفاظ میں اس مصنوعی فعل سے منع فرمایا ہے۔حدیث میں آتا ہے: لُعِنَ الْوَاصِلَةُ وَالْمُسْتَوْصِلَةُ وَالْوَاشِمَةُ وَالْمُسْتَوْشِمَةُ[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بال جوڑنے والیوں اور جڑوانے والیوں اور گودنے والیوں اور گودوانے والیوں پر لعنت فرمائی۔

البتہ انسانی بالوں کے علاوہ کسی دوسری چیز سے بنے ہوئے مصنوعی بال جوڑنے کی گنجائش

---

۱ - مسلم، عن ابن عمر، کتاب اللباس۔ترمذی، ابواب الادب۔ابو داؤد، کتاب الترجل۔

موجود ہے۔آپ نے جس صورت کے بارے میں سوال کیا ہے اگر اس میں جھلی اور بال کسی درخت وغیرہ سے بنائے گئے ہیں تو ان کا استعمال جائز شمار ہوگا۔ایسی صورت میں غسل میں جہاں تک پانی پہنچایا جاسکتا ہو پہنچایا جائے۔فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ عورت کے لیے اس میں حرج کی بات نہیں ہے کہ وہ اپنے بالوں کی مینڈیوں میں پشم کی کوئی چیز جوڑے۔[1]

اصطلاح میں غسل کے معنی بدن کو دھونا ہے اور اس کا اطلاق بدن کے ظاہر اور باطن پر ہوتا ہے۔سوائے اس صورت کے جس میں پانی کا پہنچانا ناممکن یا مشکل ہو جیسا کہ بحر الرائق میں ہے: غسل سوائے کسی تکلیف کے حتی الوسع تمام جسم پر پانی بہانا ہے۔

اس لیے جو مصنوعی غیر انسانی بال سرجری کے بعد سر میں پیوست ہو چکے ہیں اور جسم کا حصہ بن چکے ہیں، اگر غسل کی صورت میں پانی سر تک نہیں پہنچتا بلکہ مصنوعی جھلی تک پہنچتا ہے تو غسل یا وضو ہو جائے گا۔البتہ جن بالوں کو سر سے جدا کیا جاسکتا ہے ان کو غسل کے وقت جسم سے جدا کیا جائے اور سر تک پانی پہنچایا جائے، اس کے بغیر غسل یا وضو نہ ہوگا۔واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۱ء)

۱- الفتاویٰ الھندیہ، کتاب الکراھیة، الباب التاسع عشر، ج ۴، ص ۱۱۳۔

خواتین کے چند مسائل

سوال: ۱- آج کل بازار میں فلالین کی ایسی قمیص مل رہی ہے، جن کے ساتھ پاجامہ ہوتا ہے، یہ تنگ نہیں ہوتے۔ کیا ان کا استعمال درست ہے؟

باہر آنے جانے کے لیے برقع لیا جائے، جب کہ تعلیمی ادارے اور صرف لڑکیوں کی موجودگی میں گلے میں دوپٹہ لیں، کیا یہ درست ہے؟

۲- گرمیوں میں گرمی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ کیا کوئی لڑکی صرف لڑکیوں کی موجودگی میں ایسی چھجے والی ٹوپی پہن سکتی ہے جس کا پرنٹ رنگ بالکل لڑکیوں والا ہو؟ ویسے تو مردوں کی سی چیزیں حرام ہیں مگر ایسی ٹوپی جو کوئی مرد نہ پہن سکے، اس میں بھی حرج ہے؟

۳- کیا ابروؤں کے درمیان کے چند بال ختم کیے جاسکتے ہیں؟

جواب: ۱- خواتین کو ایسا لباس استعمال کرنا چاہیے جس سے مردوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔ لباس کو دیکھ کر اندازہ ہو کہ یہ خاتون ہے۔ لباس مکمل طور پر ساتر ہو۔ قمیص کے ساتھ پاجامہ ہو تو اس سے جسم کے پیچ و خم بھی نظر آتے ہیں۔ اس لیے یہ لباس، لباسِ ساتر نہیں ہے۔

جہاں پر مرد موجود نہ ہوں صرف خواتین ہوں وہاں اس بات کی گنجایش موجود ہے کہ گلے میں دوپٹہ لیں لیکن بہتر یہی ہے کہ سر پر دوپٹہ ہو۔ البتہ جہاں غیر محرم مردوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہو وہاں مکمل پردہ ہونا چاہیے۔

۲- خواتین ٹوپیاں استعمال نہ کریں کیونکہ ان میں مردوں کے لباس کے ساتھ مشابہت موجود ہے اور خواتین کو مردانہ یا اس سے مشابہ لباس پہننے کی اجازت نہیں۔

۳- ابرو کے درمیان والے بال کیمیکل سے صاف کر دینا یا استرے سے منڈوانا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۱ء)

☆......☆......☆

باب دہم

متفرق مسائل

نماز میں لفظِ اللہ کو مرکزِ توجہ بنانا

سوال: لفظِ اللہ جو کہ باری تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں اور اسلامی اور قرآنی اصطلاح میں اس کے معنی کیا ہیں؟ اسے مفصل طور پر تحریر فرمائیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لفظ اللہ کا ہر وقت اور ہر حال میں زبان سے نہیں بلکہ دل سے ذکر کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے جہاں اور بہت سے فیوض و برکات حاصل ہوں گے وہاں اس لفظ، جو کہ پانچ حروف کا مجموعہ ہے اور قرآن مجید میں سیکڑوں مقام پر آیا ہے، کا ایک بار ذکر کرنے سے پچاس نیکیاں ذاکر کے نامۂ اعمال میں درج ہو جاتی ہیں۔ آپ یہ فرمائیں کہ کیا واقعی زبان کی بجائے دل سے 'اللہ' پڑھنے سے اتنی ہی نیکیاں مل سکتی ہیں۔

وہ بزرگ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب تم نماز پڑھنا شروع کرو تو یہ تصور کرو کہ لفظ 'اللہ' سنہری حروف میں تمھارے دل پر لکھا ہوا ہے، تم نماز کی ادائیگی کے دوران اپنی آنکھیں بند کر کے 'اللہ' کے لفظ کی جانب متوجہ رہو اور زبان سے نماز کے مسنونہ الفاظ پڑھتے رہو اس طرح کرنے سے کیا شرعی طور پر نماز میں کوئی نقص تو واقع نہیں ہوتا؟

جواب: لفظ اللہ کا ذکر زبان اور دل سے موجبِ اجر و ثواب اور خیر و برکت ہے۔ آپ زبان سے پورے کلمے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر کریں کیونکہ اسے حدیث میں افضل الذکر کہا گیا ہے۔ اللہ اللہ کے ذکر کا بھی حدیث میں تذکرہ آیا ہے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک زمین میں اللہ اللہ کرنے والا کوئی ایک فرد موجود ہو۔ اس میں ذکرِ لسانی اور ذکرِ قلبی دونوں شامل ہیں اور دونوں ذکر جمع ہوں تو یہ افضل صورت ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ ذکرِ قلبی کا ہے۔ اس حد تک تو یہ بات صحیح ہے کہ آپ اللہ کا ذکر دل میں کریں۔ لیکن یہ بات کہ نماز میں آپ تلاوت کرتے رہیں، اذکار زبان سے پڑھتے رہیں اور تصور لفظ اللہ کا کریں، یہ مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی بے سند ہے کہ آپ یہ تصور کریں کہ لفظ اللہ آپ کے دل پر سنہری حروف میں

لکھا ہوا ہے۔ یہ نہ ذکر ہے نہ احادیث میں وارد ہے۔ اصل ذکر تو یہ ہے کہ دل میں اللہ کی عظمت وجلال کو تازہ کریں اور اپنی کوتاہیوں کو یاد کر کے شرمندگی کا احساس بیدار کریں اور ایسا ذکر کریں جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت پر آمادہ کر دے یہاں تک کہ فرماں برداری آسان اور نافرمانی مشکل ہو جائے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ تین چیزیں جس میں پائی جائیں وہ ایمانی لذت کو پائے گا: ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اسے دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو۔ دوسری یہ کہ کسی سے محبت نہ ہو مگر اللہ کے لیے۔ تیسری یہ کہ اس کے لیے کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہو جیسے آگ میں پھینک دیا جانا۔ (بخاری ومسلم)

پس اگر ذکر کے نتیجے میں یہ صفات پیدا ہوں تو وہ ذکر، ذکر شمار ہوگا ورنہ نہیں۔ اسی کو ذکرِ قلبی کہا جاتا ہے۔ اور اس کے ایک حرف پر دس نیکیاں مل سکتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لفظِ اللہ پر پچاس نیکیاں کم سے کم درجہ ہے جس کا امیدوار ہونا چاہیے۔ نیز تحقیقی بات یہی ہے کہ لفظِ اللہ ذاتِ باری تعالیٰ کا اسم ذاتی ہے۔ اس لیے اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی بھی یہی ہیں۔ اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی کی بحث اس وقت ہوتی ہے جب یہ علمِ ذات نہ ہو بلکہ اسمِ مشتق ہو۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۲ء)

جانور کی حلّت وحرمت اور ذبح

سوال: گائے، مرغی اور بکری وغیرہ کو ذبح نہ کیا گیا ہو تو وہ بالکل اسی طرح حرام ہے جس طرح سور کا گوشت۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سور کی طرح حرام نہیں ہے۔ براہِ کرم راہ نمائی فرمائیں۔

جواب: گائے، مرغی، بکری وغیرہ کو بسم اللہ پڑھے بغیر ذبح کیا گیا ہو یا ذبح ہی نہ کیا گیا ہو تو وہ مردار ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔ یہ بات قرآن پاک اور احادیث کی نصوصِ صریحہ سے ثابت ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو دوسرے قطعی محرمات کی طرح اس حرام سے بھی بچنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ جیسے مخلص لوگوں کی مدد فرمائے اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی

آسانیوں سے نوازے۔(آمین)

(ترجمان القرآن،فروری ۱۹۸۸ء)

درود میں آل کا لفظ

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے میں آل کو شامل نہ کرنے پر کچھ لوگ معترض ہوتے ہیں۔صحیح صورت کیا ہے؟

جواب: قرآن پاک میں اہلِ ایمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس حکم میں آل کو آپؐ کے ساتھ شامل نہیں کیا گیا۔مثلاً اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (الاحزاب۳۳:۵۶)قرآنِ پاک کی اس آیت میں آل کا ذکر نہیں ہے۔اسی طرح اکثر احادیث میں بھی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم ہے۔آپؐ نے فرمایا:رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ(ترمذی)یعنی ذلیل ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

اسی طرح آپؐ کا ارشاد ہے: اَلْبَخِیْلُ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ (ترمذی) جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے وہی درحقیقت بخیل ہے۔

بعض احادیث میں آپؐ کے بالتبع آل کو بھی صلوٰۃ وسلام میں شریک کرنے کی ترغیب آئی ہے۔قرآنِ پاک اور احادیث کے مجموعے پر نظر رکھتے ہوئے علما نے جو فیصلے دیے ہیں ان کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک آنے پر آپؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا ضروری ہے اور آل کو آپ کے بالتبع اس میں شریک کرنا جائز اور مستحب ہے،ضروری نہیں ہے۔اس لیے صلّی اللّٰہ علیہ وسلم اور صلّی اللّٰہ علیہ و علیٰ آلہ وسلم دونوں طرح پڑھنا اور لکھنا جائز ہے۔

(ترجمان القرآن مارچ ۱۹۹۵ء)

استخارے کی شرعی حیثیت

سوال: زندگی میں کئی ایسے مراحل آتے ہیں جو انسان کی قوتِ فیصلہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسانی ذہن میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر اسلامی کتابوں میں استخارے کی ترغیب دی گئی ہے۔ استخارے کے بارے میں چند سوالات ہیں۔ براہِ مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

۱- کیا استخارہ ہر شخص کرسکتا ہے؟ اپنے لیے کسی اور سے استخارہ کروانا درست ہے یا نہیں؟

۲- بعض اوقات انسان کی خواہش کے مطابق ہی خواب نظر آتے ہیں جن پر دل کو اطمینان نہیں ہوتا کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے ہے یا میری ہی لاشعوری خواہش ہے، تو اس وقت کیا کیا جائے؟ کیا درست استخارے کی پہچان اطمینانِ قلب ہے؟

۳- شیطان ہر وقت انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور کئی خواب شیطان کی طرف سے بھی ہوتے ہیں، کیا شیطان استخارہ کر کے سونے والے کو بھی گمراہ کرسکتا ہے؟ اس سے کیسے بچا جائے؟

جواب: استخارے کے معنی ہیں دعاے خیر اور یہی اس کی حقیت ہے۔ اہلِ ایمان چھوٹے بڑے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں عقل و تجربے اور مشورے سے کام لینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعاے خیر کو بھی وسیلہ بناتے ہیں۔ وہ صرف ظاہری اسباب اور اپنی چاہتوں اور احباب اور عزیز و اقارب اور بزرگوں کے مشوروں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ استخارے کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے سوال بھی کرتے ہیں کہ جس کام کو ہم کرنا چاہتے ہیں اگر وہ دنیا اور آخرت کے لحاظ سے مفید اور بہتر ہے تو اس کو کرنے کی توفیق عطا فرما اور اگر وہ دنیا اور آخرت کے لحاظ سے برا ہے تو اس سے دوری پیدا فرما دے۔

امام بخاریؒ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تمام کاموں میں استخارے کی تعلیم دیتے

تھے جس طرح کہ ہمیں قرآن پاک کی ایک سورت کی تعلیم دیتے تھے۔آپؐ فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی کسی کام کا ارادہ کرے تو وہ دو رکعت نفل پڑھے۔اس کے بعد یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡتَخِیۡرُكَ بِعِلۡمِكَ وَاَسۡتَقۡدِرُكَ بِقُدۡرَتِكَ وَاَسۡئَلُكَ مِنۡ فَضۡلِكَ الۡعَظِیۡمِ، فَاِنَّكَ تَقۡدِرُ وَلَا اَقۡدِرُ وَتَعۡلَمُ وَلَا اَعۡلَمُ وَاَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنۡ كُنۡتَ تَعۡلَمُ اَنَّ هٰذَا الۡاَمۡرَ خَیۡرٌ لِّیۡ فِیۡ دِیۡنِیۡ وَ مَعَاشِیۡ وَعَاقِبَةِ اَمۡرِیۡ۔ اَوۡ قَالَ: عَاجِلِ اَمۡرِیۡ وَآجِلِهٖ۔ فَاقۡدُرۡهُ لِیۡ وَیَسِّرۡهُ لِیۡ ثُمَّ بَارِكۡ لِیۡ فِیۡهِ وَاِنۡ كُنۡتَ تَعۡلَمُ اَنَّ هٰذَا الۡاَمۡرَ شَرٌّ لِّیۡ فِیۡ دِیۡنِیۡ وَمَعَاشِیۡ وَعَاقِبَةِ اَمۡرِیۡ۔ اَوۡ قَالَ: فِیۡ عَاجِلِهٖ وَآجِلِهٖ فَاصۡرِفۡهُ عَنِّیۡ وَاصۡرِفۡنِیۡ عَنۡهُ وَاقۡدُرۡلِیَ الۡخَیۡرَ حَیۡثُ كَانَ ثُمَّ اَرۡضِنِیۡ بِهٖ۔[1] اے اللہ! میں تجھ سے خیر مانگتا ہوں کہ تو ہی جانتا ہے اور میں تجھ سے قدرت طلب کرتا ہوں کہ تیرے پاس ہی قدرت ہے اور میں تیرے عظیم فضل کا سوال کرتا ہوں اس لیے کہ تو ہی قدرت رکھتا ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا۔اور تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو غیبوں کو جاننے والا ہے۔اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام۔(یہاں کام کا نام لے مثلاً کاروبار، شادی بیاہ وغیرہ)۔میرے لیے، میرے دین، میری زندگی اور میرے کام کے انجام کے لحاظ سے بہتر ہے.......... یا یوں فرمایا: میری دنیا اور میری آخرت کے لحاظ سے بہتر ہے.......... تو اسے میرے لیے مقدر اور آسان فرمادے۔پھر میرے لیے اس میں برکت عطا فرما۔اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین میری زندگی اور میرے کام کے انجام کے لحاظ سے بُرا ہے...... یا یوں فرمایا: میری دنیا اور میری آخرت کے لحاظ سے بُرا ہے.......... تو اسے مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لیے خیر کو مقدر فرمادے جہاں بھی ہو، پھر مجھے اس پر راضی کردے۔

دعا کے دوران هٰذَا الۡاَمۡرَ کے الفاظ کہتے وقت اپنے کام کا نام لے۔

مسند احمد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کے لیے یہ بات باعثِ سعادت ہے کہ وہ اللہ سے استخارہ (یعنی دعائے خیر) کرے اور ابن آدم کی سعادت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر جو اللہ نے اس کے لیے فرمایا ہے راضی ہو اور آدمی کی بدبختی ہے کہ اللہ سے استخارے کو ترک کرے اور ابن آدم کی بدبختی ہے کہ وہ اس فیصلے پر ناراض ہو جو اللہ نے اس کے لیے کیا ہے۔(فقه السنه، ج۱، ص۵۴۲)

۱۔ بخاری کتاب التهجد، باب ما جاء فی التطوع مثنی مثنی، ج اول، ص: ۱۵۵-۱۵۶۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: جس نے اللہ سے استخارہ کیا اور انسانوں سے مشورہ کیا، وہ کبھی ناکام نہ ہوگا۔ (فقه السنه، ج۱، ص۵۴۲)

علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں: حضرت جابرؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کاموں میں استخارہ کرنا چاہیے۔ کسی معاملے کو غیر اہم سمجھ کر اس کے لیے استخارے کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک کام کو انسان غیر اہم سمجھ کر کرلے یا چھوڑ دے اور اس کے نتیجے میں اسے عظیم نقصان پہنچ جائے۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے رب سے مانگو حتیٰ کہ جوتے کا تسمہ بھی۔ (فقه السنه، ج۱، ص۵۴۴)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ہر ایسا کام جس کے نتیجے کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ اچھا نکلے گا یا برا اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا کرنا بہتر ہے یا چھوڑنا، تو ایسے کام کے لیے استخارہ کرے، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ (احیاء العلوم، ج۱، ص۹۲۰۷)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: استخارے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی خواہش سے ذہن کو خالی کرلے اور استخارے کے نتیجے میں دل میں جو انشراح پیدا ہو، اس کے مطابق عمل کرے۔

خلاصۂ بحث

۱- استخارہ اللہ تعالیٰ سے مخصوص انداز میں دعا کرنا ہے۔ یہ دعا اس وقت کی جاتی ہے جب زندگی کے مختلف معاملات یا کاموں میں سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ استخارے کا تعلق فرائض، واجبات اور سنن سے یا حرام اور مکروہات سے نہیں ہوتا کیونکہ ان چیزوں کے کرنے یا نہ کرنے کی رہنمائی تو شریعت نے دے دی ہے۔ لہٰذا فرض نماز کی ادائیگی یا نفلی نمازوں اور روزوں یا ناجائز کاموں، چوری، ڈکیتی، بدکاری، رشوت، سود اور جوے کے بارے میں استخارہ نہیں ہوگا۔ استخارہ ان کاموں کے بارے میں ہوتا ہے جن کا کرنا یا نہ کرنا جائز ہو اور انسان کی مرضی پر ہو، مثلاً جائز کاروبار، اندرون اور بیرونِ ملک سفر اور ملازمت یا کسی خاص عورت سے شادی کرنا یا کسی خاص آدمی سے لین

دین کا کوئی معاملہ کرنا وغیرہ۔

۲۔ استخارے کے لیے دن رات میں کسی بھی وقت دو نفل پڑھ کر دعاے استخارہ کی جاسکتی ہے۔

۳۔ استخارے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی مدد مختلف شکلوں میں ہوسکتی ہے، مثلاً اس شکل میں کہ کوئی خواب دیکھا جائے جس کی تعبیر کام کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں ہو یا خواب دیکھے بغیر دل کا میلان کام کرنے یا چھوڑنے کی طرف ہو جائے۔

۴۔ کسی کام کے سلسلے میں غور وفکر، صلاح ومشورہ اور اپنے اور دوسروں کے تجربوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ان تمام صورتوں کو پیش نظر رکھنے کے باوجود کام کے نتیجے کے بارے میں یکسوئی نہ ہو تو پھر استخارہ بھی کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں عالمِ اسباب کے ساتھ مسبب الاسباب کی طرف بھی رجوع کرنا چاہیے۔ جب انسان اللہ کی طرف رجوع کرے گا اور اس سے مانگے گا تو وہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرے گا کہ اس سے مانگنا بندگی اور عاجزی ہے جو اسے بہت پسند ہے اور دوسری طرف اپنے کام کو بابرکت بنائے گا۔ استخارے کے بعد اگر کام کو کرے گا تو اس میں بہتری اور برکت اور فائدہ ہوگا اور چھوڑ دے گا تو اس صورت میں بھی فائدہ حاصل ہوگا۔ جو لوگ استخارہ کر کے اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ کوئی خواب نظر آئے تو وہ استخارے کی حقیقت کو نہیں پا سکے۔ اسی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارے میں کوئی خواب دیکھنا ضروری ہے لہٰذا خود استخارہ کرنے کے بجاے کسی خدارسیدہ انسان سے استخارہ کرواتے ہیں تو وہ بھی غلطی پر ہیں۔ استخارہ خود کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ عبادت ہے اور اس لیے بھی کہ اس میں اللہ تعالیٰ سے دعاے خیر کی جاتی ہے۔ البتہ دوسروں سے بھی آپ دعا کروا سکتے ہیں۔ جس طرح آپ دوسروں سے مشورہ لے سکتے ہیں۔ انھیں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ اگر یہ کام میرے لیے بہتر ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کے کرنے کی توفیق دے اور بہتر نہیں ہے تو اس سے مجھے باز رکھے۔ لیکن دعا کا بار بار کرنا جب تک کہ آدمی یکسو نہ ہو جائے، ایک اصولی اور معقول بات ہے۔ اس لیے انشراحِ

صدر تک بار بار استخارہ کرنا چاہیے۔

استخارے کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ مذکورۂ بالا مستحب اور مسنون طریقے پر کیا جائے۔ استخارے کے بعد انشراحِ صدر کے ساتھ جو کام ہوگا وہ بابرکت ہوگا استخارے کے بعد ذہن جس کام کی طرف یکسو ہو، اسے کیا جائے اور اس کے بعد بھی دعا کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

۵- صلوٰۃ الاستخارہ اور دعاے استخارہ بار بار کی جائے یا صرف ایک بار کی جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ استخارہ بار بار کرنا اور انشراحِ صدر تک کرنا مستحب ہے، ابن السنی نے اس سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث بھی ذکر کی ہے کہ اِذَا ھَمَمْتَ بِاَمْرٍ فَاسْتَخِرْ فِیْهِ سَبْعَ مَرَّاتٍ ثُمَّ انْظُرْ اِلَی الَّذِیْ یَسْبَقُ اِلٰی قَلْبِكَ فَاِنَّ الْخَیْرَ فِیْهِ۔[1] آپ جب کسی کام کا ارادہ کریں تو سات مرتبہ استخارہ کریں۔ پھر اس کام کو کریں جس کی طرف دل مائل ہو، اس لیے کہ خیر اسی میں ہے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۸ء)

بدری صحابہؓ کا مقام و مرتبہ

سوال: غزوۂ تبوک سے جو تین صحابہ پیچھے رہ گئے تھے ان میں دو بدری صحابہ بھی تھے۔ جن کے متعلق قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کی سند بھی دے دی تھی۔ تینوں سچے اور پختہ مسلمان تھے۔ نیت میں بھی کوئی کھوٹ معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی چیز نظر آتی ہے تو وہ ذرا سی سُستی۔ پھر باوجود اتنے کمالات کے انھیں اتنی سخت سزا کیوں دی گئی اور پورے پچاس دن کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی۔ حالانکہ بدر میں شامل ہونے والوں کو سب کچھ معاف کر دیا گیا تھا۔

۱- تحفة الاحوذی، شرح ترمذی، ج۲، ص۵۹۳۔

جواب: اہل بدر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَعَلَّ اللّٰہَ اِطَّلَعَ عَلٰی اَھْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ۔[1] (شاید اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کا حال معلوم کر لیا ہے اور فرما دیا ہے کہ تم جو چاہو کرو میں نے تمھیں بخش دیا ہے) کا یہ مطلب نہیں کہ اہلِ بدر احکامِ شرعیہ کے مکلّف نہیں رہے یا ان سے کسی کوتاہی پر دنیا میں مواخذہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان سے کوئی کوتاہی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کا سامان کر دے گا اور انھیں ایسے کام کی توفیق عنایت فرما دے گا کہ اس کی بنا پر ان کی اخروی سزا معاف ہو جائے گی۔ جن بزرگ صحابہؓ کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے اگر آپ ان کے واقعے میں غور وفکر کرتے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ انتہائی کٹھن موقع پر انھیں سچ بولنے اور منافقین کی طرح جھوٹے اعذار پیش کرنے سے اجتناب کی توفیق غزوۂ بدر میں شرکت کی بدولت ہی نصیب ہوئی اور انھوں نے وہ استقامت دکھلائی کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے پڑھی جانے والی کتاب میں ان کا ذکرِ خیر نازل فرما دیا۔ آپ کا یہ کہنا کہ ان کی کوتاہی معمولی تھی اس وقت درست ہوتا جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کوتاہی کو معمولی قرار دیا ہوتا۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کوتاہی کو غیر معمولی قرار دے کر ان کا بائیکاٹ کیا تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک چھوٹی سی کوتاہی تھی۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۸۶ء)

۱۔ اہل بدر جس تربیت اور جن امتحانات اور جس آخری شدید مرحلۂ آزمایش سے خلوصِ نیت اور کردار درخشاں کے ساتھ گذرے وہ اس بات کی شہادت ہیں کہ ان کے دلوں میں جان بوجھ کر گناہ کرنے کی قوت کام نہیں کر سکے گی۔ لیکن اللہ نے گناہ معاف کیے، ظاہری قانون اور نظم کے خلاف جس کسی سے بھی کوئی غلط کاری ثابت ہو جائے خواہ وہ گواہی سے ہو یا اعترافِ قصور سے ہو، اس پر قانونی اور سماجی کارروائی تو بہر حال ہوگی۔ (نعیم صدیقی)

تعلیمِ قرآن اور جنسی مسائل

سوال: میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ دو سال پہلے خیال آیا کہ کیوں نہ اردو پر عبور رکھنے والے بچوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھنے کی طرف راغب کیا جائے۔ یہ سلسلہ شروع بھی ہو گیا۔ تذکیر اور عمومی اندازِ فکر کی تشکیل کے حوالے سے یہ بچوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل چیز ہے۔ اب خیال آیا ہے کہ قرآن میں دلائل و براہان کے سلسلے میں خاصے مقامات پر ایسے معاملات کا تذکرہ ہوتا ہے جو سنِ بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۹ سے ۱۶ سال کی عمر تجسّس اور زندگی کے حیوانی حقائق کے سلسلے میں پراگندہ خیالی کی ہوتی ہے۔ کیا ان آیات کے ذہنوں پر منفی اثرات نہیں پڑیں گے؟ پھر سوچتا ہوں کہ قرآن تو ہر جگہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اسے حضورؐ کے عہد سے متصل حضرت عمرؓ کے زمانے میں تراویح میں مکمل سنا جاتا رہا۔ صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی تراویح میں شمولیت پر پابندی تو نہیں ہوگی۔ اب فرمایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: قرآن پاک میں جن معاملات کا سنِ بلوغت سے تعلق ہے، ان کو وہ بچہ جو ترجمہ سمجھنے کی عمر کو پہنچ چکا ہو، اس قدر سمجھ سکتا ہے جس قدر اُسے سمجھانا مقصود ہوتا ہے۔ قرآن پاک ایسی زبان استعمال نہیں کرتا جس کو سمجھنے کے لیے بلوغت ضروری ہو۔ جنس سے متعلق آیات میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کو پڑھنے سے بچوں پر منفی اثرات پڑتے ہوں۔ فلسفہ اور چیز ہے اور تجربہ دوسری چیز۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ قرآنِ پاک کے پڑھنے سے منفی اثرات کبھی نہیں پڑے۔ اس لیے قرآن پاک ہر عمر کے بچے کے لیے مناسب ہے۔ اس لیے آپ بچوں کو ترجمہ پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھیں۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۹ء)

دعاے ختم القرآن

سوال: ہندو پاک میں چھپنے والے قرآنِ حکیم کے نسخوں میں سورۃ الناس کے بعد بالعموم یہ دعا درج کی جاتی ہے: اللھم اٰنس وحشتی فی قبری......الخ عرب ممالک کے مطبوعہ مصاحف میں یہ دعا درج نہیں کی جاتی اور احادیث، روایات اور آثار میں بھی کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس دعا کا التزام ہندو پاک میں عرصۂ دراز سے کیوں کیا جا رہا ہے؟ پاکستان میں طبع شدہ مصاحف جو حرمِ کعبہ میں رکھے جاتے ہیں ان میں یہ دعا درج نہیں کی جاتی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اپنے ملک میں چھپنے والے قرانی نسخوں کے آخر سے بھی اس دعا کو مٹا دیا جائے؟

جواب: دعا کے لیے ضروری نہیں کہ الفاظِ ماثورہ پر مشتمل ہو۔ قرآنِ پاک کے آخر میں دعاء ختم القرآن کے نام سے جو دعا لکھی گئی ہے وہ پوری کی پوری تو کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے لیکن اس کے اجزا مختلف احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں۔ اس لیے اس کا قرآنِ پاک کے اختتام پر قرآن پاک سے علیحدہ کر کے چھاپ دینا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس میں کوئی لفظ غیر مشروع نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں کسی حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے نہ ہی کسی کے نزدیک اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے۔ قرآنِ پاک کے ناشرین میں سے کوئی بھی ناشر یہ نہیں لکھتا کہ یہ دعا حدیث میں آئی ہے اور اس کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس لیے کنز العمال کی جس روایت کو لے کر اس پر جرح کی گئی ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہونے کے باوجود مسئلے سے غیر متعلق ہے۔ اس بنا پر اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس دعا کو قرآنِ پاک کے اختتام پر ذکر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عرب میں طبع کیے جانے والے مصاحف کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ عمل کوئی حجتِ شرعیہ نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۳ء)

حاجات کے لیے اجتماعی ورد

سوال: بعض لوگ اولادِ نرینہ کے حصول کے لیے اور بعض پریشانیوں، مصائب اور بیماریوں سے بچنے کے لیے ایک عرصے سے پاکستانی گھروں میں جمع ہو کر اجتماعی طور پر آیتِ کریمہ کا ورد کرتے رہے ہیں۔ اس محفل میں کئی حضرات اسے بدعت سمجھ کر شامل نہیں ہوتے تھے۔ اب پاکستان میں قومی خلفشار اور کراچی میں ہونے والے فسادات سے بچنے کے لیے اور قومی یکجہتی کے حصول کے لیے ذرا وسیع پیمانے پر آیتِ کریمہ کا ورد اجتماعی طور پر شروع کیا جا رہا ہے۔ اب سنت و بدعت کا سوال اسی نسبت سے بڑھ کر زیادہ وسیع اور اہم ہو گیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات نکال کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں:

۱۔ کسی پریشانی یا مصیبت کو دور کرنے کے لیے یا کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے اجتماعی طور پر لوگوں کو دعوت دینا، اعلان و اہتمام کرنا کہ فلاں دن آیتِ کریمہ کا ورد ہوگا، بدعت کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں؟ (انفرادی ورد یا توبہ و استغفار زیرِ بحث نہیں)

۲۔ کیا حضورؐ کی بعض اجتماعی دعاؤں سے یا حضرت یونس علیہ السلام کی [دعا پر مشتمل] آیتِ کریمہ کے ورد سے (گو کہ انھوں نے انفرادی ورد ہی کیا تھا) اس فعل کے سنت ہونے کی دلیل کافی نہیں۔ کیا یہ فعل یا اسی قسم کا کوئی دوسرا فعل جو شریعت میں ممنوع نہ ہو بدعت قرار دیا جا سکتا ہے؟ (دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ جس چیز کو حضورؐ نے منع فرمایا ہو اسی کا ارتکاب بدعت ہے ورنہ سب نئی چیزوں کا استعمال مثلاً لاؤڈ اسپیکر، موٹر کار، ریل گاڑی اور جہاز وغیرہ بدعت ہوگا۔)

جواب: آیتِ کریمہ پڑھ کر دعا کرنا آفتِ سماوی کو دفع کرنے کے لیے تو مروج رہا ہے اور ضرورت کی خاطر آیتِ کریمہ کو خاص مقدار میں اجتماعی خواندگی بھی ہوتی رہی ہے، لیکن انسانوں کو

راہِ راست پر لانے اور ان کو جاہلی تعصبات سے نکالنے کے لیے آیتِ کریمہ کا وِرد اور اجتماعی دعا کا فلسفہ کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

اگر اس طرح سے اللہ تعالیٰ جاہلیت کو ختم کرتا تو انبیا علیہم السلام اور ان کے متبعین اہلِ ایمان کی اصلاحی جدوجہد اور اس راہ میں قربانیاں دینا بے معنی ہو کر رہ جاتا۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ان حضرات سے سنت و بدعت کی بحث میں الجھنے کی بجائے ان کو مسئلے کا اصلی اور صحیح حل سمجھانے کی کوشش کریں۔ جہاں تک سنت و بدعت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جو فعل فی نفسہٖ جائز ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور سلف صالحین نے اسے اجتماعی طور پر نہ کیا ہو اسے ثواب سمجھ کر اجتماعی بنانا بدعت ہے۔ لیکن اگر کسی دوسری وجہ سے اجتماعی بن جائے جیسے ایک وظیفہ کی خاص مقدار پڑھنا ہو اور اسے اکیلا نہ پڑھا جا سکتا ہو تو اس کے لیے اجتماع کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اسے سنت نہ سمجھا جائے۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۸۸ء)

ختمِ قرآن پر کھانا

سوال: ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ لوگ ختم قرآن پاک کے لیے گھروں میں بلائے جاتے ہیں یا کسی خیرات کے موقع پر ختم قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ختم کے بعد چائے یا کھانا دیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں پہلے ہمارے ایک دوست نے ایک مسئلہ اٹھایا ہے کہ ختمِ قرآن کے بعد کسی قسم کا اکل و شرب گناہ ہے۔ اپنی بات کی تائید میں اس نے مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث پیش کی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ قرآن پر معاوضہ لیتے ہیں قیامت کے روز اِن کے چہروں کی ہڈیاں گوشت سے خالی ہوں گی۔ دو مقامی علما سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا تو ایک نے اثبات میں جواب دیا دوسرے نے نفی میں۔ میں عجیب الجھن میں مبتلا ہوں۔ کسی دوست کے گھر ختمِ قرآن کے لیے جاتا ہوں اگر بغیر کھانا کھائے آ جاتا ہوں تو وہ

خفا ہوتا ہے اور اگر کھانا کھاتا ہوں تو یہ فکر ہوتی ہے کہ واقعی کہیں یہ کھانا باعثِ گناہ نہ ہو۔ ایک صاحب نے یہ صورت نکال دی ہے کہ ایسے موقعوں پر پروگرام میں شرکت کر کے بغیر قرآن پڑھے ہوئے کھا سکتے ہیں یا آپ کے ذمے قرآن پاک کے جو پارے پڑھنے ہوں ان کو کسی اور سے پڑھوا کر آپ کھا پی سکتے ہیں۔

مہربانی کر کے قرآن وسنت اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے تعامل کی روشنی میں بتائیں کہ ختمِ قرآن کے بعد کھانا چاہیے یا نہیں؟

جواب: اجرت پر قرآن پڑھنے سے پڑھنے والوں کو ثواب نہیں ملتا، جب اسے ثواب نہیں ملتا تو میت کو ثواب کیسے پہنچے گا۔ فقہا نے ایصالِ ثواب کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ پڑھنے والا کسی معاوضے کے بغیر قرآن پاک پڑھے اور اس کا ثواب میت کو پہنچائے۔ اگر آپ بلا معاوضہ قرآن پاک پڑھیں اور میت کے ورثا آپ کو کھانا کھلا دیں تو کھانا کھا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جو لوگ رواجی ختم کراتے ہیں اور قرآن پڑھنے والوں کو کھانا کھلاتے ہیں وہ کھانا حرام نہیں ہے اور نہ اس کو کھا لینا حرام ہے۔ البتہ معروف یہی ہے کہ اس کے بغیر لوگ ختم پڑھنے کے لیے جمع نہیں ہوتے تو اب اس کی حیثیت معاوضہ کی ہوگئی اور اس کا فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ یعنی ایصالِ ثواب کا جو مقصد ہے وہ اس سے پورا نہیں ہوگا۔ اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ میت کے ورثا ایصالِ ثواب کے لیے فقرا اور مساکین کو کھانا کھلا دیا کریں اور ان سے قرآنِ پاک نہ پڑھائیں بلکہ خود قرآن پاک پڑھ کر ثواب پہنچائیں یا میت کے دیگر احباب سے کہہ دیں کہ وہ اپنی اپنی جگہ قرآنِ پاک پڑھ کر ثواب پہنچا دیا کریں۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۸۸ء)

قرآن سنانے پر معاوضہ

سوال: جب حفاظِ کرام تراویح میں ختمِ قرآن کراتے ہیں تو بعض مساجد میں اس موقع پر حافظ صاحب کو تحفے میں کپڑوں کا جوڑا یا مٹھائی وغیرہ دی جاتی ہے۔ ختمِ قرآن کے موقع پر تقریب منعقد کر کے عام لوگوں میں مٹھائی بھی تقسیم کی جاتی ہے۔ خاص طور پر حافظ صاحب کے لیے چندہ بھی جمع کیا جاتا ہے۔

فضائلِ اعمال میں باب فضائلِ قرآن میں ایک روایت پڑھی جس میں حضرت اُبی بن کعبؓ نے کسی کو قرآن کی کوئی آیت سکھائی تو اس نے تحفے میں ان کو تیر کمان دی۔ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوئے تو آپؐ کے استفسار پر حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تیر کمان مجھے فلاں نے قرآن کی آیت سکھانے کے نتیجے میں تحفتاً دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تحفہ نہیں، بلکہ تم نے جہنم کے تیروں میں سے ایک تیر لیا ہے۔ اس کی روشنی میں حافظ کا تحائف لینا کیسا ہے؟

جواب: ختمِ قرآن کے موقع پر حافظِ قرآن کو تحفہ پیش کرنا جائز ہے۔ آپ نے جو حدیث لکھی ہے اس کا تعلق مطلقاً تحفے سے نہیں ہے، بلکہ ایسے شخص سے تحفہ قبول کرنا ہے جو فقیر اور مسکین ہو اور خود اس بات کا مستحق ہو کہ اس کی اعانت کی جائے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس تحفے میں اجرت کا احتمال ہو۔

حضرت اُبی بن کعبؓ کی روایت میں تو ایک آدمی کو تعلیم دینے کا ذکر ہے اور حضرت عبادۃ بن صامتؓ کی روایت میں اصحابِ صفہ کو تعلیم دینے کا ذکر ہے۔ ابن ماجہؒ نے دونوں روایتیں ذکر کی ہیں۔ حضرت اُبی بن کعبؓ کی روایت میں اصل الفاظ یہ ہیں کہ انھوں نے خود اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضرت عبادۃ بن صامتؓ کی روایت میں ہے کہ انھوں نے چند اصحابِ صفہ کو قرآن پاک کی تعلیم دی تھی اور ان میں سے ایک آدمی نے ان کو ہدیے میں کمان دی تھی۔ یہ کمان بھی اجرت

میں نہیں دی گئی تھی۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت اُبی بن کعبؓ کے ذہن میں اجرت کا خیال تک نہیں تھا اور اسی لیے انھوں نے اس نیت سے کمان وصول کر لی تھی کہ یہ کوئی بڑا مال نہیں ہے اور نہ اجرت میں لینے دینے کی چیز ہے، تاہم انھوں نے اسی خیال سے لے لی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم معلوم کر لیں گے۔ حضرت عبادۃ بن صامتؓ اور حضرت اُبی بن کعبؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تحفہ تھا، اجرت نہ تھی۔ اس لیے کہ اجرت وہ ہوتی ہے جس میں کام بھی طے ہو اور اس کا عوض بھی طے ہو۔ ہدایہ میں ہے: اَلْاِجَارَۃُ عَقْدٌ یَرِدُ عَلَی الْمَنَافِعِ بِعِوَضٍ وَّلَا یَصِحُّ حَتّٰی تَکُوْنَ الْمَنَافِعُ مَعْلُوْمَۃً وَّالْاُجْرَۃُ مَعْلُوْمَۃً[1] اجارہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کا تعلق منافع کے معاوضے سے ہے، یہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک کام اور انتفاع کا تعین نہ ہو اور اس کی اجرت متعین نہ ہو۔

جب کمان اجرت کے طور پر نہیں دی گئی تو پھر دوسری صورت یہی ہے کہ وہ تحفہ ہے۔ تحفے کا لین دین قابلِ اعتراض نہیں ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کے پیش نظر، کہ یہ تحفہ اگر چہ احسان کے بدلے احسان کے طور پر دیا گیا ہے لیکن اسے اصحابِ صفہ جیسے مخلصین سے، جنھوں نے اپنے آپ کو فی سبیل اللہ تحصیلِ علم اور جہاد کے لیے وقف کیا ہوا ہے، لیا جائے تو یہ دینی تعلیم پر معاوضہ لینے کی بنیاد نہ بن جائے، فرمایا کہ اگر تم پسند کرتے ہو کہ آگ کا طوق گردن میں ڈالو تو پھر اسے قبول کر لو۔ حدیث کا اصل تعلق قرآنِ پاک کی تعلیم پر تحفہ لینے سے ہے۔ رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن پاک سنانا تعلیم نہیں ہے، اس لیے تراویح کے موقع پر جو تحفہ دیا گیا ہے، اس سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

جہاں تک تعلیم القرآن پر اجرت کا تعلق ہے تو اس کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کا حکم مختلف ہے:

۱- تعلیم القرآن یا دینی تعلیم یا دینی کاموں پر بیت المال سے تنخواہ لینا، جائز ہے۔ خلفاے راشدین کے دور اور خیر القرون میں بیت المال سے دینی خدمات پر معاوضہ دیا جاتا تھا۔ خود خلفاے راشدین نے خلافت کی خدمات سرانجام دینے کے عوض بیت المال سے

---

[1]- ہدایہ، کتاب الاجارہ۔

بقدرِ ضرورت اور بقدرِ گزارہ معاوضہ لیا ہے۔

۲- خلافتِ اسلامیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کے پرائیویٹ اداروں اور تنظیموں نے ریاستی بیت المال کی جگہ دینی تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے اپنے بیت المال قائم کر لیے اور عرصہ دراز سے دنیا بھر میں تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ اور اقامتِ دین کا کام دینی مدارس کی انجمنوں، مساجد کی کمیٹیوں اور مساجد کی تنظیموں کے ذریعے سرانجام دیا جارہا ہے۔ یہ بھی بالکل جائز ہے۔ اس لیے کہ اسلامی حکومت کے بیت المال اور پرائیویٹ انجمنیں تنخواہیں دے کر وہی فرض ادا کر رہی ہیں جو اُن پر عائد ہے۔

۳- تعلیم حاصل کرنے والوں سے معاوضہ لے کر انھیں تعلیم دینا، صورتِ اختلافی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز ہے اس لیے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے۔ ایک آدمی پر یہ بات تو فرض ہے کہ وہ تعلیم دے لیکن وہ مخصوص افراد اور مخصوص ادارے میں کام کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اس لیے مخصوص ادارے اور مسجد میں کام کرنے پر اجرت لے سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دینی تعلیم، اذان اور امامت پر اجرت جائز نہیں لیکن متاخرین نے زمانے کے حالات بدلنے اور بیت المال کی طرف سے اس کا اہتمام نہ ہونے پر اس صورت کو بھی جائز قرار دے دیا۔ یہ اس سبب سے بھی کیا گیا کہ دینی تعلیم اور خدمات کا نظام ایسی صورت میں بند ہو جائے گا جب کارکنوں کے لیے یہ روزگار کا ذریعہ نہ ہو۔ اس لیے کہ عملاً ایسا نہیں ہوسکتا کہ لوگ اپنا ذریعۂ معاش کسی اور چیز کو بنائیں اور تعلیم اور دینی خدمات رضاکارانہ طور پر سرانجام دیں[۱]

(ترجمان القرآن، اپریل ۲۰۰۰ء)

۱- هدايه كتاب الاجارة ص:۳۰۳' عون المعبود كتاب الاجارة باب كسب المعلم ص:۷۶' سنن ابن ماجه باب الاجر على تعليم القرآن ص:۱۵۶۔

ایصالِ ثواب

سوال: دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ قرآن پڑھ کر کیا کسی مُردے کو ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح حج اور قربانی کسی مردے کی جگہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: عبادات کی تین قسمیں ہیں۔ محض بدنی جیسے نماز روزہ، محض مالی جیسے زکوٰۃ، اور بدنی و مالی عبادات سے مرکب عبادات جیسے حج۔ ایصالِ ثواب ان تمام عبادات میں جائز ہے اور نیابت یعنی کسی دوسرے کی جگہ کسی عبادت کو ادا کرنا صرف دوسری دونوں عبادتوں میں جائز ہے۔ زکوٰۃ بھی دوسرے کی جگہ دی جاسکتی ہے اور حج بھی دوسرے کی جگہ کیا جاسکتا ہے۔ فرض حج دوسرے کی طرف سے کرنے میں شرط یہ ہے کہ وہ انسان خود حج ادا کرنے سے عاجز ہو اور موت تک عجز قائم رہے۔ البتہ نفل حج دوسرے کی جگہ ایسی صورت میں بھی کیا جاسکتا ہے کہ جس کی طرف سے حج کیا جارہا ہے وہ عاجز نہ ہو۔ ہدایہ میں ہے: اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب چاہے نماز، روزہ، صدقہ ہو یا کوئی اور عبادت، دوسرے کو پہنچائے، اس لیے کہ روایت کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو خوبصورت مینڈھوں کی قربانی دی، ایک کی اپنی طرف سے اور دوسرے کی اپنی امت کے اُن لوگوں کی طرف سے جنھوں نے توحید کا اقرار کیا ہو اور آپ کی تبلیغِ حق کی شہادت دی ہو۔

عبادت کی کئی اقسام ہیں۔ محض مالی جیسے زکوٰۃ، محض بدنی جیسے نماز اور دونوں سے مرکب جیسے حج۔ پہلی نوع میں نیابت اختیاری اور اضطراری دونوں حالتوں میں ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ مقصود نائب کے فعل سے پورا ہو جاتا ہے اور دوسری نوع میں کسی بھی حال میں نیابت نہیں ہوسکتی کیونکہ مقصود، یعنی نفس کو مشقت میں ڈالنا، نائب کے فعل سے حاصل نہیں ہوتا اور تیسری نوع میں عجز کی صورت میں نیابت ہوسکتی ہے۔ مالی عجز کی وجہ سے، کہ مال خرچ کر کے اس میں کمی کے ذریعے مشقت اٹھانا اس میں پایا جاتا ہے۔ لیکن قدرت کی صورت میں نیابت نہ ہوسکے گی، اس

لیے کہ نفس پر کوئی بوجھ نہیں پڑا۔ شرط یہ ہے کہ عجز موت کے وقت تک قائم رہے کیونکہ حج عمر بھر کا فرض ہے۔ قدرت کے باوجود نیابت کی صورت میں نفلی حج اس آدمی کی طرف سے ہوگا جس کی طرف سے کیا گیا ہے۔ جو احادیث اس باب میں آئی ہیں وہ اس کی شہادت دیتی ہیں۔ جیسے قبیلہ خثعم کی عورت کا واقعہ کہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرو۔ امام محمد سے ایک روایت ہے کہ حج اس آدمی کا شمار ہوگا جس نے حج کیا ہے اور حج کرانے والے کو خرچ کا ثواب ہے کیونکہ یہ بدنی عبادت ہے اور عاجز ہونے کی صورت میں انفاق حج کے قائم مقام ہو جائے گا جیسے فدیہ روزے کی جگہ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ نجم کی آیت ۳۸-۳۹ کی تفسیر کرتے ہوئے، تفہیم القرآن جلد پنجم، حاشیہ ۳۷-۳۸ میں ان مسائل کی اچھی طرح وضاحت فرمائی ہے۔ آپ متعلقہ حصے کا مطالعہ فرمالیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ کثیر روایات جو ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہیں اس امر کی تصریح کرتی ہیں کہ ایصالِ ثواب نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہر طرح کی عبادات اور نیکیوں کے ثواب کا ایصال ہو سکتا ہے۔ اور اس میں کسی خاص نوعیت کے اعمال کی تخصیص نہیں۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۳ء)

تنگ دستی میں ایصالِ ثواب

سوال: میری والدہ گذشتہ دنوں انتقال فرما گئی ہیں۔ میں ان کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے صدقہ وخیرات اور بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن غریب اور تنگ دست ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیے کہ ایک غریب اور تنگ دست آدمی اپنے والدین کے ایصالِ ثواب کے لیے کیا کر سکتا ہے؟

جواب: ایصالِ ثواب کے لیے مال دار ہونا ضروری نہیں۔ مال دار ہوں تو فی سبیل اللہ مال

خرچ کرنا ایصالِ ثواب کی ایک شکل ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی نیک کام کیا جائے اس کے ذریعے ایصالِ ثواب ہوسکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ [بخاری، کتاب الادب، باب ۳۳] ہر نیکی صدقہ ہے۔ اسی طرح اولاد جو بھی نیک کام کرتی ہے اس کا ثواب اس کے ماں باپ کو پہنچ جاتا ہے۔ مسلمان جو بھی نیکی کرتے ہیں ان کا ثواب سلسلہ بہ سلسلہ ان کے آباواجداد سے ہوتا ہوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے اور ہر ایک کو اس کا پورا پورا ثواب ملتا ہے۔ آپ اپنی والدہ کو قرآن پاک پڑھ کر، نفل روزے اور نفلی عبادات کر کے اور ایک نیک آدمی کی زندگی گزار کر ثواب پہنچا سکتے ہیں۔ خصوصاً ان نیکیوں کو کر کے، جن کی تعلیم آپ کو ان سے ملی۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۲۰۰۲ء)

درسِ قرآن دینے کا طریقہ

سوال: درسِ قرآن کا پروگرام کس طرح کرنا چاہیے کہ اس سے عام لوگ زیادہ فائدہ حاصل کرسکیں؟ کیا ہر پڑھا لکھا شخص درسِ قرآن دے سکتا ہے؟ یا اس کے لیے عالم ہونا شرط ہے؟ کیا کوئی تحریکی ساتھی کسی تفسیر مثلاً تفہیم القرآن یا معارف القرآن وغیرہ سے درس دے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: درسِ قرآن کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ کوئی تفسیر پڑھ کر سنا دیں۔ یہ درس وہ شخص دے سکتا ہے جو ترجمہ اور تفسیر کو سمجھتا ہو۔ اس نے ترجمے اور تفسیر کا مطالعہ کر کے اطمینان کرلیا ہو کہ اس میں جو لکھا گیا ہے وہ اسے سمجھ چکا ہے۔ ایسا شخص ترجمہ اور تفسیر پڑھ کر سنا سکتا ہے۔ سننے سنانے کے بعد اہلِ مجلس اسے بحث مباحثہ کے ذریعے سے مزید سمجھنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی ترجمہ و تفسیر میں بصیرت پیدا کر چکا ہو اور تفسیر پڑھ کر سنانے کی بجائے براہِ راست قرآن پاک سے ترجمہ و تفسیر پیش کرسکتا ہو۔ یہ وہ شخص ہوسکتا ہے جس نے لغت اور صرف ونحو کے ذریعے ترجمہ و تفسیر میں بصیرت پیدا کی ہو اور تفسیر کے دروس میں شامل

ہو کر اساتذہ سے استفادہ بھی کیا ہو۔ ایسا شخص براہِ راست درس دے سکتا ہے اور کبھی کوئی اشکال پیش آ جائے تو اس کے لیے علما سے رجوع کر سکتا ہے۔

تیسرا شخص وہ ہے جو باقاعدہ عالمِ دین ہو۔ یہ شخص قدیم وجدید تفاسیر کا مطالعہ کر کے محققانہ انداز میں درس دے گا۔

یہ تمام لوگ مذکورہ طریقوں سے درس دے سکتے ہیں۔ تفہیم القرآن، معارف القرآن، تدبر قرآن، تفسیر ابن کثیر، فی ظلال القرآن اور دیگر جدید تفاسیر کا مطالعہ کر کے مضمون پر عبور حاصل کیا جائے۔ اس کے بعد درس دیا جائے تو موثر ہوگا۔

جماعت اسلامی کے کارکن باقاعدہ تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ درس قرآن وحدیث دیتے ہیں وہ اجتماعات کے ذریعے بھی دروس قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعد میں ان کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں، اس لیے وہ جو درس دیتے ہیں اس پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ وہ محض مطالعہ کر کے درس نہیں دیتے بلکہ پڑھنے اور سمجھنے کے بعد درس دیتے ہیں اس لیے وہ پورے اطمینان کے ساتھ یہ خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۹ء)

ویران مسجد کا انہدام

سوال: حالیہ سیلاب کی بدولت ایک جامع مسجد منہدم ہوئی ہے جس کا کچھ ملبہ اور اینٹیں باقی بچ گئی ہیں۔ سیلاب سے پہلے اس مسجد میں باجماعت نماز ہوتی رہی ہے۔ اس سیلاب کی بدولت آبادیاں دور دور تک محفوظ مقامات پر چلی گئی ہیں۔ ایک دو افراد یا کوئی مسافر بعض اوقات اس مسجد میں نماز پڑھ لیتا ہے۔ امام مسجد اور دوسرے لوگ پریشان ہیں کہ آیا اس مسجد کو اسی جگہ دوبارہ تعمیر کیا جائے یا کسی دوسری جگہ آبادی میں منتقل کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں درج ذیل سوالات کا جواب درکار ہے:

۱- کیا اس مسجد کو اسی جگہ تعمیر کیا جائے جس جگہ پہلے تھی؟ لیکن باجماعت نماز ناممکن ہے۔

۲- کیا اس مسجد کا سامان اور اینٹیں اور ملبہ کسی دوسری مسجد پر لگا سکتے ہیں؟

۳- اس مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

متعدد علما نے مشورہ دیا ہے کہ اس مسجد کو دوبارہ اسی جگہ تعمیر کیا جائے یہی بہتر ہے۔ اس مسئلے کا مکمل و مدلل حل تجویز فرمائیں۔

جواب: آبادی کا دوبارہ امکان ہو تو مسجد اسی جگہ تعمیر کریں لیکن اگر لوگ مستقل طور پر دوسری جگہ چلے گئے ہوں تو اس مسجد کو محفوظ کر لیجیے۔ یہ مسجد بھی رہے اور دوسری جگہ الگ مسجد بنا لیجیے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس قسم کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا ہے:

> روایات بالا سے معلوم ہوا کہ اصل اور راجح تو عدم جوازِ نقل ہے لیکن بعض علما ضرورت (اضطرار) میں جواز کے قائل ہوئے ہیں۔ سو بلا ضرورتِ شدیدہ تو اصل مذہب کو چھوڑنا جائز نہیں اور ضرورتِ شدیدہ میں گنجایش ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ایک مسجد مستغنیٰ عنہ ہو جائے (یعنی اس کی ضرورت نہ رہے) تو اس کا وقف دوسری مسجد میں صرف کرنا بھی جائز ہے۔[۱]

ضرورتِ شدیدہ اور مسجد سے بے نیازی کا مطلب یہ ہے کہ آبادی وہاں سے عارضی طور پر نہ گئی ہو بلکہ مستقلاً چلی گئی ہو اور دوبارہ وہاں آبادی کی توقع نہ ہو۔ چونکہ اس کا فیصلہ جلدی جلدی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ جہاں ضرورت ہو وہاں الگ سے مسجد بنالی جائے اور موجودہ مسجد کو جس شکل میں ہے محفوظ کر لیا جائے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۳ء)

۱- امداد الفتاویٰ، ج دوم، ص ۶۹۸-۶۹۹۔

حرام کی کمائی سے مسجد کی تعمیر

سوال: ہمارے محلے میں ایک صاحب نے مسجد اس آمدنی سے بنوائی ہے جسے منشیات کی آمدنی کہا جاتا ہے اور وہ آج کل امریکہ میں منشیات اسمگل کرنے پر سزا بھی کاٹ رہا ہے۔ مسجد کی زمین، تعمیر اور جملہ اخراجات اس شخص کی کمائی سے ہو رہے ہیں۔ کیا ایسی کمائی کی بنائی گئی مسجد میں نماز اور دیگر عبادات شرعی طور پر درست ہیں؟

جواب: ایک ایسا شخص جس کی کمائی حلال وحرام دونوں پر مشتمل ہے، اگر اس کی زیادہ کمائی حلال کی ہے تو اس کی تعمیر کی ہوئی مسجد، مسجد شمار ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے مسجد حلال روپے سے بنوائی ہے۔ اس کے بجائے اگر اس کی حرام کی کمائی زیادہ ہے تو آپ ایسے شخص سے جو اسمگلنگ اور منشیات فروشی کا کام کرتا ہے، مسجد کی تعمیر کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں کہ اس میں کون سی رقم لگائی گئی ہے۔ اگر وہ کہے کہ حلال کی کمائی سے مسجد تعمیر کی ہے، تو پھر آپ اس مسجد میں بلاتردد نماز پڑھ سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۲۰۰۰ء)

مسجد کی تزیین و آرایش

سوال: ۱- قرآن پاک کی آیات واحادیث کو قبلے کی جانب کی دیوار کے علاوہ شمال وجنوب کی جانب کندہ کرانا کہاں تک درست ہے؟ بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ مسجد میں چاروں طرف آیات ہی آیات لکھی ہیں۔

۲- مسجد میں قرآن پاک کی آیات پہلی منزل کی دیواروں پر ابھار کر لکھی جائیں تو چھت پر چلنے سے ان آیات کا تقدس پامال ہوتا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

۳- مسجد کے ہال یا برآمدے میں سردیوں اور گرمیوں کے لیے علیٰحدہ کمرہ بنایا جائے جہاں ۲۰، ۳۰ آدمیوں کے نماز باجماعت ادا کرنے کی گنجایش ہو حالانکہ ہال میں ۲۵۰ نمازی باجماعت نماز ادا کرسکتے ہیں۔ کیا اس طرح کا انتظام شرعاً جائز ہے؟ کیا ایسا کرنے سے پہلی صف کا ثواب محدود نہ ہوجائے گا، جب کہ مسجد ایک ذاتی کمرے تک محدود ہوجائے گی؟

جواب: نماز کا اصل مقصد خشوع وخضوع اور پورے انہماک کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (بخاری و مسلم) اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے (یعنی اس کے مشاہدے کا تصور نہیں کرسکتے) تو (یہ ایک حقیقت ہے کہ) وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

پہلی صورت کا نام مشاہدہ اور دوسری کا نام مراقبہ ہے، یعنی اللہ کا بندے کو دیکھنا اور اس کی نگرانی کرنا۔ نماز میں جو خشوع وخضوع مطلوب ہے وہ اس درجے کا ہونا چاہیے جو مذکورہ دونوں کیفیات (مشاہدہ و مراقبہ) کی حالت میں ہوسکتا ہو۔ آنکھوں سے غائب ذات کا دل کی نگاہوں سے دیدار کرنا یا یہ محسوس کرنا کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، دنیا میں ایمانی کیفیات میں سب سے اونچی کیفیت ہے۔ مطلوب جتنا اعلیٰ وارفع ہوتا ہے اس کا حصول اتنا ہی مشکل بھی ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کے لیے کوشش بھی زیادہ کی جاتی ہے اور رکاوٹیں بھی دور کی جاتی ہیں۔ یہ مطلوب کسی بھی درجے میں اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب نمازی اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ[1] (الانعام ۶:۷۹) کے تقاضے کے مطابق صرف اللہ کی طرف توجہ کرے۔ اس کی حمد وثنا اور اس کا کلام پڑھتے ہوئے اذکار و تسبیحات کا ورد کرتے ہوئے اس کی بحرِ معرفت میں مستغرق ہو، دوسری طرف ذرہ برابر بھی توجہ نہ کرے۔ اسی لیے نماز کے آداب میں یہ شامل ہے کہ نمازی کے آگے کوئی ایسی چیز نہ ہو جو اس کی نظر کو اصل مطلوب سے دوسری طرف پھیر دے۔

۱- یقیناً میں نے یکسو ہوکر اپنا رخ اس ذات کی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔

حضرت ابوجہم نامی ایک صحابیؓ نے آپؐ کو بیل بوٹوں والا جبہ ہدیہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے عوض میں انھیں ایک سادہ جبہ ہدیہ کیا۔ آپؐ نے اس رنگ برنگے جبے میں نماز پڑھی، نماز پڑھتے ہی اسے اتار دیا اور فرمایا: یہ جبہ ابوجہم کو دے دو اور اس سے میرا سادہ جبہ واپس لے آؤ یہ تو مجھے نماز سے غافل کرنے لگا تھا (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نقش ونگار اور چمک دمک والے جبے کو جس نے آپؐ کی توجہ کو ایک لحظے کے لیے اپنی طرف پھیر لیا تھا، اتار پھینکا۔ اگر چہ جبے کی طرف توجہ اس قدر زیادہ نہ ہوئی تھی کہ توجہ الی اللہ باقی نہ رہی ہو۔ نماز کی طرف آپؐ کی توجہ پوری طرح قائم تھی۔ اس سے یہ مسئلہ نکل آیا کہ نمازی کے سامنے کوئی بھی ایسی چیز نہ ہونی چاہیے، جو اسے نماز سے ہٹا کر دوسری طرف مشغول کردے۔

اس بنا پر مسجد کے سامنے والی دیوار پر نقش ونگار، قرآنی آیات اور خانۂ کعبہ اور مسجد نبویؐ کے عکس نہیں ہونے چاہییں۔ البتہ محراب سے اوپر اتنی بلندی پر کہ نمازی کی نظریں وہاں تک اس وقت پہنچیں، جب وہ سر اوپر اٹھا کر دیکھے تو اتنی بلندی پر قرآنی آیات لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت عثمان بن طلحہؓ سے روایت ہے: اِنَّ النَّبِیَّ دَعَاہُ بَعْدَ دُخُوْلِہِ الْکَعْبَۃَ فَقَالَ لِیْ اِنِّیْ کُنْتُ رَأَیْتُ قَرْنَیِ الْکَبْشِ حِیْنَ دَخَلْتُ الْبَیْتَ فَنَسِیْتُ اَنْ اٰمُرَکَ اَنْ تَخْمَرَھَا فَاخْمَرْھَا فَاِنَّہٗ لَایَنْبَغِیْ اَنْ یَّکُوْنَ فِیْ قِبْلَۃِ الْبَیْتِ شَیْءٌ یَّلْھِی الْمُصَلِّیْ (ابوداؤد، کتاب المناسک) حضور اقدسؐ نے حضرت عثمان بن طلحہؓ (کلید بردار کعبہ) کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا: ہم نے کعبہ میں دنبے کے سینگ دیکھے تھے[1]۔ مجھے تم سے یہ کہنا یاد نہ رہا کہ ان کو ڈھانک دو، سو اب ڈھانکو کہ نمازی کے سامنے کوئی چیز ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے توجہ ہٹے۔

ہاں اگر اتنی بلندی پر ہو کہ سر اٹھا کر دیکھنے سے نظر آئے تو یہ نمازی کا قصور ہے۔ نماز کی حالت میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

۲- دیوار کے اوپر ابھری ہوئی آیاتِ قرآنی لکھنا جائز ہے، جب کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق لکھی گئی ہوں۔ آپ کا یہ خیال کہ چھت پر لوگ چلیں گے تو اس کی وجہ سے آیات کی بے حرمتی ہوگی، صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ عرف میں جب آیات اور چلنے والے کے درمیان پردہ ہو تو بے حرمتی

۱- وہ دنبہ جو سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ ہوا اس کے سینگ کعبہ معظمہ کی مغربی دیوار میں لگے ہوئے تھے۔

شمار نہیں ہوتی اور شریعت کا یہ مستقل اصول ہے کہ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۲۲:۷۸) اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

۳- مسجد کے ہال کے ساتھ اگر چھوٹی مسجد تعمیر ہو تو اس میں سردی اور گرمی کے موسم میں نماز پڑھنا جائز ہے لیکن اگر وہ کوئی مکان ہے مسجد نہیں تو پھر اس کا حکم مسجد کا نہ ہوگا۔ چھوٹی مسجد اور بڑی مسجد دونوں میں صفِ اول کا ثواب ان لوگوں کو مل جائے گا جو بڑی مسجد کی صفِ اول میں یا چھوٹی مسجد کی صفِ اول میں نماز پڑھیں۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۲۰۰۲ء)

شہید کی تدفین

سوال: میرا تعلق آزاد کشمیر کے سرحدی گاؤں بنڈالہ سے ہے جہاں ۱۹۹۸ء میں بزدل بھارتی فوج نے چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں آکر سوئے ہوئے ۲۲ افراد، معصوم بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان سب ذبح کر دیے تھے۔ مذکورہ واقعے میں سے متاثرہ ایک خاندان جماعت سے وابستہ تھا۔ دشمن کی کاروائیاں سرحدی عوام پر بھی ہوتی رہتی ہیں۔ ہر روز یا ہر ہفتے دشمن کی گولیوں یا گولوں سے مسلمان خواہ اپنے گھروں کے اندر ہوں یا باہر کھیتوں میں یا آ جا رہے ہوں، نشانہ بنتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں کوئی آدمی فوت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں متوفی کے غسل وکفن وغیرہ کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ کیا ایسے وفات پانے والے شخص کو غسل یا کفن دیا جائے گا یا نہیں؟

جواب: جو مسلمان کفار کے ہاتھوں قتل ہوں اور موقع پر شہید ہو جائیں، انھیں ان کے کپڑوں میں دفن کیا جائے گا اور غسل نہیں دیا جائے گا۔ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ ان کے جسم سے شلوار اور قمیص کے علاوہ زائد کپڑوں اور ہتھیاروں کو اتار لیا جائے گا۔ جسم یا کپڑوں پر کوئی گندگی لگی ہوئی ہو، تو اسے بھی صاف کر دیا جائے گا۔ لیکن شہید کے خون کو صاف نہیں کیا جائے گا۔ اگر زخمی ہونے کے بعد ہسپتال یا گھر میں لایا گیا اور اسے دوا یا غذا دی گئی اور اس کے بعد وفات ہوئی ہو تو پھر اس کو غسل دیا

جائے گا اور نئے کفن میں دفن کیا جائے گا۔(فتاویٰ عالمگیری، درمختار، ہدایہ)۔

اس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداے احد کو بغیر غسل کے ان کے جسموں اور لباس پر لگے ہوئے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا تھا: اَمَرَ بِدَفْنِهِمْ بِدِمَآئِهِمْ وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُغَسِّلُوْا [1] آپؐ نے ان کو ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا، ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی [2] اور انھیں غسل نہیں دیا گیا تھا.........

ایک شہادت تو وہ ہے جو فی سبیل اللہ حاصل ہو، کفار کے ہاتھوں مسلمان قتل ہو جائے۔ دوسری شہادت، جو شہادت فی سبیل اللہ کے حکم میں ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کا ظلماً قتل کیا جائے اور اس کے قتل پر دیت واجب نہ ہو بلکہ قصاص واجب ہو مثلاً ڈاکو، باغی یا دوسرے ظالم دہشت گرد کسی کو قتل کر دیں تو وہ بھی شہید کے حکم میں ہوگا۔ اسے بھی غسل نہیں دیا جائے گا اور اسی لباس میں دفن کیا جائے گا، جس میں قتل ہوا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلشُّهَدَآءُ خَمْسَةٌ: اَلْمَطْعُوْنُ وَالْمَبْطُوْنُ وَالْغَرِيْقُ وَ صَاحِبُ الْهَدَمِ وَالشَّهِيْدُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (بخاری، کتاب الاذان) شہدا پانچ ہیں طاعون سے اور اسہالوں کی بیماری سے فوت ہونے والا، ڈوب کر مرنے والا، گر کر مرنے والا اور شہید فی سبیل اللہ۔ بعض روایات میں جل کر مرنے والے کو بھی شہید کہا گیا ہے۔

ان احادیث سے مراد یہ نہیں ہے کہ انھی بیماریوں اور حادثات میں مرنے والے شہید ہیں بلکہ اس طرح کی دوسری غیر معمولی تکلیف دہ بیماریوں اور حادثات سے مرنے والے بھی شہید شمار ہوں گے جیسے ایک حدیث میں عورت کو جو ولادت کی تکلیف سے مر جائے، شہید کہا گیا ہے۔ وَالْمَرْأَةُ تَمُوْتُ بِجُمْعٍ شَهِيْدٌ (ابوداؤد، کتاب الجنائز) لیکن شہدا کی یہ قسمیں صرف اخروی ثواب کے لحاظ سے ہیں۔ غسل، کفن، دفن اور دیگر احکام میں وہ شہید نہیں ہیں۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۲۰۰۰ء)

۱- صحیح بخاری، باب من لم یرغسل الشهداء کتاب الجنائز، باب الصلوٰة علی الشهيد ص ۱۷۹، کتاب المغازی، باب من قتل من المسلمین یوم احد

۲- الگ الگ نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ اجتماعی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ دس دس آدمیوں کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی، اس طرح سات جنازے ہوئے تھے

موت فوت کی رسوم

سوال: ہماری برادری مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں معلومات چاہتی ہے مہربانی کر کے قرآن وحدیث کے مطابق جواب ارسال فرمائیں۔

۱- برادری میں اگر کوئی فرد انتقال کر جائے تو مقامی شہر کے اور دوسرے شہروں کے رشتہ دار اس کے جنازے میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور دفن کے بعد تین دن سوگوار کے گھر گزارتے ہیں۔ کیا سوگوار کے گھر تین دن رہنا جائز ہے؟

۲- اس دوران شہر کے رشتہ دار اپنے اپنے گھروں سے کھانا لا کر سوگوار اور مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور خود بھی ساتھ کھاتے ہیں۔ یہ خدمت دو تین دن تک جاری رہتی ہے۔ کیا لوگوں کا مرحوم کے گھر کھانا کھانا جائز ہے؟

۳- ساڑھے بارہ کلوگرام بھنے ہوئے چنے کے ایک ایک دانے پر کلمہ پڑھا جاتا ہے اور پورا قرآن شریف ختم کیا جاتا ہے۔ تیسرے دن سوا لاکھ کلمہ اور پورا قرآن شریف مرحوم کو بخشا جاتا ہے۔ کیا اس عمل سے مرحوم کو ثواب ملے گا؟

۴- اس کے بعد ایک وقت کا کھانا نزدیکی رشتہ دار اجتماعی طور پر پکاتے ہیں خرچہ برابر برابر تقسیم کر کے ادا کرتے ہیں اور کھانے میں سوگوار اور مہمانوں کے علاوہ شہر کے رشتہ داروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی رشتہ دار اس میں حصہ نہ لے تو سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اور حصہ لینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ کھانا عام طور پر گوشت روٹی ہوتا ہے۔ لیکن کئی اصحاب اس کھانے کو ناجائز کہتے ہیں اور کھانے سے انکار کرتے ہیں۔ کیا اجتماعی کھانا ناجائز ہے؟

۵- سوگوار کے گھر کا پانی تو استعمال کر لیتے ہیں، مگر چائے، پان اور سگریٹ وغیرہ کو استعمال نہیں کرتے خواہ بازار سے لا کر دیں۔ یہ پابندی مرحوم کے انتقال کے وقت سے ۲۷ گھنٹے جاری رہتی ہے۔ کیا سوگوار کے گھر کا پانی استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب :۱- مسلمان بھائی کے جنازے میں شرکت کرنا اسلامی اخوت کا تقاضا ہے اور مسلمان بھائی کا حق ہے۔ جنازے میں شرکت کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے لیکن جنازے میں شرکت اورتعزیت کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلا جانا چاہیے۔ میت کے گھر میں ٹھہرے رہنا اور جمع رہنا مناسب نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

وَ فِی الْاِمْدَادِ: وَ قَالَ کَثِیْرٌ مِّنْ مُتَاَخِّرِیْ اَئِمَّتِنَا: یَکْرَہُ الْاِجْتِمَاعُ عِنْدَ صَاحِبِ الْبَیْتِ وَ یَکْرَہُ الْجُلُوْسُ فِیْ بَیْتِہٖ حَتّٰی یَاْتِیَ اِلَیْہِ مَنْ یُّعَزِّیْ بَلْ اِذَا فَرَغَ وَ رَجَعَ النَّاسُ مِنَ الدَّفْنِ فَلْیَتَفَرَّقُوْا وَ یَشْتَغِلُ النَّاسُ بِاُمُوْرِھِمْ وَ صَاحِبُ الْبَیْتِ بِاَمْرِہٖ[۱]
صاحبِ خانہ کے پاس اجتماع اور اس کا گھر میں بیٹھ جانا کہ لوگ اس کے پاس تعزیت کے لیے آئیں مکروہ ہے بلکہ جب وہ فارغ ہو جائے اور لوگ میت کو دفن کر کے واپس آ جائیں تو منتشر ہو جانا چاہیے۔لوگ اپنے کام کریں اور صاحبِ خانہ اپنا کام۔

اس لیے میت کو دفنا دینے کے بعد میت کے گھر میں ٹھہرنے کو ایک رسم بنالینا درست نہیں ہے۔ بلکہ اپنی اور گھر والوں کی سہولت کو مدِّ نظر رکھ کر کسی رسم کے بغیر ٹھہرنے یا چلے جانے کا پروگرام بنانا چاہیے[۲]۔

۲- میت کے گھر والوں کو ایک دن رات کا کھانا کھلانے کا انتظام پڑوسیوں اور دور کے قرابت داروں کو کرنا چاہیے جیسا کہ رد المحتار میں ہے:

وَ یُسْتَحَبُّ لِجِیْرَانِ اَھْلِ الْبَیْتِ وَ الْاَقْرِبَآءِ الْاَبَاعِدِ تَہْیِئَۃُ طَعَامٍ یُّشْبِعُھُمْ یَوْمَھُمْ وَ لَیْلَتَھُمْ[۳] اہلِ خانہ کے پڑوسیوں اور رشتے داروں کے لیے مستحب ہے کہ وہ اس قدر کھانا تیار کریں جو

۱- ردالمحتار، جلد۲ص:۲۳۱

۲- کسی گھر سے تعلق رکھنے والے ماں باپ، چچا، تایا، ماموں، بیٹے بیٹیاں، داماد بہوئیں وغیرہ تو گویا اسی گھر کے افراد ہوتے ہیں وہ جب تک ضرورت ہو، رک سکتے ہیں، خاص طور پر اہلِ خانہ کی خواہش پر ان کی بعض ضروریات کے لیے مثلاً بعض رکے ہوئے کاموں کی انجام دہی کے لیے، کسی بیمار کے علاج معالجے کے انتظام و تیمار داری کے لیے، اگر چند روز کھانا پکانے اور انتظامات کرنے کی ضرورت ہو تو بہن بھائی بھتیجے، بھانجے، چچا، تایا، پھوپھی وغیرہ رشتہ دار اس طرح کے موقعوں پر کام آ سکتے ہیں۔ (نعیم صدیقی)

۳- ردّ المحتار، ج۲،ص ۲۴۰۔

ان کے لیے ایک دن رات تک کافی ہو سکے۔

وہ قرابت دار جو دوسرے شہروں سے آئے ہوں، ان کے کھانے کا انتظام اس میں شامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ ان کے لیے دور دراز سے سفر کر کے آنے کے بعد فوری طور پر واپس جانا ممکن نہیں ہوتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ خانہ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے ایک دن رات کے کھانے کا انتظام کرنا چاہیے، بعد میں گھر والے خود اپنا انتظام کریں۔

۳- میت کے قرابت دار اور دوست احباب بلا اجرت قرآن پاک یا کوئی اور چیز پڑھ کر ثواب میت کو پہنچائیں تو فقہاے احناف اور دیگر متعدد فقہا کے نزدیک میت کو ثواب پہنچتا ہے۔ (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ اس کو ثواب پہنچا دے کہ وہ اس کا اہل ہو) اس لیے کہ ایک تو اجرت دے کر پڑھانے پر ثواب نہیں پہنچتا اور غیر ضروری قیود لگا کر پڑھنے کو معمول بنانا، جیسے کہ چنوں پر پڑھنے کا معمول ہے، درست نہیں ہے۔ جب کہ ہر طرح سے ثواب پہنچ سکتا ہے تو پھر اپنی طرف سے پابندیاں لگانا کیا معنی رکھتا ہے۔

۴- میت والوں کے گھر میں اجتماعی کھانے کا پروگرام بنانا بھی ایک رسم ہے جس کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ شریعت میں صرف ایک دن رات کے کھانے کا انتظام کرنے کی ہدایت ہے، اور وہ بھی اہل خانہ اور اس کے مہمان رشتہ داروں کے لیے۔

۵- سوگوار کے گھر کا پانی چائے وغیرہ قبول نہ کرنا اور اسے رسم بنانا درست نہیں ہے۔ الغرض بلاضرورت ٹھہر جانے کی رسم ڈالنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کو پانی وغیرہ کی ضرورت پیش آئے تو وہ سوگوار کے گھر سے پی سکتے ہیں، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۸۶ء)

تدفین سے پہلے فاتحہ خوانی

سوال: ایک مسئلے کی وضاحت قرآن وحدیث کی روشنی میں مطلوب ہے۔

ہمارے ہاں آبا واجداد سے یہ مستقل رواج چلا آ رہا ہے کہ بعد المرگ جب تک مرنے والے کو باقاعدہ تکفین وتجہیز کر کے اس کو دفن نہ کر دیا جائے اس پر فاتحہ نہیں پڑھی جاتی۔ یعنی موت کی خبر سن کر لوگ جمع تو ہو جاتے ہیں اور باہم مل کر بیٹھ جاتے ہیں مگر ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ یا دعاے مغفرت نہیں کرتے۔ یہ عمل صرف دفن کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور دو یا تین دن جاری رہنے کے بعد تیسرے دن قل تک رہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قبضِ روح کے فوراً بعد ایسا کیوں نہیں کیا جاتا جب کہ ایصالِ ثواب کا تعلق صرف روح سے ہوتا ہے۔ کیا کوئی حکم مانع ہے یا یوں ہی رواجاً ایسا ہوتا ہے؟ آج کل میت بذریعہ ہوائی جہاز بیرونِ ملک سے لاکر آبائی قبرستانوں میں دفن کرنے میں بعض اوقات دو تین ہفتے بھی لگ جاتے ہیں۔ اس تمام عرصے میں فاتحہ نہیں پڑھی جاتی۔ جب نعش پہنچ جاتی ہے اور اسے سپردِ خاک کر دیا جاتا ہے پھر یہ عمل دو یا تین دن تک جاری رہتا ہے ایسا کس حکم کے تحت کیا جاتا ہے؟ یہی رواج اس وقت بھی اپنایا جاتا ہے جب کہ مرنے والے کی نمازِ جنازہ متعدد مرتبہ کسی دوسرے مقام پر پہلے بھی ادا ہو چکی ہوتی ہے۔ سوال کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ ایسا رواج صدیوں پہلے ہمارے آبا واجداد سے چلا آ رہا ہے، جو یقیناً دینِ خداوندی کو ہم سے نہ صرف بہتر جانتے تھے، بلکہ اس پر عمل بھی فرماتے تھے۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ہمارا تعلق سادات خوارزمی خاندان سے ہے۔

جواب: میت کے فوت ہونے کے بعد میت کے ورثا اس کے کفن دفن میں مصروف ہوتے ہیں، اس لیے انھیں کسی دوسرے کام میں مصروف کرنا مناسب نہیں ہے۔

نیز میت کی جدائی کا پورا غم بھی دفن کر دینے کے بعد ہوتا ہے۔ اس لیے افضل یہی ہے کہ

تعزیت میت کو دفنانے کے بعد سے تین دن تک کی جائے۔ آج کل فاتحہ کی مروجہ شکل دراصل تعزیت ہے۔ اس لیے مروجہ فاتحہ میت کو دفن کردینے کے بعد کرنا چاہیے۔

وَ هِیَ بَعْدَ الدَّفْنِ اَفْضَلُ مِنْ قَبْلِهٖ لِاَنَّ اَهْلَ الْبَیْتِ مَشْغُوْلُوْنَ قَبْلَ الدَّفْنِ بِالتَّجْهِیْزِ وَ لِاَنَّ وُحْشَتَهُمْ بَعْدَ الدَّفْنِ لِفِرَاقِهٖ اَكْثَرُ وَ هِیَ اِذَا لَمْ یُرَمِنْهُمْ جَزَعٌ شَدِیْدٌ وَ اِلَّا قُدِّمَتْ لِتَسْكِیْنِهِمْ[1] دفن سے پہلے دعا کے بجائے دفن کے بعد زیادہ افضل ہے کیونکہ دفن سے پہلے اہلِ خانہ تجہیز وتکفین میں مصروف ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میت کی جدائی سے اُن کی وحشت دفن کے بعد زیادہ ہوتی ہے۔ یہ طریقہ اس وقت اپنایا جائے گا جب ان کی طرف سے زیادہ جزع فزع کا احساس نہ ہو۔ بصورتِ دیگر اُن کی تسلی اور تسکین کے لیے پہلے بھی دعا کی جاسکتی ہے۔

محض دعا کرنا پہلے بھی جائز ہے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب ابوسلمہ فوت ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں تو آپؐ نے بند فرمادیں۔ اور پھر فرمایا کہ جب روح قبض ہوتی ہے تو آنکھیں اسے جاتا ہوا دیکھتی ہیں اس لیے کھلی رہ جاتی ہیں۔ پھر آپؐ نے ان کے لیے دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَبِیْ سَلَمَةَ اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما۔[2]

پس آپ کے بزرگوں کا طریقہ صحیح تھا، اسی کو جاری رکھیں میت اگر باہر سے دیر سے لائی جارہی ہو تو ایسی صورت میں تعزیت دفن سے پہلے بھی کی جاسکتی ہے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۰ء)

۱- در مختار، جلد دوم، ص ۲۴۱۔

۲- بحر الرائق، ص ۱۸۳۔

لاؤڈ سپیکر پر تلاوت اور اعلانات وغیرہ

سوال: کیا مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے قرآن پاک کی تلاوت کی جاسکتی ہے یا اس کے ذریعے کسی کی موت اور نمازِ جنازہ کا وقت بتایا جاسکتا ہے؟

جواب: قرآنِ پاک کا ادب تقاضا کرتا ہے کہ اسے ان لوگوں کے سامنے پڑھا جائے جو اسے سننا چاہتے ہوں، اور ایسے حال میں پڑھا جائے جب کہ لوگ اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں۔ آج کل لاؤڈ سپیکروں پر قرآنِ پاک کی تلاوت کا جو طریقہ رائج ہے وہ کسی کے نزدیک بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب کے لیے قرآنِ پاک پڑھنا ہو تو اسے باوقار انداز سے ایسے لوگ پڑھیں جو خشوع اور خضوع کے حامل ہو، اور مجلس میں سننے والے ایسے لوگ ہوں جو اسی غرض سے بیٹھے ہوں۔ خطباتِ جمعہ میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال حسبِ ضرورت اور حسبِ حاجت ہونا چاہیے۔ ایسی شکل سے احتراز کیا جائے جس میں لوگوں کی نمازیں متاثر ہوں، مختلف مساجد کی جماعتوں کے اندر خلل پیدا ہو، اور نمازی اپنی تسبیحات اور قراءت بھول جاتے ہوں۔ لاؤڈ سپیکر کا استعمال چندہ کے لیے نامناسب ہے۔ اسی طرح حمد اور نعت خوانی کے لیے بھی اسے ایسے مواقع پر استعمال کرنا چاہیے جب لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ لاؤڈ سپیکر پر نمازِ جنازہ کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔ شبینہ میں بھی لاؤڈ سپیکر کا استعمال مسجد تک محدود ہونا چاہیے۔ گھروں میں تلاوت کی آواز پہنچ رہی ہو تو حتی الامکان سننے کی کوشش کی جائے اور امام صاحب سے گزارش کی جائے کہ وہ اس سلسلے میں سپیکر کا استعمال مسجد تک محدود کر دیں۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۵ء)

داڑھی کی شرعی حیثیت

سوال: داڑھی رکھنا سنت ہے یا واجب؟ داڑھی کی لمبائی قرآن وسنت، اجماعِ امت اور فقہِ حنفی کی روشنی میں کتنی ہونی چاہیے؟ کیا داڑھی کٹوانے والے کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ فقہا، مفسرین ومحدثین نے چار انگل لمبائی ضروری لکھی ہے۔ مولانا حسین احمدؒ مدنی، مولانا عاشق الٰہی، مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا محمد زکریاؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور کثرت کے ساتھ علمانے فتویٰ یا رسالہ کی شکل میں لکھا ہے کہ چار انگلی کی لمبی داڑھی ضروری ہے۔ جو اس سے کم رکھتا ہو، کٹواتا یا منڈواتا ہو، وہ امامت کے قابل نہیں۔ اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز لوٹانا واجب ہے کیونکہ داڑھی کٹوانا حرام ہے۔ ٹھوڑی کے نیچے گلے والے بالوں کا خط بنوانا جائز ہے یا نہیں ہے؟ اگر جائز ہے تو کس حد تک؟ نیز عصر حاضر کے بعض ممالک کی ممتاز دینی شخصیات کی داڑھیاں نہیں تھیں۔ انھیں فاسق کہا جائے گا یا نہیں؟

جواب: داڑھی رکھنا واجب ہے اور اس کا وجوب قرآن پاک کے اشارات اور احادیث رسولؐ کی تصریحات سے ثابت ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ [الروم۳۰:۳۰] (اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہ کرو) نیز تغیر خلقت کو اغواے شیطانی قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ [النساء۴:۱۱۹] میں لوگوں کو اپنی فطری خلقت تبدیل کرنے کے لیے کہوں گا اور وہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑیں گے۔

داڑھی مرد اور عورت کے درمیان امتیاز ہے اور اس کا مونڈنا اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑنا ہے۔

۲- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے اسے مختلف الفاظ

میں نقل کیا گیا ہے۔ بعض میں وَاَعْفُوا اللِّحٰی [بخاری، کتاب اللباس] (داڑھیوں کو زیادہ کرو، بڑھاؤ) بعض میں وَفِّرُوا اللِّحٰی [بخاری، کتاب اللباس] (داڑھی کو پورا کرو، زیادہ کرو) اور بعض میں اَرْخُوا اللِّحٰی [مسلم، کتاب الطہارۃ] کے الفاظ آئے ہیں، یعنی (داڑھیوں کو چھوڑ دو)

بڑھانے، زیادہ کرنے اور چھوڑ دینے کی مقدار کیا ہے؟ اس کا احادیثِ مرفوعہ میں ذکر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ بڑھانے کی اگر خاص مقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ہوتی تو آپؐ اسے بیان فرماتے، صحابۂ کرامؓ اپنے اقوال میں اس کا ذکر کرتے۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑھانے کی کوئی خاص مقدار شرع میں مقصود نہیں ہے۔ بڑھانے کے تین مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اس طرح بڑھایا جائے کہ اسے قینچی تک نہ لگائی جائے۔ اور جس قدر بڑھے اسے بڑھنے دیا جائے۔ جمہور کے نزدیک یہ مرتبہ مراد نہیں۔ لیکن بعض فقہا کے نزدیک مطلقاً بڑھانا واجب ہے، اور اسے کاٹنا جائز نہیں ہے۔ جن احادیث سے کاٹنا ثابت ہوتا ہے انھیں وہ ضعیف قرار دیتے ہیں۔ علمائے سعودی عرب، شیخ عبدالعزیز بن باز وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ داڑھی مونڈنے اور کاٹنے کا کیا حکم ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: داڑھی کا مونڈنا اور کاٹنا حرام ہے۔

اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں ان کی تصریحات دونوں صورتوں کو شامل ہیں۔ وَاَعْفُوا اللِّحٰی، اَرْخُوا اللِّحٰی، وَفِّرُوا اللِّحٰی وغیرہ کا مطلب یہ ہے کہ اسے بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے، نہ مونڈا جائے اور نہ کاٹا جائے۔[1]

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ ایک قُبضے تک نہ کاٹا جائے، قُبضے سے زائد کو کاٹا جائے۔ اس مرتبے پر عمل بعض احادیث، آثارِ صحابہ وتابعین سے ثابت ہے۔

تیسرا مرتبہ بڑھانے کی اتنی مقدار ہے جسے عرف میں بڑھانا کہا جائے، اور داڑھی اتنی بڑی ہو کہ عرف میں اسے بڑی داڑھی کہا جائے۔ اس مرتبے پر حدیثِ مذکورہ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک قبضے سے کچھ کم، جس پر 'داڑھیوں کو بڑھاؤ' کا حکم صادق آتا ہو یعنی داڑھی بھاری

۱- مجموعہ الفتاوی، فتوی ۲۷۲۶۔ مورخہ ۲-۱۲-۱۳۹۹ھ۔

ہو اور بڑھی ہوئی ہو، تو اس پر عمل کرنا بھی جائز شمار ہوگا۔ اور اسے حدیث کے مذکورہ حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں کہا جائے گا، نہ اسے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑنا سمجھا جائے گا۔ یہی بات بعض علماے سلف نے کہی ہے اور عصر حاضر کے بعض علما کی بھی یہی راے ہے۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

وَقَالَ آخَرُوْنَ: يَاْخُذُ مِنْ طُوْلِهَا وَ عَرْضِهَا مَالَمْ يَفْحُشْ اَخْذُهٗ وَلَمْ يَحُدُّوْا فِيْ ذٰلِكَ حَدًّا غَيْرَ اَنَّ مَعْنٰى ذٰلِكَ عِنْدِيْ مَالَمْ يَخْرُجْ مِنْ عُرْفِ النَّاسِ[1] بعض دوسرے علما کے نزدیک طول وعرض سے کاٹنا جائز ہے جب تک بہت زیادہ نہ کاٹ لی جائے۔ انھوں نے کاٹنے کی کوئی حد مقرر نہیں کی لیکن میرے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اتنی کاٹی جائے کہ لوگوں کے عرف کے دائرہ سے نہ نکل جائے۔

مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں یا منڈی ہوئی کے مثل کتراتے ہیں، وہ فاسق کی تعریف میں شامل ہیں۔ لیکن جو لوگ داڑھی رکھے ہوئے ہیں مگر ایک قبضے سے کچھ کم ہے، ان کو فاسق کہنے میں احتیاط کرنی چاہیے، کیونکہ ایک قبضے کی حد قطعی نہیں ہے۔[2]

مزید فرماتے ہیں:

یہ ظاہر ہے وَاعفوا اللحی سے اعفاء یعنی داڑھی بڑھانے کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی یقینی ہے کہ اعفاء سے غیر محدود بڑھانا مراد نہیں ہے، کیونکہ ایک مشت سے زیادہ بالوں کو کتروانا بالاتفاق جائز ہے۔ بلکہ طولِ فاحش کو بعض فقہا نے مکروہ اور خفتِ عقل کی دلیل بھی قرار دیا ہے۔ جب غیر محدود بڑھانا مراد نہیں ہے تو کس قدر بڑھانا لازم ہے، اس کے لیے تحدید صرف ایک قبضے والی روایات سے ہوسکتی ہے لیکن وہ ظنی ہے۔ یعنی اس مرتبے میں نہیں کہ اس کو تحدیدِ اعفاء کے لیے دلیل بنایا جائے۔ کیونکہ وہ فعلی روایتیں ہیں جن کا مفاد یہ ہوسکتا ہے کہ ایک قبضے تک رکھ کر زیادہ کو کٹوانا ثابت ہے، لیکن ایک قبضہ فرض ہے یا مسنون یا مستحب، اس کا فیصلہ ان حدیثوں سے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک قبضے کی حد کو مسنون قرار دیا جائے

۱- البنایة فی شرح الهدایة، ج ۲۲، ص ۴۷

۲- کفایت المفتی، ج ۹، ص ۹۱، طبع ملتان

اور حلق یا قطعِ فاحش کو بوجہٗ مشابہت بالنساء یا مشابہت بالعجم کے مکروہ تحریمی کہا جائے، اور قطعِ یسیر غیر متمیز کو خلافِ سنت یا مکروہِ تنزیہی قرار دیا جائے۔[۱]

علامہ عینیؒ کے بیان کردہ مذاہب میں سے تیسرے مذہب اور حضرت مفتی صاحبؒ کی رائے میں اتنا فرق ہے کہ علامہ عینیؒ کے نقل کردہ تیسرے مسلک میں قطعِ یسیر غیر متمیز یا عرف کی حد تک بڑھی ہوئی داڑھی کو بھی وَاعفوا اللحی کا مصداق یعنی سنت قرار دیا گیا ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ اسے مکروہِ تنزیہی قرار دیتے ہیں۔ لیکن دلیل کے لحاظ سے راجح بات وہ ہے جسے علامہ عینیؒ نے نقل کیا ہے کیونکہ فعل قول کے لیے مخصص نہیں ہوا کرتا اس لیے قبضے والی روایت سے قبضے کی سنیت ثابت ہوتی ہے، لیکن اس سے کم مقدار کی سنیت کی نفی نہیں ہوتی، جب کہ اس پر کما حقہ وَاعفوا اللحی [داڑھیوں کو بڑھانا] صادق آتا ہو۔ لغت کے لحاظ سے اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک قبضے تک بڑھی ہوئی، بڑی داڑھی شمار ہو اور قبضے سے کم بڑھی ہوئی، بڑی داڑھی نہ قرار پائے۔ بلکہ خود مفتی کفایت اللہؒ اپنے ایک فتویٰ میں اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

داڑھی منڈانے والا یا اتنی کتروانے والا کہ جس پر داڑھی بڑھانے کا عرفاً اطلاق نہ ہو گناہ گار ہے کیونکہ وہ امر وَاعفوا اللحی کی خلاف ورزی کرنے والا ہے جو بالاتفاق وجوب کے لیے ہے۔[۲]

رہی یہ بات کہ عصرِ حاضر کے بعض ممالک کے نہایت ہی مخلص مسلمان اور مجاہد شخصیات کی داڑھیاں نہیں تھیں، درآں حالیکہ انھوں نے دین کی بڑی خدمت کی اور اس کے لیے گراں قدر اور قابلِ رشک قربانیاں بھی دیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس علاقے میں کوئی حکمِ شرعی کمزور پڑ جائے اور عامۃ الناس اور خواص تک میں اس کے سلسلے میں کمزوری پیدا ہو جائے، جس کے نتیجے میں اس حکم کی طرف توجہ نہ رہے یا اس کا صحیح علم نہ ہو سکا ہو تو ایسی صورت میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور اس حکم کے تارک پر فسق کا حکم نہیں لگایا جاتا۔ البتہ اگر کسی پر مسئلہ واضح ہو جائے اور اس کے بعد بھی وہ حکمِ شرعی کی خلاف ورزی کرے تو اسے فاسق کہا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ کہ کس شخص نے کس وجہ سے اس حکم کی خلاف ورزی کی، ہر شخص کی مجموعی زندگی اور اسلام کے ساتھ اخلاص اور

۱- کفایت المفتی، ج۹، ص۱۲۴

۲- کفایت المفتی، ج۹، ص۱۶۲

وابستگی کی بنیاد پر ہوگا۔ جن لوگوں نے اقامتِ دین کی خاطر اپنی زندگیوں کو قربان کرلیا اور پھانسی تک کی سزا کو خوشی سے ہنستے ہوئے قبول کیا ان کے بارے میں اسی حسنِ ظن سے کام لیا جائے گا کہ ان پر مسئلہ واضح نہ ہوسکا تھا۔

۳۔ مستقل امام اسی کو مقرر کرنا چاہیے جس کی داڑھی سنت کے مطابق ہو۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

۴۔ حلق کے بالوں کو مونڈا جاسکتا ہے کیونکہ وہ داڑھی کا حصہ نہیں ہیں۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۲ء)

زنانہ مریضوں کی تیمارداری

سوال: میں یہاں زیورچ (سوئٹزرلینڈ) میں ایک ہسپتال میں اسسٹنٹ میل نرس کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ یہاں کا معاشرہ ایک مخلوط معاشرہ ہے۔ اس لیے مجھے مردانہ اور زنانہ دونوں طرح کے مریضوں کی تیمارداری کرنی پڑتی ہے۔ مریض زیادہ تر عمر رسیدہ ہوتے ہیں۔ مجھے بوقتِ ضرورت ان کو نہلانا پڑتا ہے، بغیر کسی قسم کے پردے کے۔ خصوصاً خواتین کے معاملے میں کوئی حجاب روا نہیں رکھا جاتا۔ یہ مریض اپنی عمر کے آخری حصہ میں ہی ادھر لائے جاتے ہیں اور ان کی اموات ادھر ہی واقع ہوتی ہیں۔ یہ لوگ انتہائی کمزوری اور لاغرپن کی حالت میں اس ہسپتال میں لائے جاتے ہیں۔

پردہ اور حجاب کی پابندیاں نہ ہونے پر آیا ایک مرد، زنانہ مریضوں کی تیمارداری کر سکتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کیا یہ ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: آپ نے جس صورت کے بارے میں جیسے حالات میں استفسار کیا ہے اس کے مطابق آپ کو وقتی طور پر متبادل حلال ذریعۂ معاش ملنے تک اس ملازمت کو جاری رکھنے کی شرعاً اجازت ہے۔ آپ کوشش کریں کہ جلد از جلد کوئی دوسری ملازمت آپ کو مل جائے جس میں آپ کو ناجائز اور معیوب کام نہ کرنے پڑتے ہوں۔

اگر اس ملک میں ایسا ممکن نہ ہو تو کوشش کریں کہ دوسرے غیر اسلامی ملک میں، جہاں حلال ذریعۂ روزگار میسر آئے، چلے جائیں اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو کسی اسلامی ملک میں واپس جائیں۔ زنانہ مریضوں کے لیے زنانہ نرسوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ اگرچہ ایسی مریض عورتیں جو انتہائی کمزور اور لاغر ہوں، جنسی جذبات کو ابھارنے کا سبب نہیں بنتیں لیکن کسی مسلمان مرد کے لیے ایسی خواتین کو نہلانا معیوب سروس ہے۔ اس لیے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۹۳ء)

انتقالِ خون میں مرد و عورت کی تمیز

سوال: براہِ راست کسی کتاب سے تو نہیں پڑھا اور نہ کسی مستند عالم سے سنا ہے لیکن ہمارے ہاں عمومی طور یہ بات مشہور ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے کسی عورت کو کسی غیر محرم مرد کا جوٹھا کھانا پینا وغیرہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر انتقالِ خون کے سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں جب کہ یہاں غیر محرم مردوں کا خون عورتوں کو منتقل کیا جاتا ہے بلکہ اس سلسلے میں کوئی ایسا انتظام ہی نہیں کہ بلڈ بنک سے معلوم ہو سکے کہ موجود خون مرد کا ہے یا عورت کا۔ فرمائیں کیا کیا جانا چاہیے؟

جواب: کسی کا جوٹھا استعمال کرنا طبیعت میں دوسرے کی طرف میلان اور جذبات میں خرابی پیدا کر سکتا ہے۔ انتقالِ خون میں ایسا نہیں ہے۔ انتقالِ خون میں تو ایک مریض کے جسم میں ایک دوسرے آدمی کے خون کو بطور دوا داخل کیا جاتا ہے۔ جس میں لذت یا جذبات کے میلان کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ خون تو اضطراری حالت میں منتقل کیا جاتا ہے۔ جوٹھے کھانے کے استعمال کے لیے بھی اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو اس کی بھی اجازت دے دی جائے گی۔ نیز غیر محرم مرد کے جوٹھے کا استعمال اسلامی تہذیب اور آداب کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لیے خلافِ اولیٰ ہے، ناجائز نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۹ء)

اسلام اور وکالت

سوال: دیوانی یا فوجداری مقدمات میں فریقین اجرت پر وکیل مقرر کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک فریق برسرِ حق اور دوسرا برسرِ باطل ہوتا ہے۔ ہر فریق یا موکل اپنے اپنے وکیل کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیتا ہے۔ بعد ازاں وکیل صاحب اپنی مہارتِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے برسرِ باطل موکل کو برسرِ حق ثابت کرنے کی کوشش کر کے اس کو جرم کی سزا سے بچانا چاہتے ہیں۔ باقی ان کے طریقِ کار سے آپ پوری طرح واقف ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا کتاب وسنت کی رو سے ایسی وکالت اور اس کی اجرت لینا حلال ہے؟ کیا یہ تعاون علی الاثم والعدوان کی تعریف میں نہیں آتا اور کیا جماعتِ اسلامی کے وکلا حضرات اس قسم کے تعاون کے مرتکب نہیں ہوتے؟ کیا اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی نے اپنے وکلا پر کوئی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور ان پر عمل ہو رہا ہے؟

جواب: جو کام انسان خود نہیں کر سکتا وہ کام اس کا وکیل بھی نہیں کر سکتا۔ اگر ایک انسان خود عدالت میں جھوٹ بولے تو وہ آخرت میں اپنے جرم کی سزا کے علاوہ جھوٹ بولنے کی سزا بھی پائے گا۔ اگر وہ اپنے مقدمے میں کسی کو وکیل کرتا ہے اور اس کا وکیل جھوٹ بولتا ہے اور اسے سزا سے بچانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ مجرم ہے۔ جماعتِ اسلامی اپنے متفقین، کارکنان اور ارکان بلکہ تمام مسلمانوں کو تلقین کرتی ہے کہ وہ سچ بولیں، اسلام کو اپنے اوپر اور دنیا کے دوسرے لوگوں پر نافذ کریں۔ ایک مومن کی زندگی کا اصل مشن اقامتِ دین ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقصد کے لیے مبعوث ہوئے تھے بلکہ تمام انبیا کی بعثت کا مقصد یہی تھا۔ وکالت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان جو سچی بات خود اچھے انداز میں بیان نہیں کر سکتا دوسرا اسے اچھے انداز میں بیان کر دے۔ نیز یہ کہ جو جرم اس سے سرزد ہوا ہے اس کی قانونی سزا کیا ہے۔ وہ سچ بولے اور عدالت کے سامنے مجرم کی یا اپنے موکل کی شرعی سزا یا شرعی حکم کی نشاندہی کرے۔ انگریزی قانون میں سے

صرف ایسے قانون کا حوالہ دے جو شرعی حکم سے نہ ٹکراتا ہو اور اگر شرعی حکم سے ٹکراتا ہو تو عدالت کے سامنے شرعی قانون بیان کرے اور عدالت سے شرعی قانون نافذ کرنے کا مطالبہ کرے۔ جو وکیل اس سلسلے میں اپنا وقت اور محنت صرف کرے وہ اس پر اجرت لینے کا مستحق ہے۔ اگر ہمارے ملک کے وکلا اس طریقے پر عمل شروع کر دیں تو آج ہی عدالتوں میں اسلام نافذ ہو سکتا ہے اور وہ عدالتوں کو شرعی قوانین کے نفاذ پر مجبور کر سکتے ہیں۔ وکلا کی اسلامی تنظیمیں اس طرز کی وکالت کا آغاز کرنے کا اہتمام کر سکتی ہیں اور وکلا کو اس کی دعوت و ترغیب بھی دے سکتی ہیں۔ اللہ کرے کہ یہ سلسلہ شروع ہو، تاکہ ہم زندگی کے اس شعبے میں اللہ رب العالمین کی بندگی کا حق ادا کر سکیں۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۲ء)

بائبل پڑھنے سے پہلے تسمیہ

سوال: بائبل کے کسی حصے کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے ایک مسلمان کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ اگر پڑھنا جائز ہے تو کیا دل میں پڑھیں یا زبان سے؟

جواب: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر جائز کام سے پہلے جو حقیر نہ ہو، پڑھنے کی ہدایت ہے۔

موجودہ بائبل محرف ہے۔ اس میں کچھ باتیں اصل کتاب میں سے باقی ہیں۔ اس لیے اس کے مطالعہ سے پہلے بسم اللہ زبان اور دل دونوں سے پڑھنا جائز ہے۔ بائبل کی وہ باتیں جو قرآن پاک کے مطابق ہوں گی انھیں اصل کتاب کا حصہ سمجھا جائے گا اور جو اس کے خلاف ہوں گی وہ یہودی اور عیسائی علما کی طرف سے اضافے شمار ہوں گے۔ بسم اللہ پڑھتے وقت یہ نیت کی جائے کہ اللہ مدد فرما کر بائبل کے اصل اور محرف حصوں میں امتیاز کی معرفت عطا فرمائے۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۹۸ء)

اذان سے پہلے صلاۃ وسلام

سوال: مسجد کونسل رابطۂ عالم اسلامی نے اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کو رواج دینے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ بعض بریلوی علما نے اس کی مخالفت کی ہے۔ آپ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ جواب دے کر راہنمائی فرمائیں۔

جواب: یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے بعض علما اس انتظار میں رہتے ہیں کہ انھیں کوئی ایسی چیز ہاتھ آئے جس کو وہ دوسروں کے خلاف نفرت پیدا کرنے اور ان کے خلاف محاذ آرا ہونے کے لیے استعمال کر سکیں اور اسی جذبے کی بنا پر بعض اوقات ایک صحیح اور متفق علیہ چیز کو غلط اور مختلف فیہ بنانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ آج تک کے تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اس سے کسی بھی فریق کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا لیکن ہمارے قابلِ قدر علمائے کرام پھر اسی تجربے کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں اور وہی چیز جو انھیں قریب لانے میں ممد ومعاون ہو سکتی ہے اس کو افتراق وانتشار کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں رابطۂ عالمِ اسلامی کی طرف سے اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام کے بارے میں جو قرارداد آئی ہے اس کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے کسی مسلک پر زد نہیں پڑتی۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے میری دیانتدارانہ رائے ہے کہ علمائے اہل سنت بریلوی کا بھی اصل مسلک یہ ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان تثویب میں کوئی حرج نہیں اور تثویب کے معنی بالاتفاق اَلْاِعْلَامُ بَعْدَ الْاِعْلَامِ کیے گئے ہیں، جس کا مطلب اطلاع کے بعد دوبارہ اطلاع دینا اور اقامت سے پہلے کسی طرح سے نماز باجماعت کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ بعض متاخرین فقہائے احناف نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔ بریلوی علما نے اس کے لیے صلوٰۃ وسلام کے کلمات مقرر کیے ہیں۔ ان کا اصل مسلک تو میرے علم کی حد تک یہی ہے۔ اس مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام نہ پڑھا جائے لیکن عملاً اذان شروع کرنے سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھا جاتا ہے۔ جس کا رواج کسی

دور میں نہ تھا اور نہ ہی بریلوی مسلک کے اکابرین نے اسے آدابِ اذان میں شمار کیا ہے۔ پھر بریلوی مسلک کے نام پر اس چیز کو کیوں رواج دیا جا رہا ہے؟ اس پر خود بریلوی مسلک کے اہلِ علم کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے اور اگر رابطۂ عالمِ اسلامی کی قرارداد سے اس طرف توجہ مبذول کروائی گئی تو اس پر ناراض ہونے کی بجائے شکرگزار ہونا چاہیے۔ ہاں اگر رابطۂ عالمِ اسلامی کی طرف سے صلوٰۃ وسلام کے ان کلمات کو نہ پڑھنے کی سفارش ہوتی جن کو بریلوی مسلک میں اہمیت حاصل ہے تو انھیں اس سے اختلاف کرنے کا حق تھا۔ اگرچہ ایسی صورت میں بھی اس عالمی تنظیم سے، جسے حرمین شریفین کے ساتھ نسبت اور تعلق کا شرف حاصل ہے، احترام کے ساتھ اختلاف کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے دعوائے محبتِ رسول کا تقاضا ہے لیکن مسئلۂ زیرِ بحث میں تو ایسی بات کہی گئی ہے جو متفق علیہ ہے۔

مولانا امجد علی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور ومعروف کتاب بہارِ شریعت میں فرماتے ہیں:

مسئلہ: متاخرین نے تثویب مستحسن رکھی ہے یعنی اذان کے بعد نماز کے لیے دوبارہ اعلان کرنا۔ اور اس کے لیے شرع نے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں کیے بلکہ جو وہاں کا عرف ہو مثلاً: الصلوٰة الصلوٰة (نماز نماز) یا قامت قامت (کھڑی ہوگئی کھڑی ہوگئی) یا الصلوٰة والسلام علیك یا رسول الله[1]

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ زید اقامت سے قبل درود شریف بآوازِ بلند پڑھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اقامت یعنی تکبیر شروع کر دیتا ہے کہ جس سے عوام کو معلوم ہوتا ہے کہ درود شریف اقامت کا جزو ہے اور عمرو، درود شریف نہیں پڑھتا صرف اقامت کہتا ہے تو زید کو اس کا یہ فعل ناپسند آتا ہے اور اصرار سے اس کو پڑھنے کو کہتا ہے۔ اس صورت میں درود شریف جہر سے پڑھنا اور زید کا اصرار کرنا کیسا ہے؟

اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

درود شریف قبل اقامت پڑھنے میں کوئی حرج نہیں مگر اقامت سے قبل چاہیے یا درود شریف کی آواز اقامت سے ایسی جدا ہو کہ امتیاز رہے اور عوام کو درود شریف جزوِ اقامت معلوم نہ ہو۔ رہا زید کا

۱- بہارِ شریعت، حصہ سوم، ص ۳۷۔

عمرو پر اصرار سو وہ اصلاً کوئی وجہ شرعی نہیں رکھتا یہ زید کی زیادتی ہے۔[1]

یعنی اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ درود شریف اقامت سے قبل فاصلہ رکھ کر پڑھے یا اگر متصلاً پہلے پڑھنا ہو تو اس کے پڑھنے کا انداز ایسا ہو کہ لوگ محسوس کریں کہ اقامت ابھی شروع نہیں ہوئی، اقامت اس کے بعد ہوگی۔ گویا آپ نے بھی اس اصول کو بیان کیا کہ درود شریف کو اس طرح نہ پڑھا جائے کہ یہ اقامت کا حصہ معلوم ہو اور پڑھنے کا حکم یہ نہیں بیان کیا کہ یہ اقامت کے آداب میں سے ہے اور مستحب ہے بلکہ حرج کی نفی فرمائی کہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور پڑھنے پر اصرار کرنے والے کی بات کو بے اصل قرار دیا۔ ایک اور سوال کے جواب میں تثویب میں چند اضافوں کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ جن میں بعض درج ذیل ہیں:

۱- نہ پکارنے کو گناہ جاننا۔

۲- نہ پکارنے سے نمازِ جمعہ میں قصور سمجھنا۔

۳- نہ پکارنے والے کو تقلید سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ سے باہر خیال کرنا۔

۴- معاذ اللہ اسے بے ایمان گمان کرنا۔

یہ اعتقاد باطل وضلال ہیں۔ ان کے معتقدین پر توبہ فرضِ قطعی ہے اور ان رسوم وخیالاتِ باطلہ کا ہدم اور اعدام لازم ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ وَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَ تَعَالٰی اعلم[2]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت اس مسئلے کو جس انداز سے اٹھایا گیا ہے۔ کیا وہ اعلیٰ حضرت کے مذکورۂ بالا ارشاد سے مطابقت رکھتا ہے۔ اعلیٰ حضرت 'اصرار کرنے والے' کی بات کو بے اصل 'نہ پکارنے کو گناہ قرار دینے والے' کے نظریے کو بدعت قرار دے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں رابطۂ عالمِ اسلامی کی قرارداد پر اعتراض کو کیسے اعلیٰ حضرت کے مسلک کی نمائندگی قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ اس سے قبل حضرت مولانا مفتی محمد حسین نعیمی ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے

۱- فتاویٰ رضویہ، مسئلہ ۳۴۸، جلد ۲، ص ۳۵۱۔

۲- فتاویٰ رضویہ، مسئلہ ۳۵۰، جلد ۲، ص ۳۵۳۔

فرما چکے ہیں کہ:

اذان کے کلمات مقرر ہیں، اس میں کمی بیشی کرنا یا ان کے آگے پیچھے درود شریف یا قرآنِ کریم کی آیات بلا فصل ملانا بدعت اور عبادتِ الٰہی میں خلل ڈالنے کے مترادف ہے، اذان کے ساتھ اول درود شریف کو لازم قرار دینا اہلِ سنت کا شعار بنانا بھی بدعت اور عبادتِ معہودہ میں تحریف کرنے کی کوشش ہے۔[۱]

کیا اعلیٰ حضرت اور مذکورہ بالا دیگر علمائے کرام کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ اذان سے قبل درود شریف پڑھنے کی ممانعت نہیں؟ انھوں نے اس اصول کہ 'جس چیز کی ممانعت نہ ہو اس کو کر لینے کی اجازت ہے' کی بنیاد پر اذان سے قبل درود و سلام کو بطور تثویب اجازت نہیں دی تب آج اس اصول کی بنیاد پر اذان سے قبل درود و سلام کو کیسے رواج دیا جا سکتا ہے؟

ایک اور پہلو سے میں محترم علمائے بریلوی سے گذارش کروں گا کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں جب کہ اذانیں سپیکروں پر دی جا رہی ہیں، نمازوں کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے مقرر ہیں اور لوگوں کو گھڑیوں کی سہولت حاصل ہے اور اکثریت اذان کی آواز پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتی، اس بات پر بھی غور فرمالیں کہ کیا متاخرین فقہائے احناف نے جن حالات میں تثویب کو مستحسن قرار دیا تھا وہ حالات آج موجود ہیں؟ اگر وہ دیانتداری سے سمجھتے ہوں کہ حالات اسی طرح کے ہیں اور تثویب کی ضرورت ہے تو وہ تثویب کو تثویب کی حیثیت سے رواج دیں۔

مزید برآں میں ان سے یہ بھی عرض کروں گا کہ صلوٰۃ و سلام کو بطورِ تثویب مقرر کرنا، خالص ان کی ذاتی رائے ہے اس پر بھی اس نقطۂ نظر سے غور کر لیں کہ متاخرین نے جس چیز کو تثویب کے طور پر اختیار کیا تھا اس میں یہ شرط لگائی گئی تھی کہ وہ عرفاً اعلام کے لیے ہو لیکن صلوٰۃ و سلام میں اعلام کا کوئی پہلو نہیں ہے اور نہ عرفاً اس کو نماز کی اطلاع سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسے درود و سلام سمجھا جاتا ہے اور اسے صرف تثویب کے طور پر نہیں پڑھا جاتا کہ تخصیصِ استعمال کی وجہ سے تثویب قرار پائے۔

تیسری چیز یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ اس وقت اسے عملاً اذان کے آداب کے طور پر اذان سے

۱- بحوالہ تعلیمات شاہ احمد رضا خان بریلوی، ص ۸۵۔

پہلے متصلاً پڑھا جاتا ہے۔ یہ چیز لازماً آگے چل کر یہ نتیجہ پیدا کرے گی کہ لوگ اذانوں کو مختلف سمجھنے لگیں گے اور کہیں گے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی اذانیں مختلف ہیں۔

چوتھی چیز یہ کہ بعض صحابہ کرامؓ سے تثویب کو بدعت قرار دینے کی تصریح ثابت ہے۔ اور اسی واسطے متاخرین کے استحسان کے باوجود تثویب بمعنیٰ 'مسجد سے دوبارہ اعلان' کو کسی بھی دور میں عمومی رواج نہیں ملا۔ اگر کبھی کسی دور اور کسی علاقے میں تثویب کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم بھی ہو گیا اور صرف ایک تاریخی اور نادر واقعے کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بن گیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مزاج سے اس کی کتنی مطابقت ہے۔

ان وجوہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ رابطۂ عالمِ اسلامی کی مسجد کونسل کی قرارداد قابلِ قدر ہے اور اس میں تمام مسالک کی راہنمائی کا سامان ہے نیز میں اہلِ علم سے گذارش کروں گا کہ وہ اختلافات کو بڑھانے کی بجائے اتفاقی امور پر نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب ہونے کی کوشش کریں کہ اسی میں امتِ مسلمہ اور اس کے ہر طبقے کی بھلائی ہے۔

(ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۸۵ء)

تقریر وتحریر میں قسم اٹھانا

سوال: ایک پوسٹر میں ایک جملہ 'شہداے بدر واُحد اور حضراتِ عمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ وحسینؓ کے لہو کی قسم' استعمال کیا گیا ہے۔ ایک صاحب کے بقول یہ شرک کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی علمی راے کا طالب ہوں۔

جواب: قَسم کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک شرعی اور دوسری لغوی۔ شرعی قسم میں ایک کام کو کرنے کے لیے عزم کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی ایسی ذات کی قسم اٹھائی جاتی ہے جسے نفع ونقصان کا مالک اور دور دنزدیک سے مدد کے لیے پہنچنے پر قادر سمجھا جائے۔ اس عقیدے کے ساتھ تعظیماً قسم اٹھائی جائے اور قسم کا مقصد یہ ہو کہ کام کو لازماً کیا جائے گا کہ اس کام کے کرنے پر عظیم ذات کی قسم اٹھائی گئی ہے، نیز قسم کو توڑنے کا خوف ہو اور یہ سمجھا جائے کہ قسم توڑ دی گئی تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا، اس طرح کی شرعی قسم تو اللہ اور اس کی صفات کے علاوہ کسی دوسری ذات کی نہیں اٹھائی جاسکتی اور اگر کوئی اٹھائے گا تو شرک کا مرتکب ہوگا۔ اسے یمین منعقد کہا جاتا ہے۔ اگر اسی عقیدے کے ساتھ ماضی کے واقعے پر سچی قسم اٹھائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر جھوٹی قسم اٹھائی جائے تو وہ یمینِ غموس کہلاتی ہے اور وہ گناہِ کبیرہ ہے۔

دوسری قسم لغوی ہوتی ہے جس میں مقسم بہٖ کے متعلق وہ عقیدہ نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہوتا ہے۔ اس طرح کی قسم اس لیے نہیں اٹھائی جاتی کہ اسے توڑا نہ جائے گا اور اگر توڑا گیا تو کفارہ دیا جائے گا۔ غیر اللہ کی اس طرح کی قسم شرک نہیں ہے بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ سلم سے یہ قسم ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر وَاَبِیْـــهِ (اس کے باپ کی قسم) کے کلمات استعمال کیے ہیں۔ اس لیے مسئولہ کلمات یا قسم کے لیے اس طرح کے دوسرے کلمات کے بارے میں کوئی حکم لگانے سے پہلے متعلقہ شخص سے پوچھنا چاہیے کہ اس نے یہ قسم کس نیت سے اٹھائی ہے۔ اس سلسلے میں اس کے عقائد وافکار کو بھی دیکھا جائے، اس کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ اس نے

شرک کیا ہے یا نہیں۔ ماضی میں جو کچھ ہو چکا، اس کے بارے میں مذکورہ اصول کو اپنایا جائے اور مستقبل کے بارے میں عمومی ہدایت یہی کی جائے کہ لوگ غیر اللہ کی لغوی قسم سے بھی پرہیز کریں کہ غیر اللہ کی لغوی قسم اس کی شرعی قسم کا بتدریج ذریعہ بن سکتی ہے۔ اگر اس طرح کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری رہا تو پھر لغوی اور شرعی قسم میں فرق اور امتیاز ختم ہو جائے گا۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> سب سے اچھا جواب وہ ہے جو علامہ حلبی نے مطول کے حاشیے میں وَلَعُمْرِیْ (مجھے اپنی عمر کی قسم) کے الفاظ پر اور علامہ شامی نے در مختار کے خطبے پر گفتگو کرتے ہوئے دیا ہے۔ یہ لغوی قسم ہے، شرعی نہیں۔ پہلی یعنی لغوی قسم سے مقصود صرف کلام کی زینت ہوتی ہے، اس کے علاوہ کچھ اور مقصود نہیں ہوتا جب کہ دوسری یعنی شرعی قسم سے تاکید اور جس ذات کی قسم اٹھائی جاتی ہے اس کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔ ممنوع دوسری قسم ہے، پہلی نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قسم اٹھائی ہے وہ پہلی ہے، نہ کہ دوسری۔ پھر بھی میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ سدِ ذریعہ کے طور پر مطلقاً منع کیا جائے تا کہ لوگ اس میں تساہل سے کام نہ لیں۔[۱]

اشتہار میں جو قسم اٹھائی گئی ہے اس سے میرے نزدیک کلام کی تزئین مقصود ہے۔ اس لیے شرک نہیں ہوا، لیکن آئندہ کے لیے ہدایت دی جاتی ہے کہ اس طرح کی قسموں سے بھی پرہیز کیا جائے۔ تقریر و تحریر اور پوسٹرز وغیرہ میں اس قسم کی عبارات استعمال نہ کی جائیں۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۸ء)

۱- فیض الباری، ج۱، ص۱۳۹-۱۴۰۔

وی سی آر اور ڈش انٹینے کا کاروبار

سوال: میں ایک دکان میں بطورِ ملازم کام کرتا ہوں۔ دکان کا کاروبار ٹی وی، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر اور ریڈیو کے پرزوں پر مشتمل ہے۔ بعض مقامی علما اس کاروبار کو جائز نہیں سمجھتے۔ کچھ دوست بھی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ میرے لیے شرعی راستہ کیا ہے؟

جواب: ٹی وی، ریڈیو، وی سی آر، ڈش انٹینا اور ویڈیو وغیرہ جدید زمانے کے ذرائع ہیں۔ یہ جدید آلات ہیں۔ ان سے قرآنِ پاک کی تلاوت اور دیگر اسلامی پروگرام بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس لیے اس شعبے میں کام کرنا برا نہیں۔ اس وقت اقتدار لادینوں کے پاس ہے اور وہ ان آلات کے ذریعے بے حیائی اور فحاشی و عریانی کی ترویج و اشاعت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اس کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ اس لیے کاروبار محض اس وجہ سے حرام نہیں ہوگا کہ یہ آلات فحاشی پھیلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ آپ اگر ان آلات کی مرمت کا کام کرتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جس طرح ایک دکان دار چھری، چاقو اور اسلحہ فروخت کرتا ہے تو یہ جائز کاروبار ہے۔ اگر کوئی شخص چھری، چاقو کو قتل کرنے کے لیے استعمال کرے گا تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا، دکان دار نہیں۔ اس لیے آپ جو کام کر رہے ہیں اسے کر سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

(ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۱ء)

انٹرنیٹ کیفے

سوال: انٹرنیٹ کے استعمال اور انٹرنیٹ کیفے کے کاروبار کے بارے میں اسلام کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ کیا یہ جائز اور حلال ہے؟

جواب: انٹرنیٹ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ اسلام جو عالم گیر دین ہے، سارے عالم تک اس کا پہنچانا، اسے لوگوں کے دلوں میں اتارنا امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے یہ کام آسان ہوگیا ہے۔ انٹرنیٹ کی سب سے زیادہ ضرورت تو اسلام اور امتِ مسلمہ کو ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں، مٹی کے ہر گھر اور چمڑے کے ہر خیمے میں اسلام کے پہنچنے کی جو پیشین گوئیاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں، ان کے پورے ہونے کا ذریعہ انٹرنیٹ سے بہتر اور کون سا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ انٹرنیٹ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور انسانیت کی رہنمائی، ہدایت اور اصلاح کے لیے اس کے ذریعے بہت زیادہ آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ وہ کام جو لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کرنے اور لاکھوں میل سفر کرنے کے بعد ہوسکتا ہے آج گھر بیٹھے تھوڑی سی رقم خرچ کر کے کیا جاسکتا ہے۔ اپنے گھر اور دفتر میں بیٹھے بیٹھے پوری دنیا اور اس کے ہر گھر میں آپ دین کا پیغام اور قرآن وسنت کی بات سنا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اگر دینی تنظیمیں، علمائے کرام، خطبائے کرام اور اسلامی اسکالر اسلام کے پیغام، اس کی حقانیت اور صداقت کو انسانوں تک نہیں پہنچائیں گے، لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو عقلی اور نقلی دلائل سے مسخر نہیں کریں گے، باطل نظاموں اور تہذیبوں کو کھوکھلا ثابت نہیں کریں گے تو پھر وہ عند اللہ ماخوذ ہوں گے۔ آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عالمی سطح پر اسلام اور کفر، دین اور لادینیت، اسلامی اور مغربی تہذیب، اسلام اور مشرکانہ مذاہب، یہودیت، عیسائیت، بدھ مت اور ہندومت وغیرہ کے مابین جو فکری کش مکش ہے، اس میں اسلام کی صداقت اور بالادستی ثابت کی جائے۔ ادیانِ باطلہ پر علمی میدان میں غلبہ حاصل کیا جائے۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ (التوبہ۹:۳۳۔الصّف۶۱:۹) وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اسلامی تحریکات اور علماے کرام کو عالمی سطح پر منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔مختلف موضوعات کو مختلف اداروں اور تنظیموں کے سپرد کیا جائے۔جس طرح فوج اپنی تنظیم کرتی ہے،مختلف یونٹوں کو مختلف مورچوں پر کھڑا کر دیتی ہے،اسی طرح انٹرنیٹ کے ذریعے منظم انداز میں کام کیا جائے،اہداف مقرر کیے جائیں اور انھیں حاصل کریں تو اس کے بعد سیاسی میدان میں بھی فتح حاصل ہو جائے گی۔

انٹرنیٹ کیفے کا کاروبار اسی صورت میں صحیح ہے جب اس بات سے مشروط ہو کہ فحش اور عریاں فلمیں نہیں دکھلائیں گے،اور نہ کسی دوسری بداخلاقی کا ذریعہ بنیں گے۔

(ترجمان القرآن،جولائی ۲۰۰۲ء)

شطرنج کھیلنا

سوال: ہمارے گھر میں کبھی کبھار شطرنج بغیر کسی شرط اور کسی قابل اعتراض بات کے صرف تفریح کے لیے کھیلی جاتی ہے، وہ بھی مخصوص حدود کے اندر، کہ وقت کی بربادی اور ضیاع کا باعث نہ بنے۔ میری نظر سے چند احادیث گزری ہیں جن میں اس کو لغو اور بے ہودہ کھیل فرمایا گیا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ آیا ان احادیث میں شطرنج سے مراد وہی شطرنج ہے جو ہم کھیلتے ہیں؟

جواب: مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ انسان کا مقصدِ وجود اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ انسانی زندگی میں کھیل تماشا اور دیگر تفریحات جو اس مقصد سے دور کرنے والی ہوں، ان سے پرہیز کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسلام مفید کھیلوں پر قدغن نہیں لگاتا۔ اس میں تفریحات کا تصور بھی موجود ہے۔ لیکن ایسی تفریح جو دینی یا دنیاوی طور پر سودمند نہ ہو، محض وقت کا ضیاع ہو یا ایسے کھیل جن میں جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں اجاگر نہ ہوں اور ان سے ذہنی تسکین نہ ملتی ہو، مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ مومنون میں اہلِ ایمان کی ایک اہم صفت یہ بتائی ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (المومنون ۲۳:۳) اہلِ ایمان لغو سے احتراز کرنے والے ہیں۔

مفسرین کے نزدیک لغو سے مراد مالا یعنیہ ہے، یعنی جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ شطرنج اور اس طرح کے دیگر کھیل بھی اسی زمرے میں آتے ہیں پھر اگر ان میں جوا بھی شامل ہو جائے تو یہ حرام اور ناجائز ہو جاتے ہیں اور اس کے بارے میں قرآن و حدیث میں سخت وعید ہے۔ آپ نے شطرنج کی ممانعت میں جو احادیث لکھی ہیں ان سے مراد مروجہ شطرنج اور اس سے ملتے جلتے کھیل ہیں۔ ان میں جوا ہو تو حرام ہیں، اگر جوا نہ ہو تب بھی مکروہ ہیں۔ اس لیے کہ یہ غفلت، عبادت سے دوری اور تضیعِ اوقات کا باعث بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے۔ یہ پہلا اور آخری موقع ہے۔ اس لیے وقت کی قدر و منزلت کا خیال رکھتے ہوئے لغویات سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ ایسے کھیلوں کا عادی نہیں ہونا چاہیے جو غفلت کا موجب ہوں۔

(ترجمان القرآن، مئی ۲۰۰۱ء)

قتل کا جھوٹا الزام

سوال: اگر کوئی شخص کسی بے گناہ پر قتل کا جھوٹا الزام لگائے تو قرآن وحدیث کی رو سے کیا حکم ہے؟

جواب: کسی پر بہتان لگانا گناہِ کبیرہ ہے۔ قتل کے بہتان سے خطرہ ہے کہ مقتول کے ورثا اس شخص کو، جس پر بہتان باندھا گیا ہو، اپنے طور پر قتل کر دیں یا کوئی اور نقصان پہنچائیں۔ اگر عدالت میں جھوٹی گواہی دے کر بہتان باندھا گیا ہو تو خطرہ ہے کہ عدالت اس کے بارے میں قتل کا حکم صادر کر دے۔ ایسی صورت میں بہتان لگانے والے کو تاوان بھی ادا کرنا ہوگا اور آخرت میں اسے اس کے گناہ کی سزا بھی ملے گی۔ قرآن پاک میں کئی جگہ جھوٹوں پر لعنت آئی ہے: لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ (آل عمران ۳:۶۱)

حدیث شریف میں جھوٹی گواہی کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر عدالت میں ثابت ہو جائے کہ فلاں شخص نے بہتان باندھا ہے تو وہ اسے تعزیری سزا دے سکتی ہے، نیز اسے بہتان کے نتیجے میں پہنچنے والے نقصان کا تاوان بھی ادا کرنا ہوگا۔ ہدایہ میں ہے: وَعَلَيْهِمْ ضَمَانُ مَا اَتْلَفُوْهُ بِشَهَادَتِهِمْ۔ انھیں اس نقصان کا تاوان ادا کرنا ہوگا جو جھوٹی گواہی دے کر انھوں نے پہنچایا ہے۔

جس شخص نے بہتان لگایا ہے اسے چاہیے کہ جلد از جلد اپنے جھوٹ کا اعلان کر دے تاکہ اس کے بہتان سے متعلقہ شخص کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچ گیا تو دنیوی طور پر اسے تاوان ادا کرنا ہوگا اور آخرت میں اسے شدید ترین سزا ملنے کا خطرہ ہے۔ اس لیے کہ اس نے ظلم کیا ہے اور حقوق العباد کو نقصان پہنچایا ہے۔ بالفرض جھوٹے بہتان پر نقصان پہنچ گیا تو نقصان پہنچانے والے کے ساتھ یہ بھی مجرم ہوگا اور اللہ کی عدالت سے اپنے کبیرہ گناہ کی سزا پائے گا۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۳ء)

جادو سے قتل

سوال: چار مہینے پہلے میری چھوٹی بہن وفات پا گئی جو دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ کوئی خاص بیماری نہ تھی جس کا میں یہاں ذکر کروں کیونکہ ڈاکٹروں کا یہی کہنا تھا کہ کمزور ہے اوراس کی خوراک کا خیال رکھیں۔ باوجود اچھی خوراک کے وہ دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ وفات سے اڑھائی مہینے پہلے ٹانگوں میں ورم آ گیا جس سے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ ٹانگوں میں شدید درد کی وجہ سے اس نے بہت تکلیف اٹھائی۔ کچھ شواہد اور ڈاکٹروں کی رپورٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ ماننے پر تیار ہوگئے کہ یہ کالا جادو ہوا ہے۔ جو بھی دوا دی جاتی وہ اس سے اور زیادہ بیمار ہوتی۔ پی اے ایف ہسپتال سرگودھا میں معائنہ کروایا لیکن انھیں بھی بیماری کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

اب ہمارے گھر میں سب اس بات کا یقین کررہے ہیں کہ اسے جادو کے ذریعے مروایا گیا ہے۔ ایک محترم پروفیسر صاحب کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو انھوں نے قرآن وسنت کے حوالے سے اسے سچ ثابت کیا اور کہا کہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جادو کے ذریعے قتل کرنے والے کو واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں بتایئے کہ اس چیز پر یقین ہونا چاہیے یا نہیں؟ کیا جادو سے انسان مرسکتا ہے؟ جو جادو کرے یا کروائے اس کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے؟ ہم کیسے پہچان کریں کہ جادو کا عمل ہوا ہے؟ ایسے معاملات کی شرعی اور قانونی حیثیت کیا ہے؟ کیا قانون ایسے معاملے کی گرفت کرتا ہے؟

جواب: جادو ایک حقیقت ہے اوراس کے اثر سے ایک آدمی بیمار اور فوت ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ فلاں شخص جادو سے فوت ہوا ہے اور فلاں نے اس پر جادو کیا ہے، اسی طرح ثابت ہوگا جس طرح قتل ثابت ہوتا ہے۔ یعنی دو عادل گواہ گواہی دیں گے کہ اس نے فلاں آدمی کو فلاں آدمی پر جادو کرتے ہوئے دیکھا یا جادوگر اقرار کرے کہ میں نے جادو کیا اور اس سے یہ شخص قتل ہوا ہے۔

۱- ایسے شخص پر عدالت میں دعویٰ کیا جاتا ہے اور عدالت میں مذکورہ طریقے سے ثابت کیا جاتا ہے۔ جب عدالت مطمئن ہو جائے کہ جادوگر نے جادو کے ذریعے قتل کیا ہے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

۲- امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر جادوگر پکڑا جائے اور اعتراف کرے کہ وہ جادوگر ہے تو اسے عدالت میں اقرار کرنے یا گواہوں سے جادوگر ثابت کر دینے کی صورت میں قتل کرنے کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ جادوگر ایسے شرکیہ اعمال کرتے ہیں جو اسے مرتد بنا دیتے ہیں، اگرچہ اس نے جادو کے ذریعے کسی کو قتل نہ کیا ہو۔ حدیث میں آیا ہے: حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيْفِ جادوگر کی حد یہ ہے کہ اسے تلوار سے قتل کر دیا جائے۔

۳- آپ اپنی بہن کے بارے میں بلاوجہ کسی وہم میں مبتلا نہ ہوں۔ صبر سے کام لیں۔ ہمارے معاشرے میں جادو بہت کم ہے۔ اس لیے کہ جادو میں شیطان کی پوجا پرستش کرنا پڑتی ہے۔ ایک کلمہ گو جو دین کی سمجھ رکھتا ہو جادوگر نہیں ہوسکتا۔ لوگ دکان داری کے طور پر اپنے آپ کو جادوگر ظاہر کرتے ہیں اور کمائی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تعزیری سزا دی جائے گی اور دکان داری سے روکا جائے گا۔ یہ حقیقت میں جادوگر نہیں ہوتے۔ اس لیے ان پر مقدمہ چلا کر جادوگر کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ شاطرانہ چالوں کے ذریعے برائی کو پھیلانے اور ناجائز کمائی کا دھندا کرنے کی سزا دی جائے گی۔[۱]

(ترجمان القرآن، مئی ۲۰۰۱ء)

۱- مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: احکام القرآن للجصاص، معارف القرآن، مفتی محمد شفیعؒ، تفسیر آیتِ سحر، پارہ اوّل۔

دارالکفر اور حدود کا مسئلہ

سوال: روزنامہ جنگ (لندن) ۱۹/اپریل ۱۹۹۷ء میں ایک مضمون 'برطانیہ میں سود کا لین دین اور حرام تجارت کا مسئلہ' شائع ہوا جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ دارالحرب میں مسلمان پر کوئی 'حد' نہیں اور اس کے لیے شراب، لاٹری، سور کے گوشت کی خرید وفروخت جائز ہے۔ اگر دارالحرب میں مسلمان پر کوئی 'حد' نہیں تو شراب پینا، زنا کرنا، چوری کرنا اور قتل کرنا کس قرآنی حکم یا حدیث کے رو سے ناجائز ہیں؟ میں انتہائی ذہنی بے سکونی کا شکار ہوں کیونکہ میں آج تک ذاتی طور پر اسے حرام سمجھتا رہا ہوں اور ایسے تمام لوگوں سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کی ہے جو ایسی تجارت کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس بات سے اجتناب کیا ہے کہ ان کے گھر سے کھانا کھاؤں۔ اگر واقعی اسلام کی رو سے حقیقی طور پر ایسا نہیں ہے تو میں بڑا طویل عرصہ شدید غلطی پر رہا ہوں۔ اس پریشان کن مسئلے میں میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: مذکورہ مضمون نگار کی رائے میں: برطانیہ میں سودی لین دین اور اسی نوع کے دوسرے حرام کام شرعاً جائز ہیں۔ مضمون نگار نے اس کے لیے بعض فقہی کتب کے حوالے بھی پیش کیے ہیں جو دراصل غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ فقہا نے دارالحرب یا دارالکفر اور دارالاسلام کا جو فرق بیان کیا ہے ایک معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو حکومتوں کا معاملہ ہے۔ یعنی ہر حکومت اپنے دائرۂ اختیار میں کام کرے گی۔ دارالاسلام کی حکومت اپنے دائرۂ اختیار میں اسلام نافذ کرنے کی ذمے دار ہے جبکہ دارالکفر یا دارالحرب کی حکومت اپنے زیرِ اقتدار علاقوں میں اپنی مرضی کا قانون جاری کرے گی۔ دارالاسلام کی حکومت، دارالحرب میں مقیم مسلمانوں کے تجارتی معاملات کی، سودی ہوں یا غیر سودی، صحیح ہوں یا فاسد و باطل، ذمے دار نہ ہوگی جس طرح وہ ان کی نمازوں، روزوں اور دیگر عبادات کی ذمے دار نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی مسلمانوں پر دارالحرب میں کوئی پابندیاں عائد نہیں ہیں۔ دارالحرب کا

مسلمان پورے کے پورے اسلام کا پابند ہے جس طرح کہ دارالاسلام کا مسلمان، اور اسی لیے حکم ہے کہ اگر ایک مسلمان دارالحرب میں اسلام پر عمل نہیں کرسکتا تو وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کرے۔ اسلامی احکام کے پابند ہونے کی بنیاد تو کلمۂ طیبہ ہے۔ جب ایک انسان اس کلمے کا اقرار کرلیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو قبول کرلیتا ہے۔ مسلمانوں کا ایک عام بچہ بھی جانتا ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو قبول کرنے کا نام ہے، ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل ہر بچے کو یاد ہوتا ہے۔

مسلمان کا کام یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے اور حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اسلام اور مسلمان تو کفر کے اقتدار کو تسلیم ہی نہیں کرتا، وہ دارالحرب یا دارالکفر کے لیے اسلام کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ وہ دارالکفر اور دارالحرب کو چھوڑ دے۔ اگر وہ شعوری مسلمان ہے تو پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اسلام پر عمل کرنے کو چھوڑ دے اور دارالکفر کو اسلام پر ترجیح دے۔ یہ نظریہ تو حکومتِ الٰہیہ اور اسلامی اقتدار کے نظریے سے متصادم ہے اور یہ وہی لوگ پیش کرتے ہیں جن کے نزدیک اسلامی اقتدار یا حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا ایک دینی اور اسلامی فریضہ نہیں ہے۔ اس کی بجائے وہ مسلم قومیت کی حکومت کو کافی سمجھتے ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ جہاد کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی حالت پر انتہائی افسوس ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے دارالحرب میں اسلام کو ضروری نہیں سمجھتے در آں حالیکہ قرآن وسنت، کفار کے لیے بھی اسلام کو ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام کی رو سے کفار جہاں اس بات کے مکلّف ہیں کہ وہ اسلام لائیں وہیں اس بات کے بھی پابند ہیں کہ شریعت پر عمل کریں۔ ان کی عبادات تو بغیرِ ایمان کے معتبر نہیں لیکن اگر وہ شریعت کے باقی شعبوں، معاشیات، عقوبات، سیاسیات اور معاشرت وغیرہ پر عمل کریں تو ان کے یہ اعمال معتبر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (البقرہ۲:۲۱) اے دنیا بھر کے انسانو! اپنے رب کی اطاعت کرو۔

اصولِ فقہ کی کتب میں باقاعدہ یہ ضابطہ لکھا ہوا ہے کہ کفار مخاطب 'بالفروع' ہیں۔ فروعِ شریعت سے مراد عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر تمام احکامِ شرعیہ ہیں۔ کفار سے قیامت

کے روز اس بات کا الگ حساب ہوگا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لائے اور اس بات پر الگ سے باز پرس ہوگی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین پر کیوں عمل نہ کیا؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز جب کافروں سے سوال ہوگا کہ انھیں دوزخ میں کون سی چیز لے گئی تو وہ جواب میں کہیں گے: لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ. وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ. وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ. حَتّٰى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ (المدثر ۷۴:۴۳-۴۷) ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے اور روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آ گیا۔

اسی اصول کی رو سے کفار دوہرے مجرم ہیں۔ کفر کا ارتکاب کرنے کے اور اللہ تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ کر خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے کے۔

تعجب ہے مضمون نگار اور اسی قسم کے لوگوں پر کہ وہ کفار کو اسلام کو چھوڑ دینے، سود، جوا، فحاشی، عریانی اور حدود اللہ کو توڑنے پر ملامت کرنے کی بجائے مسلمانوں کو ملامت کر رہے ہیں کہ وہ دارالحرب میں اسلام پر عمل پیرا ہونے پر کیوں اصرار کرتے ہیں؟ ان حضرات کے نظریے کو مانا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کفار شریعت کے پابند نہیں ہیں تو ان کے خلاف جہاد کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا جہاد انھیں بزور مسلمان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے؟ جواب نفی میں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی کفار کو بزور کلمہ نہیں پڑھایا اور انھیں تلواروں کے زور سے مسلمان نہیں کیا تو پھر جہاد کس لیے ہے؟ جواب یہ ہے کہ جہاد کافرانہ نظام کو ختم کر کے اسلامی نظام اور کفار کی حکومت ختم کر کے اسلام کی حکومت قائم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کفار کو کافر رہنے کا حق ہے لیکن انھیں کافرانہ نظام کو قائم رکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب کافرانہ نظام کے لیے اقتدار جائز نہیں تو اس نظام کے علم برداروں کے لیے بھی اقتدار جائز نہیں ہوگا۔ پس اقتدار اسلام اور اسلامی نظام کے لیے اور اس کے علم بردار اہلِ ایمان

اوراہلِ اسلام کے لیے ہے۔اب سود کے مسئلے کو لیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اور پھر حجۃ الوداع کے موقع پراعلان کیا تھا کہ رِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ تَحْتَ قَدَمَيَّ وَ اَوَّلُ رِبًا اَضَعُهَا رِبَا الْعَبَّاسِ (ابو داؤد، کتاب المناسک باختلاف الفاظ) جاہلیت کا سود میرے قدموں کے نیچے ہے اور سب سے پہلے جس سود کو میں ختم کرتا ہوں وہ عباس کا سود ہے۔

یہ وہ سود تھا جو سود کا حکم نازل ہونے سے پہلے جاہلیت میں لیا گیا تھا لیکن اس کی وصولی نہ ہوئی تھی۔سود کی حرمت نازل ہونے کے بعد تمام سودی کاروبار یکسر ختم ہو گیا اور کسی مسلمان نے کوئی سودی کاروبار نہیں کیا۔ پہلے کا جو سودی کاروبار تھا اس کے بارے میں قرآن پاک کا یہ حکم آ گیا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (البقرہ ۲:۲۷۹) ایمان والو! اللہ کی نافرمانی سے بچو اور چھوڑ دو باقی ماندہ سود کو اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

ان آیات سے جاہلیت میں طے کیے گئے سودی منافعے، جو دراصل دارالحرب والوں کے ساتھ طے کیے گئے منافعے تھے، حرام قرار دے دیے گئے، ان کا لین دین ممنوع کر دیا گیا اور عملاً بھی ایسا ہی ہوا۔کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے اس آیت کے بعد سودی منافع لیا ہو۔اس کے بعد کسی کے لیے اس بات کی کیا گنجایش رہ جاتی ہے کہ وہ دارالحرب میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے لیے سودی لین دین جائز قرار دے۔ان آیات میں اسی دارالحرب کے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لیے کفار کے ساتھ طے کیے گئے سودی منافعے لینے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ گویا دارالحرب کے کفار کے ساتھ مسلمانوں کا سودی لین دین ان نصوص کی رو سے حرام ہے۔اس کے بعد جو بھی برطانیہ کے مسلمانوں کے لیے سودی لین دین کو جائز قرار دے وہ ان آیاتِ صریحہ، قطعیہ کی مخالفت کرے گا اور نص کے خلاف اپنی رائے کو اپنا دستورالعمل بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شریعت کو سمجھنے اور اسے اپنانے کی توفیق سے نوازے۔ آمین

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۷ء)

شعائرِ اسلام اور غیر مسلم

سوال ا-شعائرِ اسلامی سے کیا مراد ہے اور وہ کون کون سے ہیں؟

۲- کیا کلمہ طیبہ، اذان، کلمۂ دعائیہ السلام علیکم ورحمة الله، نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّي عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ اور ان شاء اللّٰہ بھی شعائرِ اسلامی میں شامل ہیں؟

۳- کیا متذکرہ کلمات کا حقِ استعمال صرف مسلمانوں کو ہے؟ اگر کوئی غیر مسلم مثلاً ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، قادیانی ان کلمات اور علامات کو اپنا لے اور اپنے در و دیوار پر تحریر کرے، اپنی گفتگو میں استعمال کرے یا اپنی تحریر میں ہماری طرح شامل کرے تو بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ یہ ان کلمات اور شعائرِ اسلام کی توہین ہے۔ جب کہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ غیر مسلموں کا ان کلمات کو اپنی گفتگو یا تحریر میں اپنانا اسلام اور شعائرِ اسلام کی عظمت کی دلیل ہے۔

براہ کرم ارشاد فرمائیں کہ دونوں میں سے کون سی رائے احکامِ شرع کے مطابق ہے؟

۴- کیا یہ درست نہیں کہ حضور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عیسائی وفد کو مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں اپنی مذہبی عبادت کرنے کی اجازت عطا فرمائی تھی؟ پھر آج غیر مسلموں کو ہماری مساجد میں اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے سے اور بالخصوص قادیانیوں کو نہ صرف مسلمانوں کی مساجد میں بلکہ ان کی اپنی عبادت گاہوں میں بھی نماز کیوں پڑھنے نہیں دی جاتی۔ اس ممانعت کے لیے قرآن وسنت اور فقہِ اسلامی میں کیا دلیل ہے؟

جواب: آپ نے جس مسئلے کے بارے میں سوالات کیے ہیں اس کے بارے میں تو عدالت کے فیصلے ہو چکے ہیں۔ مرتدین اور ملحدین کو دھوکہ دہی سے روکنا ضروری ہے اور یہ ایک معقول بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ

الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (التوبہ۹:۲۸)مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ چلنے پائیں۔

دراصل یہ ایک درمیان والی صورت ہے، ورنہ قادیانیوں کا اصل حکم تو قتل ہے جو مرتد یا زندیق کی سزا ہے۔ اب سزا دینا تو مشکل ہے اس لیے ان کو اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ نہ کریں اور ایسے شعائر کا استعمال نہ کریں جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیل کی ضرورت ہو تو عدالتی بیانات اور فیصلے منگوا کر مطالعہ کرلیں۔ عالمی مجلسِ تحفظِ ختم نبوت ملتان آپ کو یہ فیصلے فراہم کردے گی۔ عیسائیوں کو اب بھی اپنے مذہب کے مطابق عبادات کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح تمام غیر مسلم جو مسلمان ہونے کے مدعی نہیں ہیں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرسکتے ہیں اور کبھی ضرورت پڑے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کو پیش نظر رکھ کر مزید گنجایش بھی دی جاسکتی ہے۔ لیکن قادیانیت تو الحاد، زندقہ اور ارتداد ہے۔ انھیں مسلمانوں کو شکوک وشبہات میں ڈالنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۳ء)

غیر مسلم ممالک سے ہجرت

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ میں کئی سالوں سے یہاں امریکہ میں مقیم ہوں۔ حال ہی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر پڑھ رہا تھا۔ اس تفسیر میں سورۃ النساء کے رکوع نمبر۱۲ اور ۱۴ میں یہ بات مجھ پر آشکارا ہوئی کہ ایک مسلمان کا ایک غیر اسلامی ملک میں رہنا حرام ہے۔ پھر سورۂ انفال کے آخری رکوع میں بھی یہ بات واضح ہے کہ جب اسلامی مملکت موجود ہو تو ایک مسلمان کا غیر اسلامی ملک میں رہنا حرام ہے، جہاں پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے قانون کی خلاف ورزی کی جاتی ہو۔ اس بارے میں مولانا نے بھی اپنی تفسیر میں کافی کچھ لکھا ہے، لیکن ذہن میں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر اتنے مسلمان غیر اسلامی ملکوں میں کیوں رہ رہے ہیں۔ ان مسلمانوں میں بڑے بڑے علماے کرام بھی شامل ہیں۔ پھر مولانا مرحوم کے صاحبزادے بھی امریکہ میں مقیم رہے ہیں۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس مسئلے کی اہمیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میرے اس خط کا جواب جلد دیں گے تاکہ مجھے فیصلہ کرنے میں مزید تاخیر کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جواب: کسی غیر اسلامی ملک میں وقتی طور پر کاروبار یا ملازمت کے لیے یا دعوت و تبلیغ کے لیے رہنا جائز ہے بشرطیکہ وہ اپنی وابستگی اہلِ اسلام اور اسلامی ملک کے ساتھ ہی رکھے اور مستقل شہریت بھی اسلامی ملک ہی کی رکھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت اسلامی ممالک میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہے جس کی وجہ سے کہا جا سکے کہ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت ضروری ہے۔

آگے چل کر اگر حالات نے تقاضا کیا کہ کافر ممالک میں پھیلے ہوئے مسلمان دارالاسلام کی طرف ہجرت کر کے آجائیں اور دنیاے کفر کا یکجا ہو کر مقابلہ کریں تو ایسے حالات میں دوبارہ ہجرت فرض ہو جائے گی۔ لیکن فی الحال ہجرت فرض نہیں ہے یعنی دارالکفر سے دارالمسلمین کی طرف ہجرت فرض نہیں ہے البتہ کفر و شرک اور معصیت سے اسلام اور نیکی و تقویٰ کی طرف ہجرت تو بہرحال فرض ہے۔

ہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر دارالکفر میں ایک انسان اپنے اور اپنے اہل و عیال کے ایمان کو نہ بچا سکتا ہو تو پھر دارالکفر میں اقامت اختیار کرنے کا خطرہ مول نہ لے۔

واضح رہے کہ دارالکفر میں صحیح شعور رکھنے والے مسلمان کے لیے قیام کی بنیادی وجہ جواز صرف دعوت و اصلاح کے لیے کوشش اور جدوجہد ہوتی ہے۔ اس جدوجہد اور دعوت کے جب تک دروازے بالکل بند اور اصلاح قطعاً ناممکن نہ ہو جائے نیز کوئی ایسا حقیقی مرکزِ اسلام وجود میں نہ آجائے، جہاں سے جہاد کے لیے اٹھنے والی نمائندہ تحریک دنیا کے ہر مسلمان کو پکارے، اس وقت تک غیر مسلم ممالک میں کام کیا جا سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۸۶ء)

فرقوں کی حیثیت

سوال: ایک نومسلم کا سوال ہے کہ مسلمانوں میں مالکی، حنفی، شافعی اور اسی طرح شیعہ، سنی وغیرہ فرقے کیوں ہیں؟ کیا اسلام کئی طرح کا ہے؟ اگر ایک جیسا ہے، تو یہ فرقے کب، کیسے اور کیوں بنے؟ کیا یہ اسلام کے زمانۂ اول میں بنے یا بعد میں؟ ان میں صحیح راستے پر کون ہے؟

جواب: اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے جو قرآن وسنت، اجماع اور تعاملِ امت کی شکل میں مکمل طور پر محفوظ ہے۔ اسلام دشمنوں نے اسلام کو مٹانے، اس میں تحریف کرنے اور اسلام کے نام پر ایک امت کے مقابلے میں امتیں کھڑی کرنے کی کوششیں کیں، جیسے قادیانی وغیرہ لیکن ناکام ہوئے۔ امتِ مسلمہ کو دھوکا نہ دیا جا سکا اس لیے کہ قرآن وسنت میں مومن و کافر کے درمیان فرق الحمد للہ پوری طرح واضح ہے۔ اس وقت اسلام پوری طرح محفوظ ہے اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی عظیم الشان امتِ مسلمہ بھی اسی اسلام پر قائم ہے جو قرآن وسنت، اجماع اور تعاملِ امت کی شکل میں ثابت ہے۔

دنیا کے مختلف مذاہب میں سے ہر مذہب بہت سے فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان کے پاس ان کا اصل دین اور اصل کتابیں محفوظ نہیں ہیں۔ وہ برائے نام اپنے مذہب سے وابستہ ہیں اور باہم متصادم ہیں۔ چند باطل عقائد اور بے جان مذہبی رسوم کے علاوہ ان کے پاس نظام نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام عقیدے، عبادت، معاشرت، معیشت، سیاست، تمدن اور نظامِ زندگی کی حیثیت سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اسلام کے ماننے والوں میں مختلف ناموں سے جو مسلک اور گروہ ہیں ان کا آپس میں اختلاف برائے نام ہے اور چند عقائد وعبادات کی تعبیر اور طریقوں میں اختلاف تک محدود ہے۔ وہ بھی ایسا نہیں ہے کہ انھیں باہم متصادم کر دے۔ ان کے درمیان نظامِ زندگی کے سلسلے میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالک کا اختلاف علمی اور فروعی ہے۔ یہ چاروں امتِ مسلمہ کے مجتہدین اور رہنما ہیں اور تمام کے تمام سب

مسالک والوں کے نزدیک محترم ہیں۔ان کے اختلافات حق و باطل کے اختلافات نہیں ہیں بلکہ اولیٰ یا غیرِ اولیٰ اور راجح اور مرجوح کے اختلافات ہیں۔یہ اجتہاد اور فہمِ دین کا اختلاف ہے۔خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ اختلافات رونما ہوئے اور آپؐ نے ان کو جائز قرار دیا۔

تفسیر، حدیث اور فقہ میں ان اختلافات کو علمی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔تمام فقہا کی آرا اور ان کے دلائل کا ذکر کیا جاتا ہے اور کسی کے خلاف طعن و تشنیع اور گالم گلوچ کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔اس وقت دنیا میں مسلمانوں کے بڑے طبقے دو ہیں۔۱-سنی۔۲-شیعہ

سنیوں میں دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث تین گروہ ہیں جو قرآن وسنت اور شریعت کے نفاذ پر متفق ہیں۔ان میں نظام کی تفصیلات کے بارے میں بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں ہے۔کسی کے نزدیک اس کی فقہی آرا دوسروں پر لازم نہیں ہیں۔ریاست پاکستان کا ایک آئین ہے،جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔اس آئین میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت، مسلم کی تعریف، مسئلۂ ختم نبوت، اسلامی نظام کا نفاذ،شریعت کے معیار پر پورا اترنے والی اسلامی حکومت کا قیام شامل ہیں اور ان مسائل میں شیعہ مکتبِ فکر اہلِ سنت والجماعت کے ساتھ متفق ہے۔شیعہ حضرات کا اہل سنت والجماعت کے ساتھ بعض عقائد میں اختلاف کے باوجود اسلامی نظام اور شریعت کے نفاذ پر اتفاق ہے۔۳۱ علما کے ۲۲ نکات، ملی یکجہتی کونسل کے ۷ انکاتی ضابطۂ اخلاق وغیرہ پر سب متفق ہیں۔سابقہ دورِ حکومت میں حکومتِ پاکستان کی قائم کردہ اتحاد بین المسلمین کمیٹی اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر سب کا اتفاق ہے۔اختلاف کا تعلق صرف شخصی اور مسلکی معاملات سے ہے، اجتماعی نظام پر سب متفق ہیں۔

آپ اپنے دوست کو یہ کہہ کر مطمئن کریں کہ دنیا میں پھیلی ہوئی امتِ مسلمہ اور اس کے مختلف حصے چند مسائل میں اختلاف کے باوجود نظامِ زندگی کے معاملے میں پوری طرح متحد ہیں۔پاکستان میں حکومتی سطح پر اسلامی نظریاتی کونسل میں تمام مکاتبِ فکر موجود ہیں اور ان کی سفارشات متفقہ ہیں۔اس لیے آپ چند مسائل میں عارضی اختلافات کو حقیقی اور بنیادی اختلافات نہ

سمجھیں۔ امتِ مسلمہ کے مسالک میں اختلافات کی نوعیت معمولی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی فقہی آرا کو باطل قرار نہیں دیتا بلکہ سب اپنی فقہی آرا کو راجح اور دوسرے فقہی آرا کو مرجوح قرار دیتے ہیں۔ سب کی بنیاد قرآن وسنت، اجماع اور تعاملِ امت ہے۔ امتِ مسلمہ اس وقت بھی اسی طرح واضح راستے پر ہے جس طرح اس وقت تھی، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے واضح راستے پر چھوڑ گئے تھے۔ آپ نے فرمایا: تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْمَحَجَّةِ الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا[1] میں تمھیں واضح راستے پر چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کی رات اس کے دن کی طرح ہے۔

آج اگر کوئی باطل گروہ اسلام میں کوئی رخنہ ڈالنا چاہے تو کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پوری دنیا میں علما موجود ہیں جو قرآن کو اچھی طرح جانتے ہیں اور حق و باطل میں پوری طرح تمیز کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ چند سطریں آپ کے دوست کے استفسار کا کافی جواب ہوں گی۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۲۰۰۱ء)

۱- ابن ماجہ، مقدمہ، باب نمبر ۱، باختلافِ الفاظ۔

تحقیقِ دلائل، تقلیدِ ائمہ اور عام آدمی

سوال: دیوبندی حضرات کہتے ہیں کہ کسی ایک امام کی پیروی لازمی ہے، خواہ کوئی سا امام ہو۔ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ۔ اور اگر ایک معاملے میں کسی ایک امام کی اور کسی دوسرے معاملے میں کسی دوسرے کی پیروی کی جائے تو یہ غلط ہے۔

جماعت کا لٹریچر پڑھ کر میں یہ موقف صحیح سمجھا ہوں کہ کسی ایک امام کی پیروی لازمی نہیں۔ اگر ایک امام کو مخصوص کر کے انھی کے پیروی کریں گے اور اندھی تقلید کریں گے تو یہ صحیح نہیں اور تبلیغی جماعت والے تو کہتے ہیں کہ مذہب میں عقل کو دخل ہی نہیں۔

میرا موقف یہ ہے کہ اندھی پیروی سے تو بات اَرۡبَابٌ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ والی ہوگی۔ ان امور کی وضاحت فرما کر ممنون فرمادیں۔

جواب: آپ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ کسی ایک امام کی تقلید کی قسم کھا بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ جو شخص کتاب وسنت اور فقہا کی تحقیقی آرا کا گہرا علم رکھتا ہے اسے تو عملاً اس سے سابقہ پیش آسکتا ہے، بلکہ آتا ہے کہ وہ مختلف آرا میں سے کسی ایک اور سلف سے رائے نہ ملنے کی صورت میں اپنی تحقیق پر عمل پیرا ہو، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کے اہلِ علم کا دائرہ محدود ہے۔ عام آدمی کو تو کسی ایسے صاحبِ علم کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کے علم پر اسے اعتماد ہو اور یہ بات آپ جانتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے بہت بڑے حصے کو اپنے اپنے علاقے کے ائمہؒ اربعہ پر اپنے دور میں اعتماد ہو گیا اور یہ اعتماد اب تک قائم ہے۔ اس دور میں جو شخص حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی عالم کی طرف رجوع کرتا ہے، وہ دراصل ائمہؒ اربعہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان ائمہ پر اعتماد ان کے علم اور تقویٰ کے زور پر قائم ہوا ہے اور قائم ہے۔ اسے آپ تقلید کا نام دیں یا کچھ اور، یہ شریعت کے مطابق ہے۔ امام غزالی نے المستصفیٰ میں اسے 'استفتا' کا نام دیا ہے اور اس طریقے پر صحابہؓ کرام کا اجماع نقل کیا ہے۔ صحابہ میں سے جو زیادہ علم نہیں رکھتے تھے۔ وہ

اہلِ علم صحابہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور ان سے جواب لینے کے بعد دلائل کا مطالبہ نہیں کرتے تھے۔ آج بھی ہر مسلک کے امام (مسلکِ اہلِ حدیث سمیت) اہلِ علم کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جسے جس کے علم پر اعتماد ہوتا ہے وہ ہر مسئلے میں اس سے جواب کے ساتھ دلائل کا مطالبہ نہیں کرتا[1] اور نہ ہی ہر شخص یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ دلائل کے حسن و قبح کو سمجھ سکے۔ اس لیے تحریکِ اسلامی کا لٹریچر جہاں ایک طرف اس جمود کو توڑتا ہے کہ کسی ایک امام کی ہر بات کو قبول کرنا ضروری ہے وہیں وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ جس کسی کو کسی عالم یا امام یا استاد کے تبحرِ علمی پر زیادہ اعتماد ہو وہ اس کی رائے پر عمل کرے، بشرطیکہ اس مسئلے میں اس کی اپنی کوئی علمی تحقیق نہ ہو یا وہ تحقیق کا اہل نہ ہو۔ اس باب میں اصل بات اس سے زیادہ نہیں ہے لیکن یہ بات افسوس ناک ہے کہ طرفین نے غلو کا راستہ اختیار کر کے بلا وجہ محاذ آرائی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ اہلِ حدیث علما سے یہ کہا جائے کہ اپنی تحقیق پر عمل کریں، اس کی اشاعت و تبلیغ کریں اور جو لوگ ان کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوں وہ ان کی تحقیق پر عمل کریں۔ ائمہ کی جس بات سے انھیں اختلاف ہو اسے بیان کریں اور اس کے خلاف دلائل دیں اور اس پر عمل نہ کریں لیکن عمومی فتویٰ بازی سے پرہیز کریں اور یہ نہ کہیں کہ ان کے سوا باقی لوگ کتاب و سنت کی بجائے ائمہ کے پیرو ہیں۔ درآں حالیکہ اہلِ حدیث اور مقلدین دونوں کا مقصد کتاب و سنت کی پیروی ہے اور اس لحاظ سے دونوں میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق اس سے آگے اس اصول پر عملاً پورا اترنے میں ہو سکتا ہے اور اس باب میں بھی اہلِ حدیث کو یہ حق ہے کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ

۱- امام یا عالم کے اعتماد کا اس بحث میں مطلب یہی ہے کہ وہ معروف حیثیت سے مسائل حقیقی کو نص پر مبنی کرتا ہو اور استدلال سے کام لیتا ہو۔ اس پر اس کی کتابیں، اس کے شاگرد، اس کے مواعظ اور اس کے درس گواہ ہوں۔ ایسے اعتماد کے بغیر نہ دین کا کام چل سکتا ہے اور نہ دنیا کے بہت سے امور انجام پا سکتے ہیں۔ اگر ہر شخص ایک ایک معاملے میں جس کسی سے بات کرے اس سے دلائل طلب کرتا رہے تو ایسی صورت میں جو مشکل پیش آئے گی اسے تو الگ رکھیے، سوال یہ ہے کہ کیا ہر شخص میں دلائل پوچھنے، سمجھنے، ان کا تجزیہ کرنے، ان پر تنقید یا ان کی تردید کرنے کا ملکہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہر شخص لغت، گرامر، فنِ تفسیر، فنِ حدیث، اسماء الرجال وغیرہ کا عالم ہو سکتا ہے۔ قابلِ عمل معروف طریقوں کو چھوڑ کر محض حجت کھڑی کرنے سے تو بات نہیں بنتی۔ لاکھوں، کروڑوں دیہاتی اور ان پڑھ اور کم خواندہ لوگوں کے لیے عملی راستہ بتائیں۔ (نعیم صدیقی)

وہ قرآن وحدیث پر عملاً پورا اترتے ہیں اور حنفیوں اور شافعیوں کو بھی حق ہے کہ وہ اس کا دعویٰ کریں۔اور اس طرح اپنی اپنی راہ کو صواب سمجھتے ہوئے اس پر گامزن ہوں۔اس طرح یہ اختلاف فروعی اختلاف قرار پاتا ہے اور میری رائے میں یہی اس کی حقیقت ہے۔اسے اس سے زیادہ حیثیت دینا غلو فی الدین ہے۔آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ائمۂ اربعہ رحمہم اللہ کے حلقہ ہائے اثر فطری طور پر قائم ہوئے ہیں جس علاقے میں انھوں نے علمی اور دینی خدمات سرانجام دیں اس علاقے کے لوگ ان کے تجرِ علمی،تقویٰ اور ورع سے متاثر ہوئے اور اس طرح ان کی فقہیں ان علاقوں میں رائج ہو گئیں۔اس لیے جو شخص جس امام کے حلقۂ اثر میں ہے اور اس کا ضمیر اس پر مطمئن ہے۔اس کے لیے خواہشِ نفس اور ذاتی مفادات کی بنا پر اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ وہ اس کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے امام کی رائے پر عمل کرے۔لیکن اہلِ علم دینی اور اجتماعی مصالح اور دلائل کی قوت کی وجہ سے دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دے سکتے ہیں۔جیسے کہ لاپتہ ہو جانے والے شخص کی بیوی کے لیے مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے علما سے مشاورت کے بعد فقہ حنفی کی بجائے فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ جاری کیا اور اب تمام حنفی علما اس مسئلے میں فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

۲۔تبلیغی جماعت والے ہی نہیں،دوسری دینی جماعتیں بھی یہ نظریہ رکھتی ہیں کہ دین کی بنیاد وحی پر ہے اور دین کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کا ادراک عقل کر ہی نہیں سکتی مثلاً نماز کی رکعتوں کی تعداد،اموالِ زکوٰۃ،ان کا نصاب اور ادائیگی کی مقادیر،حج کے لیے میدانِ عرفات میں مقررہ تاریخ پر وقوف کرنا وغیرہ۔

اور بعض چیزیں ایک درجے میں عقلی ہیں جیسے توحید،سچ بولنا،جھوٹ سے پرہیز کرنا،ظلم نہ کرنا وغیرہ لیکن ان کی تفصیلات اور ان کا صحیح اور کامل علم وحی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن،مئی ۱۹۸۶ء)

کون سا فقہی مسلک

سوال: ۱- قرآن وسنت کی روشنی میں فقہ کا مقام، مرتبہ اور اہمیت کیا ہے؟

۲- جماعتِ اسلامی کا فقہی مسلک کون سا ہے؟

۳- آپ عموماً کون سے فتاویٰ سے استفادہ کرتے ہیں؟

۴- اردو دان آدمی جو ترجموں کی مدد سے قرآن وسنت کو سمجھتا ہے، کیا وہ فقہ سے بے نیاز ہو سکتا ہے؟ یعنی خود ہر معاملے میں براہِ راست قرآن وسنت سے استفادہ کر سکتا ہے؟

۵- فقہ سمجھنے کے لیے آپ مجھے کون سا مفصل فتاویٰ (عربی) پڑھنے کا مشورہ دیں گے؟

جواب: فقہ کتاب وسنت کے گہرے اور وسیع علم کا نام ہے۔ اسی سے آپ فقہ کی اہمیت کا اندازہ کر لیں اور یہیں سے آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ فقہا میں زیادہ اختلافات اس وجہ سے پائے جاتے ہیں کہ قرآن وسنت کے گہرے اور وسیع سمندر میں جب علمی جواہر تلاش کرنے کے لیے غواص غواصی کرتے ہیں تو ہر ایک کی رسائی اپنی استطاعت کے مطابق ہوتی ہے۔ غواص اس سمندر کی تہہ میں ایک ہی مقام تک پہنچنے کی بجائے مختلف مقامات پر پہنچتے ہیں اور مختلف جواہر تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اہلِ سنت والجماعت کے تمام فقہا اور ان کی سب فقہیں قابلِ احترام اور قابلِ استفادہ ہیں، لیکن جماعتِ اسلامی من حیث الجماعت کسی ایک فقہ کی علمبردار نہیں ہے اس لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر اسلامی نظام قائم کرنا چاہتی ہے اور اسلامی نظام کسی ایک فقہ میں محدود نہیں ہے۔ البتہ جماعتِ اسلامی میں ایسے علما کی تعداد بھی خاصی ہے جو فقہ حنفی پر عامل ہیں اور وہ فقہ حنفی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ فقہ سے تو کوئی بھی بے نیاز نہیں ہے، عام آدمی اور نہ خاص، تمام لوگ اس کے محتاج ہیں۔

حنفی فقہ کو سمجھنے کے لیے آپ مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کی علم الفقہ، مفتی کفایت اللہؒ کی

تعلیم الاسلام اورمولانا اشرف علی تھانویؒ کی بہشتی زیور مولانا محمد یوسف اصلاحی کی آسان فقہ کا مطالعہ کریں۔عربی کتب کی طرف بعد میں متوجہ ہوں۔

فقہی مسائل میں ایک خاص توسع پسندانہ انداز مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ مولانا حالات کا پورا تجزیہ کرتے ہیں۔اور پھر استدلال سے اس کا حکم شریعت سے اس طرح اخذ کرتے ہیں کہ اسلاف کے نقوش سے روگردانی نہیں ہوتی۔ وہ تمام علما وائمہ سے استفادہ کرتے ہیں۔مولانا نے فتویٰ دینے کا دعویٰ تو کبھی نہیں کیا،لیکن مسائل ومباحث کے نام سے جواب لکھے ہیں،جو رسائل ومسائل نامی کتاب کے کئی حصوں میں جمع ہیں،نیز تفہیم القرآن کے تفسیری نوٹس میں بھی آپ کو گراں قدر فقہی بحثیں ملیں گی۔

(ترجمان القرآن،اگست ۱۹۸۶ء)

غیر مسلم کا قتل

سوال: کوئی مسلمان ذاتی وجوہ کی بنا پر کسی غیر مسلم کو قتل کردیتا ہے۔اس صورت میں کیا اس پر قصاص ودیت کا قانون لاگو ہوگا؟ کیا مقتول کے لواحقین قصاص کا مطالبہ کرسکتے ہیں؟ نیز اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق قاتل کی سزا کیا ہوگی؟

جواب: مسلمان اگر کسی ایسے کافر کو، جسے اسلامی ریاست کی شہریت حاصل ہو،قتل کردے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ہدایہ میں ہے: وَالْمُسْلِمُ بِالذِّمِّیِّ [مسلمان کو ذمی کے بدلہ قتل کیا جائے گا]۔دارقطنی میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَتَلَ مُسْلِماً بِذِمِّیٍّ [نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو ذمی کے بدلے میں قتل کیا]۔[1]

(ترجمان القرآن،اکتوبر ۱۹۹۲ء)

۱- ہدایہ،کتاب الجنایات،ج ۴،ص ۵۵۹۔

ٹیلی ویژن دیکھنا

سوال: ہفت روزہ ختم نبوت میں ایک مولانا صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھنا حرام ہے حتیٰ کہ اگر ٹی وی پر حج کی کارروائی بھی نشر ہو رہی ہو تو اسے دیکھنے سے بھی گناہ ہوتا ہے۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟ کیونکہ ٹی وی کے منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ بہت سے مثبت پہلو بھی ہیں۔

جواب: ٹی وی پر ایسا پروگرام دیکھنا جائز ہے جسے ٹی وی کے بغیر دیکھنا جائز ہے، یعنی جو چیز بذاتِ خود ایسی نہ ہو کہ اسے نہ دیکھا جا سکتا ہو اسے ٹی وی پر دیکھا جا سکتا ہے اور جس کا بذاتِ خود دیکھنا ممنوع ہو اسے ٹی وی پر دیکھنا بھی ممنوع ہوگا۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۸۷ء)

مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان

سوال: کیا مسجد میں کھڑے ہو کر یا مسجد کے سپیکر سے کسی گمشدہ چیز کا اعلان کرنا یا کسی کے جنازے کی اطلاع عوام تک پہنچانا شرعاً درست ہے؟ ہماری مسجد کے امام صاحب اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

جواب: مسجد میں کسی ایسی گمشدہ چیز کا اعلان نہیں کیا جا سکتا جو مسجد میں نہ گم ہوئی ہو، اس کے علاوہ ایسے دوسرے اعلانات کیے جا سکتے ہیں جن کا دنیوی کاروبار سے تعلق نہ ہو۔ نمازِ جنازہ کا اعلان اور دینی جلسے کا اعلان مسجد سے ہو سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۸۷ء)

میراث اور ہبہ

سوال۔ میری ساس کے پاس کچھ زیور ہے جو کہ ان کے کہنے کے مطابق، کڑے دونوں بیٹوں کو اور کانوں کی جھمکیاں اور انگوٹھیاں دونوں بیٹیوں کو ملیں گی۔ وہ الحمدللہ ابھی حیات ہیں۔ لیکن انھوں نے فیصلہ کر کے سب کو بتا دیا ہے کہ یہ میری طرف سے سب کو میرے مرنے کے بعد تحفہ ملے گا۔ لیکن میرے میاں کا اصرار ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا یہ سب کچھ شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اس کے بارے میں آپ کے مشورے اور مذہب کے صحیح فیصلے کے مطابق جاننا چاہتی ہوں۔

جواب: اگر آپ کی ساس اپنا زیور اپنی زندگی میں باقاعدہ ہبہ کر کے اس پر ان لوگوں کو مالکانہ قبضہ نہیں دیتیں جنھیں وہ ہبہ کرتی ہیں تو ان کی وفات کے بعد اس کی تقسیم تمام ورثے میں حصصِ وراثت کے مطابق ہوگی۔ آپ کے شوہر کی راے اس سلسلے میں درست ہے۔ نیز اگر آپ کی ساس اپنی زندگی میں زیور ہبہ کرنا چاہتی ہیں تو بھی انھیں چاہیے کہ بیٹوں اور بیٹیوں کو ان کے حصوں کے مطابق ہبہ کر کے دیں۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۸۶ء)

قصاص اور اُخروی سزا

سوال: ۱- ایک قاتل جو ایک مسلمان کو عمداً قتل کر دیتا ہے اور دنیاوی عدالت سے پھانسی کی سزا پا لیتا ہے، یہ تو دنیاوی سزا ہوئی۔ کیا آخرت میں بھی اس کو سزا دی جائے گی؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قاتل کی بخشش نہ ہوگی۔ کیا اس کی نماز جنازہ جائز ہے؟

جواب: ظلماً قاتل دنیاوی سزا کے ساتھ اخروی سزا کا بھی مستحق ہے۔ لیکن اگر وہ خدا کی خشیت اور اخروی سزا کے خوف کے تحت اپنے آپ کو خود رضا کارانہ طور پر قصاص کے لیے پیش کر دیتا ہے تو

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ 'قصاص' دنیوی اور اخروی دونوں سزاؤں کی جگہ لے لے۔ ہاں اگر قاتل میں احساسِ گناہ اور توبہ کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو تو دنیوی سزا اسے اخروی سزا سے نہیں بچا سکتی۔

قتل 'حقوق العباد' سے تعلق رکھتا ہے۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے 'خون' کے مقدمات کا فیصلہ کیا جائے گا: اَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فِی الدِّمَآءِ[1]۔

البتہ قتل کی اخروی سزا ابدی نہیں ہے بلکہ بالآخر ختم ہو گی اور قاتل بھی جنت میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذَالِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء۴: ۴۸) بالیقین اللہ اپنے ساتھ شرک کرنے والے کی بخشش نہیں کرے گا اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا۔

سورۃ النساء آیت ۹۳ میں جو سزا بیان کی گئی ہے کہ جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے گا اس کی سزا جہنم ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب ہو گا اور اللہ اس پر لعنت کرے گا اور اس نے ان کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا اتنی لمبی ہو گی کہ اسے ہمیشہ کے عذاب سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی قاتل ایسا ہو کہ اس کی نیکیاں ہوں تو وہ مقتول کو دے دی جائیں گی اور پھر اس کے پاس نیکیاں نہ بچیں تو اس کی خطائیں اس کے پلڑے میں ڈال دی جائیں گی اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مفلس کی تشریح کرتے ہوئے بیان فرمایا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا بھی دے گا اور اس کی نیکیوں کا بدلہ بھی: فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ [الزلزال ۹۹: ۷-۸] جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہو گی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔

قاتل کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، البتہ ممتاز شخصیات نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۸۵ء)

۱- متفق علیہ، مشکوٰۃ کتاب کفایۃ القصاص۔

متعہ

سوال: قرآن کے پانچویں پارے کی پہلی آیت [سورۃ النساء۴:۲۴] کے بارے میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے متعہ کا حرام ہونا معلوم ہوگیا۔ مولانا فرمان علی کی تحریر ہے: یہ متعہ حلال اور جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

اس اختلاف کی کیا وجہ ہے؟ درست کیا ہے، غلط کیا ہے اور کیوں؟

جواب: اس مسئلے میں مولانا فرمان علی صاحب کی بات درست نہیں ہے۔ اس بات میں تو اختلاف ہے کہ متعہ قرآن پاک کی مذکورہ آیت سے حرام ہوا ہے یا نہیں، لیکن متعہ کا جواز اس آیت سے کسی نے بھی نہیں سمجھا۔ اس آیت میں مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن عورتوں کو حلال قرار دیا گیا ہے انھیں نکاح کی قید میں لانے کی اجازت ہے، محض شہوت رانی کے لیے انھیں قید میں لانا جائز نہیں ہے۔ سورۂ مومنون میں ہے: اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ (۲۳:۶) [سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو اُن کی ملک یمین میں ہوں]۔

اس آیت میں صرف بیویوں اور لونڈیوں سے نفع اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ بعض علما اور مفسرین نے اس آیت سے متعہ کی حرمت نکالی ہے اس ضمن میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے تفہیم القرآن میں مفصل بحث کی ہے۔ حرمتِ متعہ قرآنِ پاک سے ثابت ہے یا احادیث رسولؐ سے، اس میں بحث ہوسکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ متعہ حرام ہے اور اس مسئلے پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ میرے نزدیک قرآنِ پاک کی ان دونوں آیات سے حرمتِ متعہ کی طرف اشارہ نکلتا ہے کیونکہ متعہ کے ذریعے جس عورت کو لایا جاتا ہے اس سے صرف شہوت رانی مقصود ہوتی ہے وہ بیوی نہیں ہوتی۔ مزید تفصیل کے لیے آپ معارف القرآن (مولانا مفتی محمد شفیعؒ) اور تفہیم القرآن (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کے ان مقامات کا مطالعہ فرمالیں جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۳ء)

متفرق سوالات

سوال:۱- امریکہ میں میرے ایک بھائی نے ایک دن برگر کھالیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں جھٹکے کا گوشت تھا۔ ان کے ایک دوست نے کہا کہ یہ حرام نہیں ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

۲- بسنت، ماؤں کا دن (Mother's day)، باپوں کا دن (Father's day) وغیرہ منانا اسلام کی رو سے جائز ہے؟

۳- اگر ایک ادارے کی بہت فیس ہو، اس کے طلبہ کو لائبریری سے رسالہ درکار ہو یا کوئی پودا پسند آئے تو کیا لے سکتے ہیں، جب کہ اجازت لینے کی بھی جرأت نہ ہو؟ اسی طرح خالہ، ماموں، چچا کے گھر سے بھی چیز لی جاسکتی ہے؟

جواب:۱- برگر میں جھٹکے کا گوشت ہو تو اس کا کھانا حلال نہیں ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ جھٹکے کا گوشت حلال ہے اس کی بات صحیح نہیں ہے۔ حلال گوشت وہ ہے جسے بسم اللہ پڑھ کر اس طرح ذبح کیا گیا ہو کہ خون کی دونوں رگیں کٹ گئی ہوں اور خوراک کی نال بھی۔ جانوروں کی جان خون بہنے کی وجہ سے نکلی ہو نہ کہ دباؤ کی وجہ سے۔ جھٹکے میں جان دباؤ کی وجہ سے نکلتی ہے۔

۲- بسنت اور اس جیسے تہوار یہودیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے رسوم و رواج ہیں۔ ان میں وقت کا ضیاع اور خلافِ اسلام عقائد کی آمیزش ہے۔ ان کا منانا کفار کی جاری کردہ تفریحات میں الجھ کر اپنے قیمتی وقت کو ضائع کرنا ہے۔ ایسے رسوم و رواج اور کھیل جو اسلام کے منافی نہ ہوں ان کی بھی صرف اس وقت اجازت ہے، جب کہ ان میں دینی یا دنیوی فائدہ ہو۔

۳- ادارے کی اشیا کو بغیر اجازت استعمال میں لانا جائز نہیں۔ البتہ خالہ، ماموں اور چچا کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں اس وقت استعمال کی جاسکتی ہیں، جب کہ صراحتاً یا عرفاً اس کی اجازت ہو۔

(ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۱ء)

☆......☆......☆

باب یازدہم

دعوت و تحریک

نظامِ اسلامی کی جدوجہد

ایک صاحب نے جماعتِ اسلامی کی جدوجہد پر چند سوالات اٹھائے تھے۔ مولانا صاحب نے ان کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ سائل کا مؤقف جواب میں ہی آ گیا ہے۔ (مرتب)

تبدیلیِ اقتدار، جو کہ دراصل حصولِ اقتدار کا دوسرا نام ہے، بذاتِ خود اسلامی نظام کے قیام اور مسائل کے حل کی ضمانت فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ اپنے آپ کو اور اپنی جماعت کو صالحین قرار دیتے ہوئے اقتدار کا اہل اور مستحق قرار دینا ہے۔ یہ عظیم فتنہ ہے جس کی بدترین مثال ہماری بدقسمت تاریخ میں جنگِ جمل، جنگِ صفین، واقعۂ کربلا وغیرہ کی صورت میں پہلے سے موجود ہے۔ نہ معلوم کب تک ہماری نسلوں کو بزعمِ خود صالحیت اور اہلیت کے دعوے داروں کے ہاتھوں تبدیلیِ اقتدار (حصولِ اقتدار) کے لیے تختۂ مشق بننا پڑے گا۔

یہ آپ کا پہلا نکتہ ہے۔ آپ کے اس نکتے کا حاصل یہ ہے کہ حصولِ اقتدار اور تبدیلیِ اقتدار کے لیے کوشش کرنا فتنہ ہے اور جنگِ جمل، جنگِ صفین اور واقعۂ کربلا میں صحابہ کرامؓ نے جو کوشش کی وہ فتنہ تھی۔ آپ کی خواہش ہے کہ یہ کوشش جو فتنہ کی حیثیت رکھتی ہے، ختم کی جائے۔ آپ کے نزدیک جو گروہ صالحیت کی بنا پر اپنی جماعت کو اقتدار کے لیے پیش کرتا ہے وہ قرآن وسنت کی روشنی میں نااہل، غیر صالح اور غیر متقی قرار پاتا ہے۔

دوسرے نکتے میں آپ فرماتے ہیں کہ اعلاے کلمۃ اللہ کے حوالے سے واحد لائحۂ عمل بنیادی اسلامی نظریے کو تسلیم کروانا، اسے سپریم لا قرار دلوانا اور اس کے حصول کے لیے تمام دینی جماعتوں اور تحریکوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا بھی مطلوب ہونا چاہیے۔ تیسرے نکتے میں آپ پہلے نکتے کے بالکل برعکس فرماتے ہیں کہ جہاں تک تبدیلیِ اقتدار کا تعلق ہے یہ مطلوب ضرور ہے لیکن مقصود ہرگز نہیں۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ قرآن میں امارت کے قیام کے حوالے سے منکم کی شرط موجود ہے۔ یعنی امارت پر صرف ایسے اہل مسلم افراد مامور کیے جائیں جو مسلمانوں کی

طرف سے منتخب کیے جائیں۔اس کے لیے آپ جماعت کی طرف سے دفعہ ۶۲، ۶۳ کے مطابق انتخابات کے مطالبے کی تائید کرتے ہیں۔لیکن بائیکاٹ کو غلط قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں اکثریت نے انتخاب کا بائیکاٹ کر دیا اور نواز شریف بھاری مینڈیٹ کے دعووں کے ساتھ برسرِ اقتدار آ گیا۔آپ کے نزدیک دفعہ ۶۲، ۶۳ شریعت کے مطابق انتخاب کی ضمانت نہیں دیتی بلکہ اس کے لیے انتخابی قوانین میں تبدیلی لانا ہوگی۔اس تیسرے نکتے میں آپ نے دونوں نکتوں کے برعکس اقتدار کی ضرورت کو تسلیم کیا اور اسے قرآن کی ہدایت قرار دیا۔قرآن کے مطابق اقتدار اہل لوگوں کو ملنا چاہیے اور اس کے لیے انتخابی قوانین میں تبدیلی لانی چاہیے یہ آپ کے اس نکتے کا حاصل ہے۔اگر آپ اس تیسرے نکتے کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر تبدیلی اقتدار کے لیے کوشش کو فتنہ کیوں قرار دیتے ہیں اور جماعت اسلامی کو اس بات کی تلقین کیوں کرتے ہیں کہ وہ صرف نظریاتی کام کرے۔یہ تضاد سمجھ سے بالاتر ہے۔

آپ ایک مرتبہ اپنے خط کو پڑھیں اور پھر غور کریں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی صرف نظریاتی کام کرے، عملی سیاست میں حصہ نہ لے۔انتخابی میدان دوسروں کے لیے خالی چھوڑ دے تاکہ حصولِ اقتدار کے لیے غلط کار لوگ، انگریز کے ایجنٹ، لادین یا لبرل لوگ ہی کوشش کرتے رہیں اور وہی کرسیِ اقتدار پر براجمان ہوں۔اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو پھر آپ کے تیسرے نکتے پر کیسے عمل ہوگا؟ اہل لوگ میدان میں کہاں سے آئیں گے؟ انھیں میدان میں آنا چاہیے یا نہیں؟ وہ انتخابی میدان میں کودیں یا باہر رہ کر تماش بین اور واعظ کا کردار ادا کریں؟......آپ جس انداز سے سوچ رہے ہیں یہ سوچ واضح نہیں ہے۔بہت سے لوگ آپ کی طرح گومگو کی پوزیشن میں ہیں جو دراصل فکری انتشار ہے۔اس فکری انتشار کا حل یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے اجتہادات کو ایک طرف رکھ کر کتاب وسنت کی روشنی میں جماعتِ اسلامی کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اپنے خیالات ونظریات اور تجاویز وآرا اس کی روشنی میں ترتیب دیں۔اس سلسلے میں آپ درج ذیل امور کو ملحوظ رکھیں تو امید ہے کہ آپ کو جماعتِ اسلامی

کے موقف کے بارے میں اطمینان حاصل ہوگا۔

کائنات کا حکمران اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہی انسان کو اس کی تمام ضروریات فراہم کرتا ہے، اس لیے وہی اس بات کا حق دار ہے کہ انسان اس کی عبادت کرے، اس کے احکام کو مانے اور اس کی حکومت قائم کرے۔ پاکستان کے دستور میں بھی اس نظریہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے ذریعے اللہ نے اپنا نظامِ حکمرانی نازل فرمایا اور انھیں حکمران بنا کر بھیجا ہے۔ انبیا علیہم السلام اللہ کی طرف سے نامزد حکمران ہوا کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے نظام اور اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکومت کے لیے نامزد کیا ہوتا ہے۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی حکومت قائم کرتا ہے۔ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء۴:۸۰)[جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی] لیکن وہ انھیں غیب سے اور اپنی قدرت سے حکومت نہیں دیتا۔ حکومت حاصل کرنے کے لیے انھیں دعوت اور جہاد سے کام لینا ہوتا ہے۔ انبیا علیہم السلام اپنی حکومت کی طرف دعوت بھی دیتے ہیں اور اس کے لیے بوقتِ ضرورت قتال بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (النساء۴:۶۴) ہم نے کسی بھی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

سب سے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور رسول بھی تھے اور نامزد حکمران بھی۔ آپؐ نے کتاب وسنت کا نظام دیا اور اپنی زندگی میں خود حکومت کی اور اپنے بعد اپنی امت کو حکومت سپرد فرمائی۔ آپؐ کی امت آپؐ کی نائب اور خلیفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَأۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ (آلِ عمران۳:۱۱۰) تم تمام امتوں سے بہتر امت ہو، جسے انسانوں کی امامت کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم کرتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

آپؐ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتِ مسلمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی

حیثیت سے نامزد حکمران ہے۔اس پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہے کہ کافر کا اقتدار ناجائز ہے اور کفر کا اقتدار بھی باطل ہے۔نظامِ اقتدار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام کو پسند فرمالیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۳:۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔اور اس نظام کو چلانے کے لیے امتِ مسلمہ کو مقرر فرمادیا ہے۔

امتِ مسلمہ کا کام ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اقتدار کے لیے کوشش کرے۔امتِ مسلمہ کا اقتدار آپؐ کی خلافت اور نیابت ہے اور کتاب وسنت کی حکمرانی حکومتِ الٰہیہ کا دوسرا نام ہے۔چنانچہ امتِ مسلمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے منصب کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے ایسا ہی کیا۔اس وقت دنیا میں ۶۰ کے قریب جو مسلمان ممالک ہیں وہ امتِ مسلمہ کے جہاد کا نتیجہ ہیں۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ تو اقتدار اور خلافت کے لیے نامزد ہوگئی۔لیکن اس امت میں حکومت کی تشکیل کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں حکومت، امتِ مسلمہ کے انتخاب کے ذریعے عمل میں آئے گی۔اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو تو اقتدار کے لیے نامزد کردیا ہے لیکن اس کے کسی فرد کو کسی بھی دور میں حکومت کے لیے نامزد نہیں کیا۔ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمانؓ وعلیؓ خلفاے راشدین بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نامزد نہیں تھے بلکہ امتِ مسلمہ کے منتخب کردہ تھے۔ان کے بعد بھی کوئی نامزد نہیں ہے بلکہ منتخب ہوگا۔البتہ صفات کے لحاظ سے تعین کردیا گیا ہے کہ امت ان صفات سے متصف افراد میں سے کسی کا انتخاب کرے اور جو ان صفات سے متصف نہ ہو اس کا انتخاب معتبر نہ ہوگا۔ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (البقرہ ۲:۱۲۴) میرا وعدہ ظالموں سے نہیں ہے۔

ظالم خلیفہ، امیر، قاضی اور حاکم نہیں ہوسکتا[1] اس بات پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے۔

شیعہ حضرات امامت کو نامزد قرار دیتے ہیں اور امام ان کے نزدیک معصوم ہوتا ہے۔لیکن اہل سنت والجماعت کے نزدیک امامت انتخاب سے وجود میں آتی ہے۔یہ بنیادی نظریہ ہے جو شیعہ اور اہل سنت والجماعت میں امتیاز کرتا ہے۔مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ آیت وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ

۱- احکام القرآن، للجصاص۔

لِلۡمَلٰٓئِكَةِ (البقرہ۲:۳۰) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: اس آیت سے ایک اصول یہ نکلتا ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ جل مجدہ کے لیے ہے۔ دوسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ اللہ کا نبی اور رسول، اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ تیسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ امتِ مسلمہ میں حکومت انتخاب کے ذریعے قائم ہوگی۔ انتخاب کے ذریعے اسلامی حکومت کا قائم ہونا قرآنِ پاک کی متعدد آیات سے ثابت ہے۔ ان آیات میں سے ایک آیت سورۂ شوریٰ کی ہے کہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (الشوریٰ۴۲:۳۸) ان کی حکومت باہمی مشورے سے قائم ہوتی ہے۔

اسی اصول کی روشنی میں جو قرآنِ پاک کی آیات سے مستنبط اور ثابت ہے اور جس پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہے، ضروری تھا کہ خلافتِ راشدہ اور امامت مسلمانوں کے مشورے اور انتخاب سے عمل میں آتی۔ باپ کے بعد بیٹے کی حکومت کا سلسلہ قائم نہ ہوتا لیکن یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ اسلام کا ایک حکم خلافتِ راشدہ کے بعد معطل ہوگیا۔ لیکن امت اس سے غافل نہیں رہی۔

صحابہؓ کے دور سے لے کر ہر دور میں خلافت اور مسلمانوں کے مشورے سے حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد ہوتی رہی اور امر بالمعروف کا فرض ادا ہوتا رہا۔ جن لوگوں نے اس اصول کو قائم کرنے کے لیے کوشش کی، انھوں نے اسلام کے حکم کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے کوشش نہیں کی۔ جنگِ جمل و صفین تو صحابہؓ کے درمیان غلط فہمی کا نتیجہ تھیں اور کربلا کا واقعہ حصولِ اقتدار کے فتنے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (الشوریٰ۴۲:۳۸) کے حکمِ قرآنی کے مطابق حکومت قائم کرنے کی پُرامن کوشش تھی۔ ظلم ان لوگوں نے کیا جنھوں نے اس حکم کے لیے کوشش کرنے والی شخصیت حضرت امام حسینؓ پر فوج کشی کر کے انھیں شہید کر ڈالا۔ اس کے بعد بنوامیہ، بنوعباس اور بنوعثمان کی حکومتیں قائم ہوئیں جو خلافت کے نام سے ملوکیت تھیں۔ ان میں نظام تو کتاب وسنت کا جاری تھا لیکن حکومت انتخاب سے نہیں بلکہ خاندانی وراثت کے طور پر وجود میں آتی تھی۔ اسی ملوکیت کا نتیجہ بالآخر سقوطِ بغداد اور سقوطِ خلافت کی صورت میں سامنے آیا۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست ۶۰ کے قریب مملکتوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ریاست کا جو نظام اسلام کی شکل میں رائج تھا، معطل ہوگیا۔ بعض ممالک (جیسے ترکی) میں اسلام خلافِ قانون ہوگیا اور اقتدار ان لوگوں کے پاس آ گیا جو کتاب وسنت کی رو سے اقتدار کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان مسلمانوں کو ایک طرف تو خلافتِ اسلامیہ کو بحال کرنا ہے اور اس کے لیے اسلام کی بنیاد پر ممالکِ اسلامیہ کو متحد کرنا ہے اور دوسری طرف اپنے اپنے ملک میں ایسی حکومت قائم کرنا ہے جو قرآنِ پاک کے بیان کردہ معیار پر پورا اترنے والی ہو جسے ہم شرعی حکومت کہہ سکیں۔ یہ وہ کام ہیں جو ہمیں کرنے ہیں۔ یہ صرف ایک کام نہیں ہے۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف نظریاتی کام کرنا چاہیے۔ اسلامی نظام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے آواز بلند کرنا چاہیے اور اس کے لیے دعوت دیتے رہنا چاہیے، اقتدار کی کش مکش میں پڑنا صحیح نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ اگر صرف نظام غیر اسلامی ہوتا تو یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ اسلامی نظام کے لیے آواز بلند کی جائے۔ لیکن اس وقت جہاں نظام کے قیام کے لیے کوشش کی جائے گی وہاں حکمران جو کہ ظالم اور فاسق ہیں، شریعت کے معیار پر پورا نہیں اترتے، انھیں بھی ہر ممکن طریقے سے برطرف کر کے ان کی جگہ صالحین کو برسرِ اقتدار لانا ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کا پہلا حکم جو قائم کیا گیا وہ شریعت کی روشنی میں حکومتِ اسلامی کا قیام تھا۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ وعثمانؓ و علیؓ خلفا منتخب ہوئے اور خلافتِ راشدہ کا نظام قائم ہوا۔ جب یہ نظامِ خلافت، ملوکیت کی طرف منتقل ہونے لگا تو پھر بعض صحابہ کرامؓ نے جن میں امام حسینؓ سرفہرست ہیں، نظامِ خلافت کو بچانے کے لیے کوشش کی۔ اس کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلے کے بارے میں دو آرا نہ ہوتیں اور لوگ اسلامی حکومت کے قیام کو اولین دینی فریضہ سمجھتے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب بھی بعض لوگ اسے حصولِ اقتدار کا فتنہ قرار دے رہے ہیں حالانکہ یہ سنتِ انبیا علیہم السلام ہے کہ انھوں نے بھی اپنے دور میں اقتدار کے لیے کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمرانی کے لیے نامزد تھے اور اقتدار کے حق دار تھے۔ اب دورِ نبوت کے بعد امتِ مسلمہ کا کفر کے اقتدار کے خلاف جہاد کرنا بھی

سنتِ انبیا ہے اور امتِ مسلمہ کے اندر شرعی حکومت قائم کرنے کی کوشش بھی حق دار کو اس کا حق دلانے کی کوشش ہے اور سنتِ انبیا پر عمل کرنا ہے۔

پاکستان میں شرعی حکومت کے قیام کے لیے کوشش کا دروازہ کھلا ہے۔ ہر پانچ سال بعد انتخاب ہوتا ہے لیکن انتخابات میں ایسے لوگ حصہ لیتے ہیں جو اقتدار کے اہل نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف اہل لوگوں کا میدان میں آنا فرض اور شریعت کا تقاضا ہے۔ جو لوگ اسے فتنہ سمجھتے ہیں انھیں کتاب و سنت کی تعلیمات اور انبیا علیہم السلام کی سنت اور دین کے مقاصد کا علم نہیں ہے۔ جماعتِ اسلامی پاکستان اسی نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ صرف ایسے لوگ برسرِ اقتدار آئیں جن پر جماعتِ اسلامی کا ٹھپہ لگا ہو بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایسے لوگ برسرِ اقتدار آئیں جو شریعت کے معیار پر پورا اترتے ہوں۔ اسی بنیاد پر جماعتِ اسلامی نے دستورِ پاکستان کی دفعہ ۶۲، ۶۳ کے مطابق انتخاب کرانے کا مطالبہ کیا تھا۔ جماعتِ اسلامی نے یہ مطالبہ کب کیا تھا کہ انتخاب میں ہم اسی وقت حصہ لیں گے جب میدان میں صرف جماعتِ اسلامی کے لوگ ہوں؟ کیا جماعتِ اسلامی نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ عوام صرف جماعتِ اسلامی کے لوگوں کو منتخب کریں؟ یا یہ مطالبہ کیا تھا کہ ایسے لوگوں کو منتخب کریں جو دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کے معیار پر پورا اترتے ہوں خواہ ان کا تعلق کسی بھی جماعت سے ہو، چاہے وہ جماعتِ اسلامی میں شامل ہوں یا نہ ہوں؟

محترم! آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ پر اپنی غلطی واضح ہو جائے گی۔ جماعتِ اسلامی اللہ کے فرامین: وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی (الشوریٰ ۴۲:۳۸) (ان کی حکومت باہمی مشورے سے قائم ہوتی ہے) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۳:۱۹) (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے) اور وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور۲۴:۵۵) (اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اس طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا، پس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں) کے مطابق نظامِ انتخاب کے ذریعے شرعی حکومت اور اسلامی نظام کے قیام، اتحادِ امت اور احیائے خلافت اور مومنینِ صالحین کے ذریعے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو متوجہ کرتی ہے کہ فاسقین کا اقتدار شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ اپنے ووٹ کے حق کو شریعت کے مطابق استعمال کرو کیونکہ شریعت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کر کے ظالم اور فاسق کو ووٹ دینا، ناجائز اور غیر معتبر ہے۔ اس کے بارے میں قیامت کے روز جواب دہی کرنا پڑے گی۔

حصولِ اقتدار صالحین کے لیے حرام نہیں ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ اقتدار کے لیے کوشش کرنا نااہلی کی نشانی ہے۔ یہ نظریہ قرآن وحدیث کی تعلیمات سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ نااہلی تب ہے جب ذاتی بڑائی کے لیے کوشش کی جائے اور اس کی خاطر اقتدار کی حرص اور لالچ کی جائے۔ لیکن اگر حکومتِ الٰہیہ کی خاطر حصولِ اقتدار کی کوشش کی جائے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ سنتِ انبیا علیہم السلام ہے اور یہ کوشش ایک دینی فریضہ ہے۔ اس کوشش میں حصہ نہ لینا جرم اور گناہ ہے۔ یہ کوشش اس وقت ناپسندیدہ ہے جب آدمی اپنے سے اہل تر کے مقابلے میں اقتدار کی طلب کرے۔ جماعتِ اسلامی دینی جماعتوں اور دین کے علمبرداروں کے مابین مقابلے کی مخالف ہے اسی لیے وہ کوشش کرتی ہے کہ انتخاب میں ایسی جگہ کسی کو نامزد کرے جہاں کوئی دوسرا اہل تر آدمی موجود نہ ہو۔

افسوس کی بات ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے برسرِ اقتدار طبقے نے بہت سی چالوں سے نیک لوگوں کو اقتدار سے دور رکھ کر اقتدار کے مزے لوٹتے رہنے کی کوشش کی ہے۔ ان چالوں میں

سے ایک چال دینی جماعتوں کو آپس میں لڑانا ہے۔ دوسری چال مذہب اور سیاست کی تفریق ہے کہ دین کا اقتدار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور تیسری چال لوگوں کو یہ باور کرانا ہے کہ دین دار لوگوں کا اقتدار کے لیے کوشش کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسلامی تحریک کو ان تمام سازشوں کو ناکام کر کے اللہ کے دین کو قائم کرنا اور نظامِ خلافت کو بحال کرنا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ ان تمام سازشوں سے باخبر رہیں۔ اس کے لیے اہلِ علم سے رابطوں کو مضبوط اور مستحکم کریں اور یکسو ہو کر لادین لوگوں کو اقتدار سے برطرف کر کے نیک لوگوں کو برسرِ اقتدار لانے میں جماعت کا ساتھ دیں۔

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۹۹ء)

سمع و طاعت کی شرعی حیثیت

سوال: اللہ کے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص امیر کی اطاعت سے روگردانی کرتا ہے تو گویا کہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ:

۱- ایک اسلامی تحریک میں، جب کہ اسلامی حکومت قائم نہ ہو، سمع و طاعت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲- اطاعت کب تک جائز رہتی ہے؟ کیا ہر معروف کی اطاعت لازمی ہے؟

۳- کیا یہاں بھی اطاعت کی حد اتنی ہی وسیع ہے جتنی کہ اسلامی ریاست میں امیر کی اطاعت کی ہے؟

۴- اطاعت نہ کرنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جو وعید ملتی ہے کیا تحریک میں اطاعت سے روگردانی پر بھی فرد اسی کا حق دار قرار پاتا ہے؟

جواب: اقامت دین کا کام فرضِ عین ہے۔ اسلامی تحریک اس کام کو ادا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اس کی چھوٹی بڑی تنظیمیں اسلامی تحریک کے مختلف یونٹ ہیں اور اسلامی تحریک کی حیثیت ایک منظم فوج کی ہے۔ امارت، تنظیم اور اجتماعیت کی اساس ہے اور امارت بغیر سمع و طاعت کے متصور نہیں ہے۔ اسلامی تحریک کا وجود اور اس کا کام قرآنِ پاک کی متعدد آیات اور

احادیث کا تقاضا اور دین کی روح ہے۔

اسلامی تحریک ایک طرف مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتی ہے، انھیں اس کے لیے فکری اور عملی طور پر تیار کرتی ہے اور دوسری طرف لادین جماعتوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ باطل اور لادین افکار ونظریات پر تنقید کر کے عامۃ المسلمین کو ان کے شر سے بچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو صرف یہ بات مطلوب نہیں کہ لوگ اس کے دین کے لیے لڑیں، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ 'منظم ہو کر' لڑیں اور ایک منظم قوت بن کر کفر کی منظم طاقت کو شکست دیں اور اس کے اقتدار کو ختم کر کے اسلامی اقتدار قائم کریں۔ انبیا علیہم السلام نے صرف نظریہ نہیں پھیلایا بلکہ نظریے پر ایمان لانے والوں کو اپنی قیادت میں منظم کر کے ایک امت بنایا۔ تمام انبیا علیہم السلام کا مقصد اور نصب العین ایک تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون ۲۳:۵۲) اور یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، پس مجھ سے تم ڈرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عام انبیا علیہم السلام کی طرح ایک امت برپا کی۔ آپؐ نے اپنے دور میں مختلف فوجیں مختلف امرا کی قیادت میں دعوت و جہاد کے لیے روانہ کیں اور انھیں ہدایات دیں جن میں معروف میں امیر کی سمع و اطاعت کی ہدایت بھی شامل ہوتی تھی۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ یہ کتاب و سنت اور فقہ اسلامی میں طے شدہ اصول ہے۔

اس وقت دنیا میں اسلامی تحریک اور اس کی چھوٹی بڑی تنظیموں سے وابستگی اور ان کے نظم کی اطاعت اس بنیاد پر ہے کہ یہ ایک ایسی جماعت اور فوج ہے جو اقامتِ دین کے لیے سرگرمِ عمل ہے، اور وہ اسی فریضے کو سرانجام دے رہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سپرد کیا گیا تھا۔ جو لوگ اس سے وابستہ ہوتے ہیں وہ ایک دستور کی بنیاد پر تنظیم میں شامل ہوتے ہیں اور اپنے عہد کی بنیاد پر اطاعتِ نظم کے پابند ہوتے ہیں۔ فریضۂ اقامتِ دین کو سرانجام دینے کی خاطر ہی وہ اس تنظیم سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے تنظیم کو مضبوط، فعال اور متحرک رکھے اور اسے وسیع کرنے کی کوشش کرے تاکہ مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔

تنظیم کے بغیر اور تنظیمی قوت اور تنظیم کو بڑے پیمانے پر وسیع کیے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ تنظیم کی مضبوطی کی بنیاد یہ ہے کہ لوگ نظم کی اطاعت کریں۔ اس کے نظم کے وہ تمام لوگ پابند ہیں جنھوں نے اس میں شمولیت اختیار کی ہے اور اطاعت کا عہد کیا ہے۔ اگر وہ معروف میں تنظیمی اور دعوتی کاموں میں نظم کی اطاعت نہیں کریں گے تو اپنے عہد کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے۔ قرآنی حکم ہے: وَ اَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡئُوۡلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴) عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدۡتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا (النحل ۱۶:۹۱) اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو۔

یہ عہد جو تنظیم کے ساتھ کیا گیا ہے، جس کا حلف اٹھایا گیا ہے، اس کی خلاف ورزی کی جائے گی تو گناہ ہوگا کیوں کہ یہ عہد کی خلاف ورزی ہے۔ اس میں سمع واطاعت کی خلاف ورزی کا گناہ، فوج کے امیر کے حکم کی خلاف ورزی کے گناہ کی طرح ہے۔ اس کے کاموں میں سستی کا وہی حکم ہے جو فوجی اور جہادی مہمات میں سستی کا ہے۔ جس طرح فوجی مہمات کی اہمیت میں فرق ہوتا ہے اور اس میں بعض مہمات میں شرکت سب کے لیے ضروری ہوتی ہے اور بعض میں سب کی شرکت ضروری نہیں ہوتی اور بعض کی حیثیت صدق اور نفاق کو پرکھنے کی ہوتی ہے۔ تحریکی مہمات کا بھی یہی حکم ہے۔

جو شخص عقیدہ اور نصب العین میں کمزوری کی بنا پر سمع وطاعت میں کمزور ہوگیا اور تحریکی مہمات میں سست پڑ گیا وہ گناہ گار ہوگا۔ جو شخص عقیدہ اور نصب العین سے انحراف کی بنا پر تنظیم سے الگ ہوگیا وہ خسارے میں پڑ گیا۔ جو شخص نظم سے اختلاف کی بنا پر الگ ہوگیا اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔ جو کام کی مشکلات سے ڈر کر یا دنیاوی لالچ میں آ کر ایک طرف ہوگیا، وہ جہاد سے پیٹھ پھیرنے کے جرم کا مرتکب ہوگیا۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا ترتیب وار جواب درج ذیل ہے:

۱- جو شخص موجودہ حالات میں، جب کہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہے، اسلامی نظمِ جماعت میں شامل ہونے کے باوجود سمع وطاعت نہیں کرتا وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے اور

سمع و اطاعت کی جس قدر خلاف ورزی کرے گا اسی قدر اپنے عہد کو توڑے گا اور اسی تناسب سے گناہ کا مرتکب ہوگا۔

۲۔ اطاعت، معروف میں جائز ہے اور معروف کو قائم کرنے کی خاطر ہی تو تنظیم وجود میں آئی ہے تب غیر معروف میں اطاعت کا تصور کیسے ہوسکتا ہے؟

۳۔ اسلامی حکومت کے امیر، اور امیر جماعت کی اطاعت میں حکم کے اعتبار سے فرق ہے اور دونوں کی حدود مختلف ہیں۔ امیر المومنین کی اطاعت، امیرِ ریاست کی حیثیت سے ہوتی ہے اور امیرِ جماعت کی اطاعت تنظیم کے امیر کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ امیرِ ریاست کی اطاعت آدمی کی مرضی پر منحصر نہیں ہے، اس نے اس کی اطاعت کا عہد کیا ہو یا نہ کیا ہو اسے معروف میں اس کی اطاعت کرنا ہوگی۔ جب کہ وہ شرعی اصولوں کے مطابق منصب پر فائز ہوا ہو اور معروف کے مطابق حکم کرتا ہو۔ ایسے امیر کی اطاعت اور نافرمانی کے بارے میں فرمایا: مَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَ مَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ (بخاری، کتاب الاحکام، ۷۱۳۷) جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ لیکن امیرِ جماعت کی اطاعت عہد پر موقوف ہے، جس نے اطاعت کا عہد کیا ہو وہ اطاعت کرے گا اور جس نے اطاعت کا عہد نہیں کیا وہ اطاعت کا پابند نہیں ہوگا۔

۴۔ اطاعت سے ہاتھ کھینچنے کی صورت میں جو وعیدیں آئی ہیں ان کا تعلق امیر المومنین اور مسلمانوں کے اجتماعی نظم سے کٹ جانے سے ہے۔ مسلمانوں کی جماعت سے علیٰحدہ ہو جانا، ان کے مقابلے میں تنہا چلنا یا جماعت بنانا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ عَنْ عُنُقِهٖ (اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال لیا) اور مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ (جو الگ ہوا، وہ الگ ہو کر آگ میں چلا گیا) کا مصداق اور اسلام سے علیٰحدگی کے ہم معنی ہے۔ امیر کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ نہیں کہا گیا البتہ مسلمانوں کی جماعت سے علیٰحدگی کو گناہ کبیرہ کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس پر شذ فی النار کی وعید ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی کسی تنظیم یا اسلامی تحریک کی کسی تنظیم سے علیٰحدگی، جہادی تنظیم سے علیٰحدگی کے مترادف ہے۔ وہ اس وقت قابلِ اعتراض ہے جب آدمی اقامتِ دین کی جدوجہد کو ترک کردے اور اس کے لیے کسی بھی اجتماعی کوشش کو چھوڑ دے۔ تنظیم سے علیٰحدگی کا فیصلہ، غلط

فیصلہ تو ہوسکتا ہے لیکن اس کو ان احادیث کا مصداق نہیں کہا جاسکتا جن میں جماعت سے الگ ہونے پر وعیدیں آئی ہیں۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۹ء)

اقامتِ دین اور نظمِ جماعت

سوال: رسائل و مسائل (اگست ۱۹۹۹ء) کے ضمن میں ایک اشکال پیش خدمت ہے:

اقامتِ دین کا کام فرضِ عین ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اگر اس سے مراد اپنے جسم پر دینِ اسلام کے احکامات کا نفاذ ہے تو پھر یہ کام عینِ فرض ہے اور اگر اس سے مراد دین ہے تو پھر حکمرانوں کا کام ہے، ان پر فرض ہے عام مسلم شہری پر یہ کس طرح فرضِ عین ہوگا؟ میرے ناقص مطالعے کے مطابق، اس صورت میں کسی تحریکِ اسلامی کی ضرورت نہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ دعوت کے کام کی ضرورت ہوگی۔ حکمرانوں تک دعوتِ حق پہنچانا فرضِ عین ہوگا نہ کہ ان کے خلاف کھڑے ہوکر احتجاجی تحریک چلانا۔ البتہ آج کے تمدنی اور سیاسی شعور کے زمانے میں، حکومت کی تبدیلی کے لیے آئینی جدوجہد کرنا ہر شہری کا آئینی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کام جائز تو ہوگا لیکن شرعی طور پر فرضِ عین نہیں بن جاتا......!

جواب: اگر آپ نے ایمان اور اسلام کی حقیقت پر غور فرمایا ہوتا تو آپ کو اقامتِ دین کے فرضِ عین ہونے میں کوئی اشکال نہ پیدا ہوتا۔ ایمان، اللہ کی حکمرانی کو ماننے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ایمان کا تقاضا اور رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ اسی طرح جزا اور سزا کے دن پر ایمان بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان کا حصہ ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ کے نظام کو ماننا۔

اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنی حکمرانی اپنے نبیوں کے ذریعے قائم کرتا ہے۔ اس نے ہر دور میں انبیا علیہم السلام کو مطاع بنا کر بھیجا ہے۔ انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ ہوتے ہیں۔ ان کا کام لوگوں کو اللہ کے نظام کی طرف اور اپنی اطاعت اور حکمرانی کی طرف دعوت دینا ہوتا ہے۔

وہ لوگوں کو اپنی اطاعت کے محور پر منظم کر کے ایک امت بناتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حاکمیت،اللہ کے نظام، اور اپنی اطاعت کی طرف انسانوں کو دعوت دی،ایک امت بنائی،سرزمینِ عرب کو اللہ کے دین کے لیے مسخر کر دیا اور اللہ تعالیٰ کا دین نازل ہونے کی تکمیل کے ساتھ مکمل طور پر نافذ بھی ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے بعد دین کو دنیا کے اس حصے تک پہنچایا جسے آج ہم اسلامی ممالک کے نام سے جانتے ہیں۔یہ سارے ممالک اسلام کے مسخر کردہ ہیں۔صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور بعد کے ادوار میں اہلِ ایمان نے اسی طرح جہاد و دعوت کے ذریعے انھیں مسخر کیا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سرزمینِ عرب کو مسخر کیا تھا۔

اللہ کے نازل کردہ نظام کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمایا۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نظام آج بھی نافذ ہے۔جن لوگوں نے اس نظام کو معطل کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے باغی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نافرمان ہیں۔یہ کام انگریز نے کیا تھا۔انگریز کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں پر لازم تھا کہ اللہ کی شریعت کو بحال کرتے لیکن نام نہاد مسلمان حکمرانوں نے اللہ کی شریعت کو معطل رکھا ہے اور ایک اسلامی ریاست کو علاقائی اور نسلی بنیادوں پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔آج امتِ مسلمہ ۶۰ کے قریب مسلمان ریاستوں کی شکل میں تقسیم ہے۔

اللہ پر ایمان، اللہ کے رسولؐ پر ایمان، روزِ جزا پر ایمان اور اللہ کے نظام پر ایمان تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے نظام کے مقابلے میں دوسرے نظاموں کو رد کر دیں۔ایسے حکمرانوں کو جو اللہ کے نظام کو معطل رکھنے کے ذمہ دار ہیں، مسترد کر دینا ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔

مسلمانوں کو اس بات کا شعور ہو یا نہ ہو، لیکن ایمان کی یہ حقیقت ہے۔اللہ کے نظام پر ایمان لانے کے ساتھ کسی دوسرے نظام کو نہیں مانا جا سکتا۔اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں کسی دوسرے کے حکم کو نہیں مانا جا سکتا۔مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے سود حرام ہے اور موجودہ حکومت نے اسے حلال کیا ہوا ہے تو کیا سود ایک مسلمان کے لیے حلال اور جائز ہو گیا ہے؟ کیا کل قیامت کے روز

سودی کاروبار کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھے گا کہ پاکستان میں سودی کاروبار کیوں کرتے تھے؟ اور کیا کوئی شخص یہ جواب دے کر جان بچالے گا کہ پاکستان میں سود جائز تھا اس لیے میں نے سودی کاروبار کر کے کوئی جرم نہیں کیا؟ کیا سودی نظام جاری رکھنے والے حکمران اور ان کے مددگار عوام وخواص، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں مجرم نہیں ہوں گے؟ یہ ایک مثال ہے ورنہ مسئلہ سود ہی کا نہیں ہے بلکہ تمام احکامِ الٰہی کا ہے۔ عوام کو احکامِ الٰہی کی تفصیل معلوم نہیں تو کیا اجمالاً بھی وہ نہیں جانتے کہ اللہ کے احکام کو ماننا ضروری ہے اور ان کے مقابلے میں دوسرے احکام کا رد کرنا لازمی ہے۔ اللہ کے احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ نیک لوگوں کو حکمران بنایا جائے۔ کیا اس کے بارے میں عوام وخواص سے باز پرس نہ ہوگی؟ قبر میں منکر ونکیر صرف مَنْ رَبُّكَ اور مَنْ نَبِيُّكَ کے سوالات پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ یہ بھی پوچھیں گے وَمَا دِيْنُكَ۔

اقامتِ دین کے فرضِ عین ہونے کے یہی معنی ہیں کہ اللہ کے نظام کے مقابلے میں دوسرے نظاموں کو رد کر دیں۔ اسلامی نظام کے حق میں آواز اٹھانا، اس کی حمایت کرنا، اسلام کے مطابق حکومت قائم کرنے کی حمایت کرنا، یہ خود اسلام پر عمل کرنا ہے۔ مسلمان کے فرائض میں سے یہ ایک فرض ہے۔ آپ اسے سیاست کا نام دے کر حکمرانوں سے ٹکرانے اور ان کے خلاف تحریک چلانے کی فرضیت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ وہ نظام جس پر ہم ایمان لائے ہیں، معطل ہے، حکمران اللہ کے باغی ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ حکومت ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی ہے، تو وہ تمام لوگ جو اس حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ مل کر اس کے خلاف آواز کیوں نہ اٹھائیں؟ اور قراردادِ مقاصد میں تو دستوری طور پر بھی اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے، تو کیا دستورِ پاکستان کی حفاظت ہر شہری کا فرض نہیں ہے؟

آپ کا یہ کہنا کہ یہ کام جائز ہوگا لیکن شرعی طور پر فرض نہیں ہے، قطعاً باطل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نظام اور احکام کے مقابلے میں ہر حکم کا انکار فرض ہے اور ایک آدمی بیک وقت دو احکام اور دو حکومتوں کو مانے گا تو اس کے مقابلے میں دوسری حکومتوں کو رد کرنا لازم ہوگا۔

قرار دادِ مقاصد کی رو سے ایسی حکومت کا انکار لازمی ہے جو اللہ کے نائب کی بجائے اللہ سے آزاد بلکہ اس کے مقابلے میں حکومت کرے۔ اگر اسلامی حکومت فرض نہیں ہے تو پھر اس کی دعوت کی کیا ضرورت ہے؟ اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلامی نظام پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے مواخذہ کیوں ہوگا؟ کیا اس وقت لوگوں سے یہ سوال نہ ہوگا کہ کتاب وسنت کے نظام کو قائم کرنے کے لیے کیوں نہ کھڑے ہوئے، اس کی حمایت کیوں نہیں کی! جماعتِ اسلامی اور جو بھی جماعت مسلمانوں کو ان کا یہ فرض یاد دلاتی ہے، وہ امت کی طرف سے تعاون کی مستحق ہے۔ وہ مستحق ہے کہ اس کی قدر کی جائے، اس کے کام میں اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۹۹ء)

مکمل اسلام

سوال: مشکوٰۃ شریف' باب الرقاق کی ایک حدیث نظر سے گزری جس کی وضاحت درکار ہے۔

حدیث کے مطابق قیامت کے روز جب اعمال نامہ پیش ہوگا تو سب سے پہلے نماز سفارش کرے گی، لیکن اللہ تعالیٰ اسے ایک طرف کھڑے ہونے کا حکم دیں گے۔ پھر روزہ سفارش کرے گا، اسے بھی اللہ تعالیٰ ایک طرف کھڑا ہونے کا حکم دیں گے۔ اسی طرح زکوٰۃ' حج' خیرات وصدقات اور دوسرے نیک کام سفارش کریں گے مگر ان کو ٹھیرنے کا حکم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کی گواہی پر بندے کی جزا کا فیصلہ صادر نہیں فرمائیں گے۔ سب سے آخر میں اسلام آئے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں، تم آؤ، تمھاری گواہی پر میں بندے کو پکڑ لوں گا یا چھوڑ دوں گا۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔

کیا کلمہ' نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج سارے مل کر اسلام نہیں ہیں؟ یہاں اسلام کا الگ سے ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اور قرآن پاک کی آیت بھی درج کی گئی ہے۔ کیا اسلام ان ارکان اسلام سے الگ کوئی چیز ہے یا ان عبادات سے اعلیٰ اور افضل عمل ہے؟

جواب: آپ نے جس حدیث کے بارے میں سوال کیا ہے اس میں اسلام سے مراد اطاعت ہے۔ اللہ کا اصل مطلوب مکمل اطاعت ہے۔ آخرت میں سب سے پہلے یہ بات دیکھی جائے گی کہ جو شخص نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ لے کر آیا ہے وہ پورے اسلام میں بھی داخل ہوا تھا یا نہیں۔ اگر ایک انسان نے پورے پورے اسلام کو قبول کیا تھا تو اس کی نجات کا فیصلہ ہو جائے گا اور اس کے بعد اس نے جو عبادات بھی بجالائی ہوں گی، ان کا ثواب اسے ملے گا اور جو گناہ کیے ہوں گے ان کی وجہ سے وہ عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس کے بعد نیکیوں اور بدیوں کو میزانِ عمل میں تول کر فیصلہ کرلیا جائے گا کہ اس نے جنت میں کس طرح سے اور کب داخل ہونا ہے اور جنت میں اس کا مقام کیا ہوگا۔ لیکن اگر اس نے پورے اسلام کو قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی صرف چند چیزوں کو قبول کیا ہے تو پھر وہ چند چیزیں کتنی ہی فضیلت کیوں نہ رکھتی ہوں، اس کے لیے موجبِ نجات نہ ہوں گی۔ اس لیے کہ وہ عبادات مکمل اسلام (اطاعت) کی روح سے خالی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، پورے دین کو قبول کرنے، اسے واجب الاطاعت سمجھنے اور اس کو اپنانے کا عہد کرنے کے بعد ہی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ معتبر ہیں۔ اس کے بغیر نہیں۔

عہدِ رکنیت کی خلاف ورزی پر کفارہ!

سوال: تحریکِ اسلامی نے مقامی طور پر اس سال بھی اپنا سالانہ منصوبۂ عمل بنایا ہے۔ اس منصوبۂ عمل میں اس دفعہ یہ اضافہ بھی ہے کہ کفارے کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ تفصیل یوں ہے کہ ہر رکن کا فرض ہوگا کہ وہ اپنی زندگی، دینِ اسلام کے مطابق ڈھالنے، نظم وضبط اور سمع واطاعت کی پابندی کرتے ہوئے گزارے گا۔ رکنیت کے وقت وہ اس کا اقرار بھی کرتا ہے کہ اس نے یہ اصول پڑھ لیے ہیں اور وہ ان کا پابند رہے گا۔ اب نئے منصوبۂ عمل میں اس پس منظر کے تحت یہ بات بھی شامل کی گئی ہے کہ اگر کوئی رکن نظم وضبط وغیرہ کی پابندی نہیں کرتا، جیسے اجتماعات میں دیر سے آنا، نہ آنا یا بدگوئی اور ناظم سے جھگڑنے وغیرہ کا عمل کرنا ہے تو اس پر

کفارہ عائد کیا جائے گا۔ اس لفظ پر چند حضرات کو اعتراض ہے۔ مثلاً یہ دینی اصطلاح ہے اور صرف انھی مخصوص معنوں میں استعمال ہوتی ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، اس کو کسی اور جگہ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ 'کفارہ' کا لفظ استعمال کرنے سے اعمال کو حرام وحلال کرنے کا کام تحریکِ اسلامی نے اپنے ذمے لے لیا ہے، جب کہ یہ صرف اللہ کا حق ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا درج بالا صورت میں دی گئی شکلوں میں 'کفارہ' کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں اور اگر نہیں کیا جاسکتا تو مناسب لفظ کیا ہوگا؟ اگر استعمال کیا جاسکتا ہے تو کفارہ کی کیا شکلیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: جب ایک شخص اطاعتِ نظم کا عہد کرتا ہے تو وہ شرعاً اپنے عہد کو پورا کرنے کا پابند ہو جاتا ہے۔ یہ ایک شرعی ضابطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَـا اَیُّهَـا الَّـذِیْـنَ آمَـنُـوْا اَوْفُـوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ ۵:۱) اے ایمان والو! عقدوں کو پورا کرو (یعنی وعدوں کو)۔

حدیث شریف میں آتا ہے: لَا اِیْـمَـانَ لِـمَـنْ لَّااَمَـانَةَ لَـهٗ وَلَا دِیْـنَ لِمَنْ لَّاعَهْدَ لَـهٗ (مشکوٰۃ) جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں، اور جو عہد کا پاس نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔

ظاہر بات ہے کہ 'دین' کو ایک انسان عہد کے ذریعے ہی اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے دل اور زبان سے دین میں داخل ہونے اور اس کا پابند رہنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پس اگر ایک انسان 'عہد' پر قائم نہیں رہ سکتا تو اس کے بارے میں کیسے اطمینان کیا جاسکتا ہے کہ اس نے جس دین کو اختیار کیا ہے اس پر قائم رہے گا۔ اس کے برعکس اس سے ہر وقت خطرہ رہے گا کہ وہ جس دین میں داخل ہوا ہے اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دین میں داخل ہو جائے گا۔ ایک آدمی کا وزن اس کے قول وقرار سے پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر شریعت میں عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ اہلِ ایمان کی مستقل صفت کے طور پر اسے ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْـمُـوْفُـوْنَ بِـعَهْـدِهِـمْ اِذَا عَـاهَـدُوْا (البقرہ ۲:۷۷) وہ جب عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔

ایمان باللہ، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ کے بعد اس صفت کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآنِ پاک میں اسلوب بدل بدل کر کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تو ہر عہد کا حکم ہے۔ چاہے ایسا عہد ہو جس کے کرنے نہ کرنے کا ایک انسان کو اختیار ہو مثلاً زید کو اختیار ہے کہ وہ عمرو سے عہد کر لے کہ وہ فلاں چیز کو اتنے روپے میں خریدے گا، وہ کسی اور کو فروخت نہ کرے، تو اگر چہ ابھی سودا ہوا نہیں لیکن اخلاقاً زید پابند ہے کہ وہ اپنا عہد پورا کرے اور اس سے سودا خریدے۔ لیکن ایک ایسا عہد جس کو پورا کرنا اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کرنا قرار پاتا ہو تو اس عہد کی خلاف ورزی پر گناہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر مسلمان پر فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے فرائض ہم پر عائد ہیں، ہم نے ایمان لا کر انھیں پورا کرنے کا عہد کیا ہے۔ ایمان دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس بات کا معاہدہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی حکومت کو مانتا ہوں اور اس کے مقابلے میں تمام حکومتوں کا انکار کرتا ہوں۔ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا یہی مطلب ہے۔ الٰہ، معبود اور حاکم کو کہتے ہیں، اور رسول نمایندے کو کہتے ہیں۔ اس لیے کلمۂ طیبہ کے معنی یہ ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی حاکمیت کو نہیں مانتا بلکہ صرف اس حکومتِ الٰہیہ کو مانتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے زمین میں قائم کیا ہے۔ یہ نظام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب وسنت کی شکل میں ہمیں دیا، اسے عملاً نافذ فرمایا، انسانوں کو اس نظام پر ایمان لانے کی دعوت دی، اس کے لیے جہاد وقتال کیا اور فرمایا: اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ (بخاری، کتاب الجہاد) جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

اس نظام کی خاطر جان دینا شہادت ہے: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةَ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جس نے اس لیے قتال کیا کہ اللہ کا نظام بالاتر ہو تو وہ لڑائی فی سبیل اللہ ہے۔

گویا کہ یہ نظام ہماری جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس نظام پر جان و مال، بیوی، عزیز و اقارب، کاروبار وغیرہ سب چیزیں قربان کی جائیں گی۔ یہ اولین فرض ہے باقی فرائض اس کے

بعد ہیں۔لیکن اس وقت یہ نظام معطل ہے اور وہ نظامِ جماعت بھی باقی نہیں جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا جس نظامِ جماعت کی بدولت تمام مسلمان ایک امت ہوتے ہیں اس نظام کے معطل ہو جانے کے بعد ہم عملاً دوسرے نظاموں کے مطیع ہو کر رہ گئے ہیں، جو ہمارے ایمان کے منافی ہے۔اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ مروجہ نظاموں کے مقابلے میں اللہ کے نازل کردہ نظام کو قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔لیکن افسوس ہے کہ تمام مسلمانوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔جن خوش قسمت اہلِ ایمان کو اس کا شعور ہے وہ اگر فرداً فرداً اس کام کو کریں تو ظاہر بات ہے کہ انفرادی کام نہ تو دیرپا ہوتا ہے نہ موثر۔اس لیے ضروری ہوا کہ وہ منظم ہوں اور ایک جماعت کی شکل میں اس کام کو کریں۔اس جماعت کو قائم کرنا قرآنِ پاک کی رو سے بھی ان پر فرض ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران ۳:۱۰۴) تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔

ایسی جماعت میں شامل ہونا، جو خیر کی طرف دعوت دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، قرآن پاک کی رو سے کمالِ فلاح کا موجب ہے۔پس اقامتِ دین کے فریضے کو ادا کرنے کے لیے جماعت بنانا، اس جماعت میں شامل ہونا عقلاً بھی ثابت ہے اور قرآن وسنت کی نصوص بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ایسی صورت میں اقامتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لے کر ایک انسان اس عہد کو بھی پورا کرتا ہے جو اس نے جماعت کے ساتھ اس میں شامل ہوتے وقت کیا ہوتا ہے۔لیکن یہ عجیب وغریب صورتِ حال ہے کہ ایک انسان جماعت میں شامل ہو اور نظم کی اطاعت نہ کرے۔ایسی صورت میں اسے سزا دی جاتی ہے معطل یا ڈسچارج کر دیا جاتا ہے۔بعض اوقات جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں اسے پھانسی دے دی جاتی ہے۔اسے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دی جاتی ہے اور اسے کوئی بھی شخص نامعقول نہیں قرار دیتا۔قرآنِ پاک

بھی ایسی ہی مطیعِ فرماں فوج تیار کرتا ہے۔قرآن میں اہلِ ایمان کوتلقین کی گئی ہے: يَـــا اَيُّهَـــا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوْا اِذَا لَـقِيْتُـمُ الَّـذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفاً فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَـوْمَـئِـذٍ دُبُـرَهٗ اِلَّا مُتَحَرِّفاً لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزاً اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَـأْوٰهُ جَهَـنَّـمُ وَ بِـئْـسَ الْمَصِيْرُ (الانفال ۸: ۱۵-۱۶) اے ایمان والو! جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہوتو ان کے مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرو۔جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لیے،تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا،اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے۔

احادیث میں میدانِ جنگ سے بھاگنے کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔(بخاری، کتاب الوصایا، کتاب الحدود، کتاب المحاربین)

یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دور کے ساتھ خاص ہے اس لیے کہ آپؐ کے دور میں اس حکم کی وجہ اسلامی نظام کے لیے جان کی بازی لگانا تھا اور یہ سبب اس وقت سے قیامت تک کے لیے موجود ہے۔اس نظام کو قائم کرنے یا قائم رکھنے کی خاطر جو چھوٹی بڑی جماعت قائم ہوگی اور جو بھی چھوٹا بڑا امیر ہوگا معروف میں اس کی اطاعت کرنا جماعت میں شامل ہونے کے بعد فرض ہوگا۔اس کی اطاعت سے نکلنا، جہاں اقامتِ دین کے مقصد کو نقصان پہنچانا ہے، وہیں اپنے عہد کی خلاف ورزی بھی ہے جو ایک ایمانی اور اخلاقی کمزوری ہے۔احادیث میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَ كَرِهَ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَاسَمْعَ وَلَا طَاعَةَ [(بخاری، کتاب الاحکام) مسلمان پر سمع وطاعت لازم ہے، خواہ اس کا جی چاہے یا نہ چاہے، جب تک اُسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اگر اُسے معصیت کا حکم دیا گیا تو پھر نہ سمع ہے اور نہ طاعت]

(۲) مَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ وَمَنْ عَصَى الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِيْ. اِنَّمَا الْاِمَامُ جُـنَّةٌ يُـقَاتَلُ مِنْ وَّرَائِهٖ وَ يُتَّقٰى بِهٖ فَاِنْ اَمَرَ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَ هُدًى فَاِنَّ لَهٗ بِذٰلِكَ اَجْراً

وَّ اِنْ قَالَ بِغَیْرِہٖ فَاِنَّ عَلَیْهِ مِنْهُ [(بخاری، کتاب الجہاد، باب ۱۰۹) جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ امام کی مثال ڈھال کی ہے، جس کی آڑ لے کر لڑا جاتا ہے اور اس کے ذریعے اپنی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگر امیر تقویٰ و پرہیز گاری کا حکم دیتا ہے تو اُسے ثواب ملے گا اور اگر ناجائز کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی گناہ میں حصہ دار ہوگا]

(۳) مَنْ رَاٰی مِنْ اَمِیْرِہٖ شَیْئاً یَّکْرَهُهٗ فَلْیَصْبِرْ۔ فَاِنَّهٗ لَیْسَ اَحَدٌ یُّفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شِبْراً فَیَمُوْتُ اِلَّا مَاتَ مِیْتَةَ الْجَاهِلِیَّةِ [(بخاری، کتاب الفتن) جو اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ عادت دیکھے تو صبر کرے، کیونکہ کوئی بھی جماعت سے ایک بالشت برابر دور ہو جائے اور اس حالت میں مرجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے]

ان احادیث میں وضاحت سے کہہ دیا گیا ہے کہ اگر امیر معصیت کا حکم نہ دے تو اس کی اطاعت واجب ہے، چاہے طبیعت کو پسند ہو یا ناپسند۔ ایسی صورت میں حکم کی خلاف ورزی کرنا اور جماعت سے جدا راستہ اختیار کرنا جاہلیت کا طریقہ ہے۔

اس ساری تمہید کا مقصد دراصل یہ سمجھانا ہے کہ نظم کی خلاف ورزی کرنا گناہ ہے اور ایمان واخلاق کے منافی ہے۔ جس نے اس کی خلاف ورزی کی اس نے شریعت کی خلاف ورزی کی، اپنے عہد کی خلاف ورزی کی اور جماعت سے الگ راہ اختیار کر کے جاہلیت کا رویہ اپنایا۔

نظم کا کام ہے کہ لوگوں کو جماعت میں شامل کرتے وقت اچھی طرح پرکھ لے کہ وہ جماعت میں شمولیت کی حقیقت اور مقصد کو سمجھ گئے ہیں کہ نہیں۔ اور بعد میں ان کی نگرانی کرے کہ وہ اپنے عہد اور اس کی حقیقت کو یاد رکھے ہوئے ہیں کہ نہیں۔ وقتاً فوقتاً انھیں اپنے عہد کے تقاضے یاد دلائے اور کسی سے کوئی خلاف ورزی ہوتی ہو تو اسے مناسب انداز میں یاد دہانی کرائے یا تنبیہ کرے اور ضروری ہو تو اسے توبہ، استغفار اور صدقہ وخیرات کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کی طرف بھی متوجہ کرے۔ یہ کام ارکان اور جماعت کے مفاد میں ہوتا ہے اور اس پر ناراض ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیے۔ جس طرح مریض کو اس بات پر، کہ طبیب اس کا معائنہ کرتا ہے، دوا تجویز کرتا ہے، پرہیز کے لیے کہتا ہے، ناراض نہیں ہونا چاہیے اسی طرح

ارکان کو بھی نظم کے ذمہ داران سے ناراض نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بھی ان کی اصلاح کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ دراصل اس ناراضی کی وجہ امیر کو اپنے جیسا تصور کرنا اور مسئلے کو اس کی اطاعت اور عدمِ اطاعت تک محدود کر دینا ہے۔ حالانکہ اصل محور نظام ہے۔ نظام کی حیثیت تو اپنی جگہ قائم ہے اور اسی نظام کی خاطر جماعت کا قیام اور اس میں شمولیت کا عہد ہے۔ امیر اسی نظام کی وقعت قائم رکھنے کی خاطر نظم کی خلاف ورزی کا نوٹس لیتا ہے۔ اور اسی کی خاطر وہ دوسری تنبیہات کی طرح مزید تنبیہ کرتے ہوئے 'صدقہ' بھی عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کے گناہ کا اثر زائل ہو جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِىءُ الْمَاءُ النَّارَ (ترمذی، کتاب الایمان، باب ۸) صدقہ خطا کی حرارت کو اس طرح زائل کرتا ہے جس طرح پانی آگ بجھاتا ہے۔

صدقے کی اس عمومی تاثیر کی بنا پر 'صدقہ' کو کفارہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں یہ بات عام تھی، چنانچہ جب کعب بن مالکؓ کی توبہ قبول ہوئی تو انھوں نے عرض کیا: اِنَّ مِنْ تَوْبَتِيْ اَنْ اَنْخَلِعَ مِنْ مَّالِيْ صَدَقَةً لِلّٰهِ (بخاری) یہ میری توبہ کا حصہ ہے کہ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر کے اپنی ملکیت سے نکال دوں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کچھ مال اپنے پاس رکھ لو۔

اس بنا پر اسے کفارہ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم مناسب یہی ہے کہ آپ اسے کفارہ کا نظام کہنے کے بجائے صدقہ کا نام دے دیجیے۔ مذکورہ اصولوں کی بنا پر صدقہ کا نظام پہلے سے صلحا میں رائج رہا ہے اور اسی لیے عامۃ المسلمین میں یہ معروف ہے کہ کسی سے جب کوئی چھوٹا گناہ ہو جاتا ہے تو صدقہ کرتا ہے۔ مثلاً بعض علاقوں میں اب بھی رواج ہے کہ کسی سے قرآن پاک گر جائے تو وہ صدقہ کرتا ہے۔

ایسی صورت میں عہدِ اطاعت کی عمداً خلاف ورزی کرنا، بہرحال ایسا گناہ اور کمزوری ہے کہ اس سے استغفار بھی کیا جائے، صدقہ بھی دیا جائے اور دوسری نیکیاں بھی کی جائیں کہ اِنَّ

الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (ھود۱۱:۱۱۴) (نیکیاں برائیوں کوختم کر دیتی ہیں) کا قرآنی اصول اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس گناہ کے بارے میں متعین طور پر نص وارد نہیں ہے کہ بطور کفارہ [صدقے] یا کسی اور نیکی کا حکم دینا چاہیے تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔ لیکن اسے نظامِ کفارہ کا نام دینے کے بجائے 'نظام صدقات وحسنات' کا نام دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس سے مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور تعبیر پر کوئی اشکال بھی نہیں ہوگا۔

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۲ء)

نمازِ جمعہ سے پہلے مسجد میں اجتماع

سوال: مشکوٰۃ شریف کے باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی نماز سے پہلے حلقہ باندھ کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے (ابوداؤد، ترمذی)۔ اس حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ کیا جمعہ کی نماز سے پہلے مسجد میں جماعتِ اسلامی کا اجلاس منعقد کیا جاسکتا ہے؟ اگر کیا جاسکتا ہے تو اس حدیث کے آخری حصے کا مفہوم کیا ہے؟

جواب: نمازِ جمعہ سے پہلے، مسجد میں یا مسجد سے باہر، جماعت اسلامی کا اجتماع کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس اجتماع کو نمازِ جمعہ سے پہلے ختم کر دینا چاہیے۔ حدیث شریف میں نمازِ جمعہ سے پہلے حلقے بنا کر بیٹھنے کی جو ممانعت آئی ہے اس کا مقصد خطیب کا خطبہ سننے کی بجائے حلقے بنا کر بیٹھنے سے روکنا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمام لوگوں کو یکسو ہو کر ایک امام کی طرف توجہ کرنا چاہیے، نہ یہ کہ اپنی اپنی ٹولیاں بنالیں اور افتراق وانتشار کا مظاہرہ کریں۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۹۵ء)

خانقاہ کو مرکزِ ہدایت بنائیے

سوال: میں ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد صاحب تصوف میں سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ سے منسلک تھے۔ اپنی خانقاہ میں بندگانِ خدا کو تزکیۂ نفس کی طرف دعوت دیتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں ان کی وفات ہوئی۔ مریدوں نے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ان کو یہاں دفن کرنا چاہا تاکہ مزار بنایا جائے اور مجھے روایتی گدی نشین ہونے کو کہا۔ میرا تعلق اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ سے تھا اور مجھے خانقاہی تصوف سے اتفاق نہیں تھا۔ مریدوں کے بے حد اصرار کے باوجود والد صاحب کے جسد خاکی کو آبائی علاقے (دیر) میں دفن کیا گیا۔ تاہم اس کے باوجود بھی مریدوں نے مجھے سجادہ نشین تسلیم کیا۔ کچھ مدت تک اس سلسلے کو چلاتا رہا۔ مگر جب بھی تنہائی میں سوچتا تھا، میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ چنانچہ اس سلسلے کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن میرے بعد بھی ہماری اس خانقاہ میں عقیدت مند اس سلسلے کو چلاتے رہے۔ کچھ احباب نے مجھے مشورہ دیا کہ اس طرح دور رہ کر آپ خود تو مطمئن ہو جائیں گے مگر ان لوگوں کو اصلاح کی طرف کون لائے گا؟ چنانچہ اسی وجہ سے ۱۹۹۵ء سے میں نے باقاعدہ اپنی خانقاہ کو سنبھالا اور ذکر و فکر کی ان مجلسوں کو اب درسِ قرآن و حدیث کے حلقے میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تاہم اس کے باوجود مرید والد صاحب کا عرس باقاعدہ مناتے ہیں۔ جب سے میں آیا ہوں تب سے وہ خرافات جو اِن عرسوں میلوں میں ہوتے تھے، نہیں ہیں۔ قرآن خوانی اور نعت خوانی کے علاوہ علما کی تقریروں کے بعد محفلِ ذکر اور آخر میں اجتماعی دعا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چند سوالات کا تسلی بخش جواب چاہتا ہوں:

۱۔ کیا تصوف کے اس سلسلہ (قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، چشتیہ وغیرہ) کو باقاعدہ جاری رکھنا کوئی دینی خدمت ہے؟ کیا یہ جدوجہد دینِ الٰہی کی جدوجہد کے متبادل کے طور پر جائز ہے؟

۲۔ عرس ختم پر جمع ہونے والی رقم کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے علاوہ بھی مریدین نذرانہ پیش

کرتے ہیں۔ میرے اصرار کے باوجود وہ ہدیے کے طور پر دیتے ہیں جب کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نذرانہ ہی ہے مگر میری وجہ سے وہ ہدیہ کرتے ہیں۔ کیا یہ لینا میرے لیے جائز ہے؟

۳- عقیدت مند روحانی وجسمانی بیماریوں کے سلسلے میں دم تعویذ کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ قرآن وسنت کہاں تک اس کی اجازت دیتا ہے؟

۴- واضح رہے کہ اس میں مستورات کے بھی مسائل ہوتے ہیں۔ کیا غیر عورت سے اس قسم کی گفتگو کرنا شادی بیاہ، پسند ناپسند وغیرہ کے مسائل جائز ہیں؟

۵- مریدین ریاضت کے لیے کچھ خاص قسم کے اوراد کی اجازت طلب کرتے ہیں مثلاً حزب البحر، ختمِ خواجگان، درود تاج اور اس قسم کے دوسرے اوراد جن کے بارے میں میرے علم کے مطابق قرآن وسنت میں کوئی واضح ثبوت نہیں۔ یہ اوراد واشغال کرنا یا ان کی اجازت دینا کہاں تک درست ہے؟

۶- میں شادی شدہ ہوں اور چار بچے ہیں۔ میری یہ خاندانی شادی ہے۔ مادری زبان پشتو ہے۔ لوگوں کے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے یہاں بڑے مسائل ہیں جب کہ اس سلسلے میں زیادہ تعلق مردوں کے ساتھ عورتوں سے بھی رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان مرید عورتوں کی تربیت واصلاح کے لیے تعلیم یافتہ خاتون سے دوسری شادی کرلوں۔ کیا اس نیت سے ایسا کرنا جائز ہے جب کہ اس کے علاوہ اور کوئی شرعی ضرورت نہیں؟ کیا اس کے لیے پہلی بیوی سے اجازت شرط ہے؟

جواب: آپ کے خیالات گراں قدر اور وقیع ہیں اور ہمیں خوشی ہوئی کہ آپ کتاب وسنت کی روشنی میں سوچ بچار کرنے اور شرعی حدود واحکام معلوم کر کے ان کے مطابق چلنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور آپ کے ذریعے مسلمانوں کو رشد وہدایت کا فیض پہنچائے۔ آمین! آپ کے سوالات کا جواب حسب ذیل ہے:

۱- آپ خانقاہی نظام کو شرعی حدود کے مطابق چلائیں۔

۲- قرآن وسنت کا وسیع مطالعہ کریں اوراس کی روشنی میں خلقِ خدا کی راہنمائی فرمائیں۔

۳- سیرت النبیؐ، سیرتِ صحابہ، سلفِ صالحین، ائمہٗ مجتہدین اور بزرگانِ دین کے سچے اور صحیح واقعات کا مطالعہ کر کے متعلقین کوان سے فیض یاب کریں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اقامتِ دین کی جو جدوجہد شروع کی ہے وہ اس دور میں قربِ الٰہی کا اصل ذریعہ ہے کہ یہ وقت کا تقاضا ہے، یعنی اولیں فرض یہ ہے کہ مسلمان حکومتِ الٰہیہ قائم کریں اور اسلامی نظام نافذ کرائیں۔ جواس جدوجہد کا تارک ہے اسے محض ذکر واذکار اور وظائف سے قربِ الٰہی نہیں مل سکتا اور جو یہ کام کرتا ہے اس کے لیے قرآنِ پاک کی تلاوت، مسنون دعائیں اوراذکارِ مسنونہ کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک نوجوان اور خوب صورت انسان کا صاف ستھرے اجلے کپڑے پہننا اور تیل کنگھی اور خوشبو لگا کر جسم کو خوبصورت بنانا، لیکن جو فریضہٗ وقت کا تارک ہو، اس کے لیے اوراد واذکار اور اشغال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ٹی بی کے مریض کو خوبصورت اور اجلے کپڑے پہنانا اور تیل سرمہ لگا کر کنگھی کر کے بناؤ سنگھار کرنا۔

۴- آپ مروجہ طریقوں سے ہٹ کر اپنے مریدین کے لیے درسِ قرآن، درسِ حدیث، مطالعہٗ لٹریچر، درسِ سیرت، بزرگانِ دین کے حالات پر مشتمل تقاریر اور مواعظ کے پروگرام رکھیں۔

۵- تلاوتِ قرآن اور اذکارِ مسنونہ کو معمول بنائیں۔ حزب البحر کا معمول درست ہے۔ اس میں مسنون اذکار ہیں۔

۶- والد صاحب کی یاد میں جلسہ ضرور کریں لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے عرس کا نام دے کر وفات کی مقررہ تاریخ پر نہ کریں، آگے پیچھے کر لیا کریں۔ عرس کا نام رکھنا چاہیں تو اس میں کوئی خلافِ شرع بات نہیں ہونی چاہیے۔ شرکیہ باتیں اور بدعات کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے۔

۷- دم کرنا اور تعویذ لکھ کر دینا جائز ہے۔ آپ نذرانے نہ وصول کریں۔ ہدیہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن صرف نام کی تبدیلی کافی نہیں ہے۔ اس لیے آپ اسے اعانت اور عطیات کے نام سے وصول کریں اور مہمانوں کی میزبانی اور درسِ قرآن وحدیث کے اخراجات

ان سے پورے کریں۔لوگوں کو کہہ دیں کہ وہ زکوٰۃ وصدقات نہ دیں بلکہ عطیات دیں۔

۸۔ مستورات سے بقدرِ ضرورت گفتگو ہوتو وہ بھی پردے کے پیچھے ہونی چاہیے اوران کو ایسے کاموں کا ذکر کرنے سے منع کردیں جن سے جنسی جذبات ابھرتے ہوں۔صرف اوراد اور وظائف کی تعلیم دیں۔تلاوتِ قرآن اوراذکارِ مسنونہ اور دیگر اوراد کو معمول بنانا اورلوگوں کو کسی ایک معمول کا مشورہ دینا جائز ہے۔لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ انتظامی چیز ہے اس میں شرعاً کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔لیکن جس طرح دفتری کاموں کے لیے ملازمین اپنا نظام الاوقات بنا سکتے ہیں، کسان زراعت کے لیے ایک پروگرام ترتیب دے سکتے ہیں، اسی طرح آپ اپنے مریدین کو کوئی معمول دے سکتے ہیں تاکہ وہ اس کے مطابق تلاوت اور ذکر واذکار کریں اوراس طرح سے ان کے روحانی اثرات ان کی زندگیوں میں مرتب ہوں۔

۹۔ آپ نئی شادی کرنا چاہتے ہیں تو اپنی بیوی کے مشورے سے کریں تاکہ آپ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔اپنی سابقہ رفیقۂ حیات کے جذبات اور مشورے کا خیال رکھنا اوراس کی رضامندی سے قدم بڑھانا اچھی بات ہے کہ اسلام میں وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کی تلقین ہے۔آپ کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ آپ جماعتِ اسلامی کے مشن کے لیے خانقاہ کو ذریعہ بنا سکیں۔

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۹۸ء)

خانقاہ کی شرعی حیثیت

سوال: ترجمان القرآن (مئی ۱۹۹۸ء) میں رسائل ومسائل کے تحت خانقاہ کو مرکز ہدایت بنایئے پڑھ کر چند اشکال پیدا ہوئے۔کیا خانقاہ کی کوئی شرعی حیثیت ہے؟ خانقاہ کے نظام کو تقویت دینا کیا قبر پرستی کی قبیح رسم کو تقویت دینا نہیں ہے؟ کیا عُرس منانے کی اجازت دینے سے عرس کے موقع پر ہونے والی خرافات بالخصوص عورتوں کی شرکت جیسے مسائل کو

جواز نہ مل جائے گا؟ جواب واضح نہیں ہے۔ وضاحت فرمادیں۔

جواب: جہاں تک خانقاہی نظام کا تعلق ہے تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ تربیت کے لیے اپنے اپنے حالات اور ادوار کے لحاظ سے انتظامی تدابیر اختیار کرنا جائز ہے۔ بدعت کا تعلق انتظامی طریقوں سے نہیں ہوتا۔ مثلاً جماعت اسلامی ایک تنظیم ہے۔ اس کا ایک تربیتی پروگرام ہے یعنی ہفتہ وار اجتماعات، ماہانہ اجتماعی مطالعۂ لٹریچر وغیرہ۔ تبلیغی جماعت کا بھی ایک طریق کار ہے۔ اسی طرح علما کا اپنا تعلیمی سلسلہ ہے اور صوفیا کا اصلاحِ نفس کے لیے الگ لائحۂ عمل ہے۔ ان تمام طریقوں کے ذریعے، اگر کوئی شخص کتاب وسنت کے خلاف کوئی بات نہیں بتلاتا تو یہ بدعات کا ارتکاب نہیں ہوگا اور یہ طریقے جائز ہوں گے۔ اس لیے کہ ان سب کا مقصد اصلاحِ نفس اور تعلیم و تربیت ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ایسی تدبیر جائز ہے جو ممنوع نہ ہو اور اسے صرف انتظامی حیثیت حاصل ہو، اسے عبادت کا درجہ نہ دیا جائے۔ آپ نے اگر جواب زیادہ غور سے پڑھا ہوتا تو آپ کو اشکال پیش نہ آتا۔ جواب میں ایسی تمام چیزوں سے جو خلافِ شرع ہیں، اجتناب کی ہدایت تھی۔ قبروں کو پختہ بنانا، ان پر کتبے تعمیر کرنا اور مروجہ عرسوں کو جائز نہیں قرار دیا گیا بلکہ ان سارے کاموں کو شریعت کے مطابق چلانے کی تلقین کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ جماعتِ اسلامی کے کام کے لیے ان امور کو جماعتِ اسلامی کے طریقِ کار کے مطابق انجام دیا جائے نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ والد صاحب کے تمام مریدوں کو درسِ قرآن وحدیث، سیرت النبیؐ اور سیرتِ صحابہ وتابعین سے وابستہ کیا جائے۔ جواب پہلے بھی واضح تھا۔ امید ہے اب آپ پر بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۹۸ء)

تقرّب اور ذکرِ الٰہی

سوال: خانقاہ کو مرکز ہدایت بنائیے (مئی ۱۹۹۸ء) کے عنوان کے تحت آپ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں تقرب الی اللہ کا انحصار (محض) اللہ کے ذکر پر نہیں بلکہ اس کا اصل ذریعہ اقامتِ دین کی اس جدوجہد پر ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے شروع کی ہے اور جو فریضۂ وقت ہے۔ اس میں جو باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں وہ یہ ہیں:

۱- یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا ذکر پہلے تو ذریعۂ تقرب تھا لیکن اب نہیں رہا؟

۲- یہ فریضۂ وقت کیا ہوتا ہے جس پر اب تقرّب الی اللہ کا انحصار ہے؟ اس فریضے کا تعین اور تجدید کون کرتا ہے؟ کیا یہ فریضہ ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳- اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ اقامتِ دین وہ فریضۂ وقت ہے جس کا تعین اور ابتدا مولانا مودودیؒ نے کی ہے۔ اس سے ذہن میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں، مثلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ چودہ صدیوں تک صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ اربعہ اور دیگر اسلاف ایسی بنیادی بات سے بے خبر رہے ہوں جو مولانا مودودیؒ کے نزدیک تقرّب الی اللہ کا اصل ذریعہ ہے؟ اور اگر مولانا مودودیؒ کی رائے اجتہاد پر مبنی ہے تو جماعتِ اسلامی کے چند ہزار ارکان کے علاوہ کیا کروڑوں مسلمانانِ عالم جو مولانا مودودیؒ کی اس رائے سے واقف یا متفق نہیں ہیں تو کیا وہ سب تقرّب الی اللہ سے محروم ہوں گے؟

جواب: میری بات کو آپ غلط سمجھے ہیں۔ میں نے یہ قطعاً نہیں کہا کہ پہلے زمانے میں ذکرِ الٰہی قربِ الٰہی کا ذریعہ تھا اور اب نہیں رہا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ جب ایک آدمی فرائض کا تارک ہو تو مستحبات کے ادا کرنے سے قربِ الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس وقت اللہ کی شریعت معطل ہے، اس کو قائم کرنا مسلمانوں کی اولین ذمہ داری اور فریضہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شریعت قائم فرما دی تھی اور وہ اس وقت تک قائم رہی جب تک خلافت قائم رہی۔ جب خلافت ختم

ہوگئی تو شریعت کا نظام بھی انگریزوں اور کفار کے ہاتھوں معطل ہوگیا۔ دورِ غلامی میں شریعت معطل رہی۔ جب آزادی حاصل ہوئی تو چاہیے تھا کہ شریعت کا نظام بحال کر دیا جاتا لیکن افسوس ہے کہ وعدوں اور نعروں کے باوجود شریعت کا نظام ابھی تک بحال نہیں ہوا۔ شریعت کو بحال کرانا فرض ہے، یہ تمام علما کا متفقہ نظریہ ہے۔ یہ ہر مسلمان کا اولین فرض اور اس کے مسلمان ہونے کا تقاضا ہے۔ یہ شعور بیدار ہو تو شریعت پامال نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے منظّم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں ہر طرح کی قربانیاں بھی آئیں گی جس طرح خود اللہ کے رسولؐ اور ان کے ساتھیوں نے پیش کیں۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ دین کا ایک بنیادی فریضہ ہے۔ اگر ایک آدمی زبانی ذکر واذکار کرتا ہے لیکن نفاذِ شریعت سے غیر متعلق ہے، اس میں وہ اہلِ حق سے تعاون نہیں کرتا تو پھر اس کا ذکر وفکر اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت نہیں پاسکتا۔ امام حسن بصریؒ آیت فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ ...... کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فَاذْكُرُونِي فِيمَا افْتَرَضْتُ عَلَيْكُمْ أَذْكُرْكُمْ فِيمَا أَوْجَبْتُ لَكُمْ عَلٰى نَفْسِي، مجھے ان فرائض کے ذریعے یاد کرو جو میں نے تم پر عائد کیے ہیں تو میں تمھیں ان اعزازات اور ثوابوں کے ذریعے یاد کروں گا جو میں نے اپنے اوپر تمھارے لیے لازم کیے ہیں۔

سعید بن جبیرؒ مشہور تابعی ہیں فرماتے ہیں: اُذْكُرُونِي بِطَاعَتِي أَذْكُرْكُمْ بِمَغْفِرَتِي[1] یعنی تم مجھے میری اطاعت کے ذریعے یاد کرو میں تمھیں اپنی مغفرت کے ذریعے یاد کروں گا۔

آپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا مختصر جواب یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اقامتِ دین کے فریضے کو اپنے دور میں شروع کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی تحریک اقامتِ دین کے تذکرے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے یہ کام کسی نے نہیں کیا، یہ کام تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ آپؐ کے بعد صحابۂ کرام نے دنیا میں دین کو غالب کیا۔ اس وقت دنیا میں ساٹھ کے قریب مسلمان ریاستیں ہیں۔ پہلے یہ سب ایک حکومت کی شکل میں تھیں۔ دورِ زوال میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کی سازشوں کا شکار ہوکر اس ایک ریاست کو ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا اور اکثر ریاستوں

۱- تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت ۱۵۲۔

میں شریعت کو بھی معطل کر دیا۔لہٰذا اب ضروری ہے کہ ان تمام ریاستوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ تسلیم کی جائے اور ان میں شریعت بھی جاری کی جائے۔اس کے لیے جدو جہد کرنا فریضۂ وقت ہے۔فریضۂ وقت سے مراد یہ ہے کہ نماز کے وقت نماز پڑھی جائے، رمضان المبارک کا مہینہ آئے تو روزے رکھے جائیں۔حج کا موقع آئے تو حج کیا جائے اور جہاد کا وقت آئے تو جہاد کیا جائے۔جہاد کی وجہ سے بعض اوقات نماز بھی قضا ہو جاتی ہے۔جیسے غزوۂ احزاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ عصر اور بعض روایتوں میں آتا ہے ظہر، عصر، مغرب، عشا چھوٹ گئی تھیں جو کہ عشا کے وقت آپؐ نے ادا کیں۔(مسند احمد)

نفاذِ شریعت کو میں نے جو وقت کا فرض کہا ہے وہ اس معنی میں ہے کہ تمام مسلمانوں کو اولین توجہ نفاذِ شریعت کی طرف دینی چاہیے۔دوسری چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔فرائض کا تعین تو اللہ تعالیٰ نے خود کر دیا ہے اور ان کے اوقات بھی اس نے متعین کر دیے ہیں۔جب دین قائم ہو تو اسے قائم رکھنا فریضۂ وقت ہے اور جب قائم نہ ہو تو پھر اسے قائم کرنا فریضۂ وقت ہے۔اللہ تعالیٰ نے جو دین نازل فرمایا ہے وہ قائم کرنے کے لیے نازل فرمایا ہے،اس میں نماز، روزہ، حج زکوٰۃ بھی شامل ہیں اور نکاح وطلاق، وراثت، تجارت، اجارہ، عدالت اور سیاست سب شامل ہیں۔قرآنِ پاک میں ان سب کا ذکر ہے۔ان کو قائم کرنا اور ان کے مطابق معاشرے کو استوار کرنا اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔جب تک ہم اس دین کو قائم نہیں کریں گے اس وقت تک اس کو قائم کرنے کا بوجھ ہماری گردنوں پر رہے گا۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو قائم اور غالب کرنے کی سعادت سے نوازے۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۸ء)

☆......☆......☆

مقالات

اجماعِ امت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے سے لے کر قیامت تک دنیا بھر کے انسانوں کے لیے نبی اور رسول ہیں۔ آپؐ پر اور آپؐ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لانا، اس کے مطابق زندگی بسر کرنا اور معاشرے سے تمام نظاموں کو اکھاڑ پھینک کر ان کی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام کو قائم کرنا ایمان والوں پر فرض ہے۔

☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۶۳ سالہ زندگی کے ۲۳ سالوں میں انسانوں کو اس نظامِ اسلامی پر ایمان لانے کی دعوت دی اور ایمان کی بنیاد پر ایک امت تشکیل دی جسے لے کر آپؐ نے دعوت وتبلیغ اور جہاد کے عظیم کام سرانجام دیے اور ایک اسلامی ریاست قائم کر کے اس میں اللہ کے دین کو مکمل طور پر نافذ کر دیا۔

☆ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد سے انسان اس بنا پر ایمان لانے سے معذور نہیں ہیں کہ ان تک آپؐ بنفسِ نفیس دین لے کر نہیں پہنچے، نہ وہ شریعتِ اسلامیہ کے واجب العمل ہونے کا اس بنیاد پر انکار کر سکتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں اور لوگوں تک خود دین لے کر نہیں پہنچے تو پھر ان سے اس دنیا میں ایمان وعمل کا مطالبہ کیوں ہے اور آخرت میں ان سے اس کی باز پرس کیوں ہوگی؟ اس سوال کا جواب ہر وہ شخص، جو دین کا تھوڑا سا علم بھی رکھتا ہے، یہ دے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کو لے کر آئے ہیں وہ محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا اور آپؐ کا قائم مقام خلیفہ یا خلفا آپؐ ہی کی طرح اس کے مبلغ اور داعی اور علمبردار ہیں اور ان کا اس دین کو پیش کرنا اسی طرح ہے جس طرح خود آپؐ کا پیش کرنا اور ان کا پیش کرنا بھی اسی طرح اتمامِ حجت ہے جس طرح آپؐ کا پیش کرنا۔ اس لیے وہ لوگ جنھوں نے آپؐ کا زمانہ نہیں پایا، معذور نہیں سمجھے جائیں گے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو اس دین کے مسلمات میں سے ہیں اور ان کا کوئی بھی شخص، جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، منکر نہیں ہے۔ ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک ہر دور میں آپؐ کا کوئی نہ کوئی قائم مقام ہونا چاہیے جس کی بات دین میں حجت کی حیثیت رکھتی ہو، تا کہ انسانوں پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت ہو سکے۔ اس کے بعد مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ آپؐ کا قائم مقام خلیفہ اور نائب کون ہے؟ اس کا فیصلہ ہو جائے تو 'اجماعِ امت' کے مسئلے کی ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

جب ہم کتاب وسنت، نظر وفکر اور تاریخِ اسلام کی روشنی میں آپؐ کے نائب کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ امتِ مسلمہ اور اس کے ماہرین اہلِ علم ہیں۔ دین کا وہ حصہ جس کے لیے علمی گہرائی کی ضرورت نہیں، اس میں پوری امتِ مسلمہ اور وہ حصہ جس میں علمی گہرائی کی ضرورت ہے، اس میں ماہرینِ شریعت آپؐ کے نائب ہیں اور ان دونوں حصوں میں آپؐ کے یہ نائبین انسانوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پوری طرح حجت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً (البقرۃ ۲:۱۴۳) اور اسی طرح تو ہم نے تم (مسلمانوں) کو ایک امتِ وسط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں: اِحْتَجَّ جُمْهُوْرُ الْمُعْتَزِلَةِ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ عَلٰى اَنَّ الْاِجْمَاعَ حُجَّةٌ (البحر المحیط، ج ۱، ص ۴۲۱) جمہور معتزلہ (تک) نے اس آیت سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے۔

گواہ وہ ہوتا ہے جس کی بات پر نزاع کا فیصلہ ہوتا ہو۔ اس آیت میں امتِ مسلمہ کو امتِ وسط قرار دے کر اس کی گواہی کو دنیا بھر کے انسانوں پر حجت قرار دیا گیا کہ وہ اپنے نزاعات کا فیصلہ ان کی گواہی کی روشنی میں کریں۔ ان کی گواہی جسے حق اور سچ کہے وہ حق اور سچ ہے اور جسے جھوٹ اور ناحق کہے وہ جھوٹ اور ناحق ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ اپنی گواہی

رسولؐ کی گواہی کی روشنی میں دیں گے جس سے ان کے مرتبے کا تعین ہو جاتا ہے کہ ان کا مرتبہ کتاب وسنت کے بعد ہے:

اِنَّهَا الْاُمَّةُ الْوَسَطُ الَّتِیْ تَشْهَدُ عَلَی النَّاسِ جَمِیْعاً فَتُقِیْمُ بَیْنَهُمُ الْعَدْلَ وَالْقِسْطَ وَ تَضَعُ لَهُمُ الْمَوَازِیْنَ وَالْقِیَمَ وَ تُبْدِیْ فِیْهِمْ رَاْیَهَا فَیَکُوْنَ هُوَ الرَّاْیُ الْمُعْتَمَدُ...... وَ تَقُوْلُ هٰذَا حَقٌّ وَّ هٰذَا بَاطِلٌ[۱] یہ وہ امتِ وسط ہے جو لوگوں پر گواہ بنے گی۔ اُن کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے گی۔ اُن کے لیے میزان اور قدریں کھڑی کرے گی۔ یہ اپنی رائے ظاہر کرے گی اور وہ قابل اعتماد رائے ہو گی...... وہ کہے گی کہ یہ حق ہے اور یہ باطل۔

☆ گواہ کے لیے ایک تو یہ ضروری ہے کہ اسے گواہی کا علم ہو اور دوسرا یہ کہ وہ عادل ہو یہ دونوں شرائط عقل اور نقل سے ثابت ہیں۔ 'علم' کی شرط کا ذکر اس آیت میں الگ سے نہیں کیا گیا اس لیے کہ لفظ 'شہید' بمعنی گواہ سے یہ شرط خود بخود معلوم ہو جاتی ہے۔ البتہ عدالت کا ذکر الگ سے کر دیا گیا، تاکہ یہ نکتہ سامنے آ جائے کہ امت کے افراد اگرچہ اپنی منفرد حیثیت میں معصوم نہیں ہیں لیکن من حیث الجماعت معصوم اور عادل ہیں۔ ان دو شرائط کی بنیاد پر اجماع کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک اجماعِ امت، دوسرا اجماعِ مجتہدین۔ جس چیز کی گواہی امت کا ہر فرد دے سکتا ہے اس کے لیے اجماعِ امت شرط ہے اور وہ اس وقت تک منعقد نہیں ہوتا جب تک امت کے تمام طبقات عوام وخواص اس پر متفق نہ ہوں اور دوسرا اجماعِ مجتہدین ہے۔ یہ بھی دوسرے درجے میں اجماعِ امت ہی ہوتا ہے لیکن اولاً اجماعِ مجتہدین ہوتا ہے اور اس میں اس بات کی گنجایش ہوتی ہے کہ اس کے باوجود اجماع قرار پائے کہ عوام میں سے کچھ لوگ اس کے قائل نہ ہوں۔ 'امتِ وسط' کی شرط کی بنا پر ضروری ہے کہ وہ ایسے مجتہدین کا اجماع ہو جو عادل ہوں اور ان میں سے کوئی خود 'اجماعِ امت' کی خلاف ورزی کا ارتکاب کر کے مجتہدین کی صف سے خارج نہ ہو گیا ہو۔

۱۔ فی ظلال القرآن، ج ۳، ص ۱۷۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران۳:۱۱۰) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں دنیا بھر کے انسانوں کو ہدایت کی طرف بلانے اور ان میں معروف کا حکم جاری کرنے اور منکر سے روکنے کی ذمہ داریاں اس امت پر ڈالی گئی ہیں اور پہلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی اس کے 'خیرِ امت' ہونے کا اعلان کر دیا گیا ہے تا کہ کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے کہ ہدایت تو اسی سے لی جا سکتی ہے جو خود ہدایت یافتہ ہو اس لیے فرمایا گیا کہ یہ امت ہدایت یافتہ ہے اور خیرِ امت ہے اس لیے اس سے ہدایت لینا ضروری ہے۔ اور ہدایت کے لیے اس کی طرف رجوع نہ کرنے میں کسی کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔

تیسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء۴: ۱۱۵) مگر جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو تو ہم اس کو اس طرف چلائیں گے جدھر وہ پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

اس آیت میں رسولؐ کی مخالفت اور سبیل المؤمنین کی مخالفت پر الگ الگ جہنم میں داخلے کی وعید آئی ہے جس سے ثابت ہوا کہ سبیل المؤمنین (اجماعِ امت) کی مخالفت کا بھی وہی حکم ہے جو مخالفتِ رسولؐ کا حکم ہے۔ اور جس طرح سنتِ رسول حجت ہے اسی طرح اجماعِ امت بھی حجت ہے۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں: وَ هُوَ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْاِجْمَاعَ حُجَّةٌ لَّا تَجُوْزُ مُخَالَفَتُهَا كَمَا لَا تَجُوْزُ مُخَالَفَةُ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ[1] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اجماع حجت

۱- تفسیر کشاف، ج۱، ص ۵۶۳۔

ہے۔اس کی مخالفت جائز نہیں ہے، جیسا کہ کتاب وسنت کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

علامہ حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں: وَ الَّذِیْ .... عَلَیْهِ الشَّافِعِیُّ فِی الْاِحْتِجَاجِ عَلٰی کَوْنِ الْاِجْمَاعِ حُجَّۃً ...... هٰذِهِ الْآيَةُ[1] امام شافعی اسی آیت کی بنا پر اپنی رائے چھوڑ کر اجماع کی حجیت کے قائل ہو گئے۔

اس موضوع پر قرآن کی اور بھی متعدد آیات روشنی ڈالتی ہیں۔ سرِ دست ہم انھی پر اکتفا کرتے ہیں اور ان میں بیان کردہ ضروری نکات کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱- ان آیات سے اولاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسالت ونبوت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت پوری امتِ مسلمہ یا مجتہدینِ امت کو حاصل ہے۔اس کے کسی خاص فرد کو نہیں اور آپؐ کے بعد انسانوں کے لیے مرجع ہدایت پوری امتِ مسلمہ ہے اس کا کوئی خاص فرد نہیں۔امت کی یہ حیثیت تقاضا کرتی ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبوت ورسالت کے منصب پر فائز نہ ہو، ورنہ امت کی یہ حیثیت باقی نہ رہے گی اس لیے کہ ایسی صورت میں مرجع وہ شخص ہوگا جسے نبوت اور رسالت ملی ہوگی نہ کہ امتِ مسلمہ۔

۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے انسانوں پر اتمامِ حجت تھے۔اس لیے آپؐ اس بات سے معصوم تھے کہ دین میں کمی بیشی کریں اور اسی لیے آپؐ کا فہمِ دین بھی حجت تھا۔آپؐ کے بعد اتمامِ حجت آپؐ کی 'نائب امت' کے ذریعے ہونا ہے اس لیے وہ بھی اس بات سے معصوم ہے کہ دین میں کمی بیشی کرے اور اس کا فہمِ دین بھی حجت ہے۔ بدیہیات میں عوام وخواص اور نظری مسائل میں مجتہدینِ امت کا 'اجماع اور فہم' معصوم عن الخطا ہے۔علامہ علاؤالدین عبدالعزیز فرماتے ہیں:

اِنَّ الرِّوَايَاتِ تَظَاهَرَتْ مِنَ الرَّسُوْلِ ﷺ بِعَصْمَةِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ عَنِ الْخَطَاءِ[2] روایات اس امت کے خطا سے معصوم ہونے پر متفق ہیں۔

۱- تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۳۹۳۔

۲- کشف الاسرار، ج۳، ص۲۵۸۔

۳- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: اَلَا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ (بخاری، کتاب العلم، باب ۹) سنو حاضر غائب کو پہنچا دے۔

یہ بات تاریخی طور پر بھی ثابت ہے اور امت مسلمہ کے تمام گروہوں کے ہاں مسلم بھی ہے کہ تبلیغِ دین میں امت کا اجماع حجت ہے یعنی جس چیز کو امتِ مسلمہ من حیث الجماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرے وہ حجت ہے اسی بنا پر قرآن پاک جسے امتِ مسلمہ نے ہم تک پہنچایا ہے، ہم اسے بلاشبہ اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور وہ احادیث جو بتواتر منقول ہیں انھیں احادیثِ رسول سمجھتے ہیں۔ جس اجماع کے حجت ہونے یا نہ ہونے میں بعض گمراہوں کو کلام ہے اس میں یہ اجماع شامل نہیں ہے۔ یہ اجماع تو بالاتفاق حجت ہے، علامہ علاؤالدین عبدالعزیز بن احمد بخاری 'احکام میں انعقاد اجماع' کے امکان پر بحث کرتے ہوئے قرآن اور احادیثِ متواترہ کے اجماع کو اس کے لیے بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

لِاَنَّ الْاِجْمَاعَ لَمَّا کَانَ مُتَصَوَّراً فِی الْاَخْبَارِ الْمُسْتَفِیْضَةِ یَکُوْنُ مُتَصَوَّراً فِی الْاَحْکَامِ اَیْضاً[1] جب اخبار مستفیضہ میں اجماع کا تصور ہوسکتا ہے تو احکام میں بھی ہوسکتا ہے۔

اس لیے اخبارِ متواترہ (جیسے ختم نبوت کی روایات) پر اجماع کے انعقاد اور اس کی حجیت میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ امام غزالیؒ سوال: اجماع کا علم کیسے ہوگا؟ کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثُمَّ اِذَا انْحَصَرَ اَھْلُ الْحَلِّ وَ الْعَقْدِ فَکَمَا یُمْکِنُ اَنْ یُعْلَمَ قَوْلُ وَاحِدٍ اَمْکَنَ اَنْ یُعْلَمَ قَوْلُ الثَّانِیْ اِلَی الْعَشَرَةِ وَالْعِشْرِیْنَ[2] جب اہلِ حل وعقد کی تعداد محدود ہے تو جس طرح ایک کا قول معلوم ہوسکتا ہے۔ دس بیس کا بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

۱- ایضاً، ص ۲۲۷۔

۲- المستصفیٰ، ج ۱، ص ۲۷۴۔

۴۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ دین کے دو حصے ہیں۔ایک وہ جس کے جاننے میں ہر خاص و عام شریک ہے اور اس کے لیے کسی گہرے علم کی ضرورت نہیں، اگر اس پر پوری امت کا اجماع ہو تب وہ اجماع حجت ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ دوسرا وہ جس کا علم صرف خواص کو ہوسکتا ہے اس پر خواص کا اجماع ضروری ہے۔عوام اس میں خواص کے تابع ہوتے ہیں اور ان کی وہی رائے ہوتی ہے جو خواص کی ہوتی ہے۔ اس میں ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ان دونوں اجماعوں کی طرف شھداء علی الناس کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔سب خاص و عام اس چیز پر گواہ بن سکتے ہیں جس کا انھیں علم ہو۔اور وہ چیز جس کا علم خواص ہی کو ہوسکتا ہے اس پر خواص ہی کی گواہی کافی ہوگی۔اور ان دونوں اجماعوں کا حکم بھی الگ الگ ہے۔ پہلے اجماع کا منکر کافر ہے اور دوسرے اجماع کا منکر گمراہ ہے۔

علامہ علاؤالدین لکھتے ہیں:

وَ مِنْهُمْ مَّنْ فَصَّلَ فَقَالَ: اِنْ كَانَ الْحُكْمُ الْمُجْمَعُ عَلَيْهِ مِمَّا يَشْتَرِكُ الْخَاصَّةُ وَالْعَامَّةُ فِىْ مَعْرِفَتِهٖ مِثْلَ اَعْدَادِ الصَّلٰوةِ وَ رَكْعَاتِهَا وَ فَرْضِ الْحَجِّ وَالصِّيَامِ وَ زَمَانِهِمَا وَ مِثْلَ تَحْرِيْمِ الزِّنَا وَ شُرْبِ الْخَمْرِ وَالسَّرِقَةِ وَالرِّبَا كُفِّرَ مُنْكِرُهٗ لِاَنَّهٗ صَارَ بِاِنْكَارِهٖ جَاحِدًا لِّمَا هُوَ مِنْ دِيْنِ الرَّسُوْلِ قَطْعًا فَصَارَ كَالْجَاحِدِ لِصِدْقِ الرَّسُوْلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اِنْ كَانَ مِمَّا يَنْفَرِدُ بِهِ الْخَاصَّةُ بِمَعْرِفَتِهٖ كَتَحْرِيْمِ تَزَوُّجِ الْمَرْأَةِ عَلٰى عَمَّتِهَا وَ خَالَتِهَا وَ فَسَادِ الْحَجِّ بِالْوَطْئِ قَبْلَ الْوُقُوْفِ بِعَرَفَةَ وَ تَوْرِيْثِ الْجَدَّةِ السُّدُسَ وَ حُجْبِ الْاُمِّ بِالْجَدِّ وَ مَنْعِ تَوْرِيْثِ الْقَاتِلِ لَايُكَفَّرُ مُنْكِرُهٗ وَ لٰكِنْ يُحْكَمُ بِضَلَالِهٖ وَ خَطَائِهٖ لِاَنَّ هٰذَا الْاِجْمَاعَ وَاِنْ كَانَ قَطْعِيًّا اَيْضًا اِلَّا اَنَّ الْمُنْكِرَ مُتَأَوِّلٌ حَيْثُ جُعِلَ عَلٰى مَا مَرَّ وَالتَّأْوِيْلُ مَانِعٌ مِّنَ الْاِكْفَارِ كَتَأْوِيْلِ اَهْلِ الْاَهْوَآءِ لِلنُّصُوْصِ الْقَاطِعَةِ[1] یعنی مجمع علیہ حکم کی معرفت میں عوام و خواص دونوں شریک ہوں جیسے نمازوں اور ان کی رکعتوں کی تعداد، روزہ کی فرضیت اور ان کے زمانے اور جیسے زنا' شراب نوشی' چوری اور سود کی حرمت' تو اس کا منکر کافر ہوگا اس لیے کہ وہ دینِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قطعی حکم کے انکار سے صدق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے

۱۔ کشف الاسرار، جلد۳،ص۲۲۲۔

منکر کی طرح ہوگا۔ [اور اگر وہ مسئلہ ایسا ہو جس میں خاص لوگوں کا فہم ہی معتبر ہوتا ہے جیسے پھوپھی اور خالہ کے اوپر بھتیجی اور بھانجی کا نکاح، وقوفِ عرفات سے پہلے جماع کی وجہ سے حج کا فاسد ہونا، دادی کا چھٹے حصے کا وارث ہونا، دادا کی وجہ سے ماں کا میراث سے محروم ہونا اور قاتل کا میراث کا حق دار نہ ہونا۔ اس طرح کے اجماع کا منکر کافر نہیں ہوتا لیکن اس کی گمراہی اور خطا کا حکم دیا جائے گا۔ یہ اجماع بھی اگرچہ قطعی ہے مگر اس کا منکر حسبِ سابق تاویل کر رہا ہے اور تاویل کسی کی تکفیر میں مانع ہوتی ہے جیسا کہ خواہشات نفس کی پیروی کرنے والے قطعی نصوص کی تاویل کرتے ہیں]

اب ہم اس تمہیدی اور ضروری گفتگو کے بعد اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر بحث کرتے ہیں۔

اجماع کے مسئلے میں جو امور زیرِ بحث آتے ہیں ان میں پہلا مسئلہ اس کی حجیت کا ہے کہ آیا کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے یہ حجت ہے؟ دوسرا مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ آیا اس کا انعقاد ممکن ہے؟ تیسرا یہ کہ اس بات کا کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ فلاں مسئلے پر اجماع ہو گیا ہے؟ چوتھا یہ کہ اجماع کی کتنی اقسام ہیں اور ان تمام کا ایک ہی حکم ہے یا حکم کے لحاظ سے ان میں فرق ہے؟

۱- حجیتِ اجماع

شمس الائمہ سرخسی اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَالْاٰثَارُ فِیْ هٰذَا الْبَابِ كَثِيْرَةٌ تَبْلُغُ حَدَّ التَّوَاتُرِ لِاَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ اِذَا رَوٰى حَدِيْثاً فِیْ هٰذَا الْبَابِ سَمِعَهٗ جَمْعٌ وَّلَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ اَحَدٌ مِّنْ ذٰلِكَ الْجَمْعِ فَذٰلِكَ بِمَنْزِلَةِ الْمُتَوَاتِرِ كَالْاِنْسَانِ اِذَا رَاٰى الْقَافِلَةَ بَعْدَ اِنْصِرَافِهَا مِنْ مَّكَّةَ وَ سَمِعَ مِنْ كُلِّ فَرِيْقٍ وَاحِدًا يَّقُوْلُ حَجَجْنَا فَاِنَّهٗ يَثْبُتُ لَهٗ عِلْمَ الْيَقِيْنِ بِاَنَّهُمْ حَجُّوْا فِیْ تِلْكَ السَّنَةِ وَ شَیْءٌ مِّنَ الْمَعْقُوْلِ يَشْهَدُ بِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الرَّسُوْلَ خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وَ حَكَمَ بِبَقَآءِ شَرِيْعَتِهٖ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ اِنَّهٗ لَانَبِیَّ بَعْدَهٗ وَ اِلٰى ذٰلِكَ اَشَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ قَوْلِهٖ: لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ نَاوَاهُمْ. فَلَا بُدَّ مِنْ اَنْ تَكُوْنَ شَرِيْعَتُهٗ ظَاهِرَةً فِی النَّاسِ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ وَ قَدِ انْقَطَعَ الْوَحْیُ بِوَفَاتِهٖ فَعَرَفْنَا ضَرُوْرَةً اَنَّ طَرِيْقَ بَقَآءِ شَرِيْعَتِهٖ عَصْمَةُ اللّٰهِ اُمَّتَهٗ مِنْ اَنْ يَّجْتَمِعُوْا عَلَى الضَّلَالَةِ فَاِنَّ فِی الاجْتِمَاعِ عَلَى الضَّلَالَةِ رَفْعُ الشَّرِيْعَةِ وَ

ذٰلِكَ يُضَادُّ الْمَوْعُوْدَ مِنَ الْبَقَاءِ وَ اِذَا ثَبَتَ عَصْمَةُ جَمِيْعِ الْاُمَّةِ مِنَ الْاِجْتِمَاعِ عَلَى الضَّلَالَةِ صَارَهِيَ مَا اَجْمَعُوْا عَلَيْهِ الْمَسْمُوْعُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ ذٰلِكَ مُوْجِبٌ لِلْعِلْمِ قَطْعاً فَهٰذَا مِثْلَهُ[1] اس بارے میں روایات حدتواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اس لیے کہ جب ان میں سے ہر ایک راوی ایک جماعت کے سامنے اپنی روایات بیان کرتا ہے اور اس جماعت کا کوئی فرد اس کا انکار نہیں کرتا تو یہ بمنزلۂ تواتر ہے جس طرح ایک انسان مکہ سے واپس آنے والے ایک قافلے کو دیکھتا ہے اور اس قافلے کے مختلف گروہوں میں سے ہر گروہ کے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہے کہ ہم نے حج کیا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اس سال حج کیا ہے اور عقل بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبین بنایا ہے اور آپؐ کی شریعت کو قیامت تک باقی رکھنے اور آپؐ کے بعد کسی نبی کے نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان میں اشارہ کیا ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا اور مخالفین کی مخالفت اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپؐ کی شریعت قیامت تک لوگوں میں کھلی ہوئی اور نمایاں ہو۔ آپؐ کی وفات کے ساتھ وحی منقطع ہو چکی ہے اس لیے یہ بات ہمیں بداہۃً معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کی شریعت کی بقا کا ذریعہ یہ بنا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو گمراہی پر مجتمع ہونے سے معصوم کر لیا اس لیے کہ گمراہی پر مجتمع ہونا شریعت کے خاتمے کے مترادف ہے اور یہ چیز اس کی بقا کے وعدے کے منافی ہے۔ جب امت کے گمراہی پر مجتمع ہونے سے عصمت ثابت ہوگئی تو اس کا کسی غیر مسموع بات پر اجماع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی بات پر اجماع کے مشابہ ہو گیا اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات واجب العمل ہے اسی طرح یہ اجماع بھی قطعاً واجب العمل ہے۔

علامہ سرخسی نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس وقت زیر بحث، غیر مسموع پر اجماع ہے۔ رہا مسموع پر اجماع تو وہ مسلّمہ ہے اور سب کے نزدیک قطعی ہے۔ ختم نبوت کے مسئلے پر اجماع، اجماع علی المسموع ہے لہٰذا وہ قطعاً حجت ہے اور اس کی حجیت میں کسی کو اختلاف نہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

وَمَنْ اَنْكَرَكَوْنَ الْاِجْمَاعِ حُجَّةً مُوْجِبَةً لِلْعِلْمِ فَقَدْ اَبْطَلَ اَصْلَ الدِّيْنِ فَاِنَّهٗ مَدَارُ

۱- اصول السرخسی، ج۱، ص ۲۹۹-۳۰۰۔

اُصُوْلِ الدِّیْنِ وَ مَرْجَعُ الْمُسْلِمِیْنَ اِلٰی اِجْمَاعِھِمْ فَالْمُنْکِرُ لِذٰلِکَ یَسْعٰی فِیْ ھَدْمِ الدِّیْنِ[1]
جس نے اجماع کے حجت اور موجبِ یقین ہونے کا انکار کیا تو اس نے اصلِ دین کو باطل ٹھہرا دیا اس لیے کہ دین کی بنیادوں اور مسلمانوں کا مدار و مرجع اجماع ہے اس لیے اس کا منکر دین کو ختم کر دینے کے درپے ہے۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

ذَکَرَ ھِشَامٌ عَنْ مُحَمَّدٍ: اَلْفِقْهُ اَرْبَعَةٌ: مَا فِی الْقُرْآنِ وَ مَا اَشْبَهَهٗ وَمَا جَآءَ تْ بِهِ السُّنَّةِ وَمَا اَشْبَهَهٗ وَمَا جَآءَ مِنَ الصَّحَابَةِ وَمَا اَشْبَهَهٗ وَمَا رَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَناً وَمَا اَشْبَهَهٗ، فَفِیْ ھٰذَا بَیَانُ اَنَّ مَا اَجْمَعَ عَلَیْهِ الصَّحَابَةُ فَھُوَبِمَنْزِلَةِ الثَّابِتِ بِالْکِتَابِ وَ السُّنَّةِ فِیْ کَوْنِهٖ مَقْطُوْعاً بِهٖ حَتّٰی یُکَفَّرَ جَاحِدُهٗ وَ ھٰذَا اَقْوٰی مَا یَکُوْنُ مِنَ الْاِجْمَاعِ فَفِی الصَّحَابَةِ اَھْلُ الْمَدِیْنَةِ وَعِتْرَۃُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا خِلَافَ بَیْنَ مَنْ یَّعْتَقِدُ بِقَوْلِھِمْ اَنَّ ھٰذَا الْاِجْمَاعَ حُجَّةٌ مُوْجِبَةٌ لِّلْعِلْمِ قَطْعاً فَیُکَفَّرُ جَاحِدُهٗ کَمَا یُکَفَّرُ جَاحِدُ مَا ثَبَتَ بِالْکِتَابِ اَوْ بِخَبَرٍ مُتَوَاتِرٍ[2] ہشام نے امام محمد سے روایت کی کہ فقہ چار چیزیں ہیں جو قرآن میں ہے اور جو اس کے مشابہ ہے، جو سنت میں ہے اور جو اس کے مشابہ ہے، جو صحابہ سے منقول ہے اور وہ جو اس کے مشابہ ہے، جسے مسلمان اچھا سمجھیں اور جو اس کے مشابہ ہو۔ امام محمد کے اس قول میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جس چیز پر صحابہ کا اجماع ہو وہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ حکم کی مانند قطعی ہے۔ اس لیے اس کا منکر کافر ہوگا۔ یہ سب سے قوی اجماع ہے اس لیے کہ صحابہ میں اہل مدینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی 'عترت' بھی شامل ہیں، جو لوگ ان کے قول پر اعتقاد رکھتے ہیں ان کے درمیان اس اجماع کے حجت اور موجب یقین ہونے میں اختلاف نہیں ہے۔ اس کا منکر کافر قرار پائے گا، جس طرح کتاب اور خبر متواتر کا منکر کافر ہوتا ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں:

اِحْتَجَّ جُمْھُوْرُ الْاَصْحَابِ وَجُمْھُوْرُ الْمُعْتَزِلَةِ بِھٰذِهِ الْاٰیَةِ عَلٰی اَنَّ اِجْمَاعَ الْاُمَّةِ حُجَّةٌ فَقَالَ قَدْ اَخْبَرَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْ ھٰذِهِ الْاُمَّةِ وَ عَنْ خَیْرِیَّتِھِمْ فَلَوْ اَقَامُوْا عَلٰی شَیْءٍ مِنَ الْمَحْظُوْرَاتِ لَمَا اتَّصَفُوْا بِالْخَیْرِیَّةِ وَ اِذَا ثَبَتَ اَنَّھُمْ لَا یَقْدَمُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِنَ

۱۔ اصول السرخسی، ج ۱، ص ۳۱۵۔

۲۔ اصول السرخسی، ج ۱، ص ۳۱۸۔

الْمَحْظُوْرَاتِ وَجَبَ اَنْ يَّكُوْنَ قَوْلُهُمْ حُجَّةً[1] جمہور اہل سنت اور جمہور معتزلہ نے اس آیت سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے 'خیر' ہونے کی خبر دی ہے اور امت ممنوعات کے ارتکاب پر قائم رہتے ہوئے خیر ہونے کے ساتھ موصوف نہیں ہوسکتی جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ کسی ممنوع کے ارتکاب کا اقدام نہیں کرے گی تو اس کے قول کا حجت ہونا ثابت ہوگیا۔

ادلہ اجماع کی بحث کرتے ہوئے علامہ شاطبی الموافقات میں فرماتے ہیں کہ ان دلائل کو الگ الگ کیا جائے تو اس میں کلام کی گنجایش ہے۔لیکن تمام کو مجموعی طور پر لیا جائے تو اجماع کی قطعیت پر دلالت کرتے ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک سے نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کی قطعی فرضیت بھی دوسرے دلائل، قرائن اور اجماع کو شامل کر کے ہی ثابت ہوتی ہے:

وَ مِنْ هٰذَا الطَّرِيْقِ ثَبَتَ وُجُوْبُ قَوَاعِدِ الْخَمْسِ كَالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ وَ غَيْرِهِمَا قَطْعاً وَّ اِلَّا فَلَوِ اسْتَدَلَّ مُسْتَدِلٌّ عَلٰى وُجُوْبِ الصَّلٰوةِ بِقَوْلِهٖ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اَوْ مَا اَشْبَهَ ذٰلِكَ لَكَانَ فِى الْاِسْتِدْلَالِ بِمُجَرَّدِهٖ نَظَرٌ مِّنْ اَوْجُهٍ لٰكِنَّ حَفَّ بِذٰلِكَ مِنَ الْاَدِلَّةِ الْخَارِجِيَّةِ وَالْاَحْكَامِ الْمُتَرَتِّبَةِ مَا صَارَ بِهٖ فَرْضَ الصَّلٰوةِ ضَرُوْرِيًّا فِى الدِّيْنِ لَا يَشُكُّ فِيْهِ اِلَّا الشَّاكُّ فِىْ اَصْلِ الدِّيْنِ وَ مِنْ هُنَا اَعْقَدَ النَّاسُ فِى الدَّلَالَةِ عَلٰى وُجُوْبِ مِثْلَ هٰذَا دَلَالَةَ الْاِجْمَاعِ لِاَنَّهٗ قَطْعِيٌّ وَّ قَاطِعٌ لِلشَّغْبِ وَ اِذَا تَأَمَّلْتَ كَوْنَ الْاِجْمَاعِ حُجَّةً اَوْ خَبَرَ الْوَاحِدِ اَوِ الْقِيَاسِ فَهُوَ رَاجِعٌ اِلٰى هٰذَا الْمَسَاقِ لِاَنَّ اَدِلَّتَهَا مَا خُوْذَةٌ مِّنْ مَّوَاضِعَ تَكَادُ تَفُوْتُ الْحَصْرُ[2] اور اسی طریقے سے پانچ بنیادی ارکان نماز، زکوٰۃ وغیرہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ورنہ کوئی استدلال کرنے والا شخص محض اقیموا الصلوٰۃ اور اس طرح کی آیات سے نماز کی فرضیت ثابت کرے تو محض اس طرح کے استدلال سے فرضیت محل نظر ہوسکتی ہے لیکن جب اس کے ساتھ دوسرے خارجی دلائل مل گئے اور مرتب احکام مل گئے تو نماز کی فرضیت بدیہی بن گئی جس میں شک وشبہہ کی کوئی گنجایش نہ رہی۔اور اس فرضیت میں شک کرنے والا اصولِ دین میں شک وشبہہ کرنے والا شمار ہوگا۔اسی وجہ سے لوگ اعتقاد رکھتے

۱- تفسیر کبیر، جلد ۳، ص ۹۸۔

۲- الموافقات، ج ۱، ص ۳۷۔

ہیں کہ اس طرح کی فرضیت پر دلیل اجماع ہے کیونکہ یہ قطعی دلیل ہے اور شور وشغب کو ختم کرنے والا ہے۔ جب آپ اجماع، خبرِ واحد اور قیاس کے حجت ہونے پر غور کریں تو اس کا مرجع بھی یہی چیز ہے کیونکہ ان کے دلائل بھی اتنی جگہوں سے اخذ کیے گئے ہیں، جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اصولِ بزدوی کے شارح علامہ علاء الدین لکھتے ہیں:

وَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ (لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ) هٰذَا مِنَ الْحُجَجِ الْمُتَعَلِّقَةِ بِالسُّنَّةِ فِیْ اِثْبَاتِ كَوْنِ الْاِجْمَاعِ حُجَّةً وَ هِیَ اَدَلُّ عَلَی الْغَرَضِ مِنْ نُصُوْصِ الْكِتَابِ وَ اِنْ كَانَتْ دُوْنَهَا مِنْ جِهَةِ التَّوَاتُرِ وَ تَقْدِیْرُ هٰذَا الدَّلِیْلِ اَنَّ الرِّوَایَاتِ تَظَاهَرَتْ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِعَصْمَةِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ عَنِ الْخَطَأِ بِاَلْفَاظٍ مُخْتَلِفَةٍ عَلٰی لِسَانِ الثِّقَاتِ مِنَ الصَّحَابَةِ كَعُمَرَ وَ ابْنِهٖ وَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَّ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ وَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ وَ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَ حُذَیْفَةَ بْنِ الْیَمَانِ وَ غَیْرِهِمْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ مَعَ اِتِّفَاقِ الْمَعْنٰی كَقَوْلِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ: لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الْخَطَاءِ، لَمْ یَكُنْ یَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ۔ وَ رُوِیَ: وَلَا عَلٰی خَطَاءٍ، وَ عَلَیْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ۔ یَدُ اللّٰهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ وَلَا یُبَالِیْ بِشُذُوْذِ مَنْ شَذَّ، وَ مَنْ خَرَجَ عَنِ الْجَمَاعَةِ قِیْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ عَنْ عُنُقِهٖ، وَمَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً۔ لَا یَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْحَقِّ حَتّٰی یَأْتِیَ اَمْرُاللّٰهِ۔ ثَلٰثٌ لَا یَغُلُّ عَلَیْهِنَّ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ: اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَ النُّصْحُ لِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ لُزُوْمُ الْجَمَاعَةِ فَاِنَّ دَعْوَتَهُمْ تَحِیْطُ مِنْ وَّرَائِهِمْ، مَنْ سَرَّهٗ بُحْبُوْحَةُ الْجَنَّةِ فَلْیَلْزِمِ الْجَمَاعَةَ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَ هُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ۔ لَنْ یَّزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَّنْ نَاوَاهُمْ حَتّٰی یَأْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ۔ اِلٰی غَیْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْاَحَادِیْثِ الَّتِیْ لَاتُحْصٰی كَثْرَةً وَّلَمْ تَزَلْ كَانَتْ ظَاهِرَةً مَّشْهُوْرَةً بَیْنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِیْنَ اِلٰی یَوْمِنَا هٰذَا لَمْ یَدْفَعْهُ اَحَدٌ مِّنْ اَهْلِ النَّقْلِ مِنْ سَلَفِ الْاُمَّةِ وَ خَلَفِهَا مِنْ مُوَافِقِی الْجَمَاعَةِ وَ مُخَالِفِیْهَا وَلَمْ تَزَلِ الْاُمَّةُ تَحْتَجُّ بِهٖ فِیْ اُصُوْلِ الدِّیْنِ وَ فُرُوْعِهٖ[1] یہ سنت کے ان دلائل میں سے ہے جو اجماع کی حجیت کو ثابت کرنے والے ہیں۔ یہ اس مقصد پر نصوصِ کتاب سے زیادہ وضاحت سے دلالت کرتے ہیں۔ اگر چہ ان کا تواتر، قرآنی تواتر

۱- کشف الاسرار، ج ۳، ص ۲۸۵۔

سے کم تر ہے۔اس دلیل کی وضاحت یوں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات اس امت کی عصمت عن الخطا پر متفق ہیں۔ان روایات میں کچھ لفظی اختلاف تو ہے لیکن اس کے راوی ثقہ ہیں اور جلیل القدر ہیں جیسے عمرؓ،ابن عمرؓ،ابن مسعودؓ،ابوسعید خدریؓ،انس بن مالکؓ،ابوہریرہؓ اور حذیفہؓ بن یمان وغیرہ اور سب کا مضمون ایک ہے جیسے میری امت خطا پر جمع نہیں ہوگی،ایسا نہیں ہوسکتا کہ میری امت گمراہی پر اور ایک روایت میں ہے: غلطی پر جمع ہو۔اور تم سواد اعظم کی پیروی کرو۔اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور اس سے الگ ہونے والے کی علیٰحدگی کی اسے کوئی پروا نہیں۔جو جماعت سے ایک بالشت برابر جدا ہوا تو اس نے اپنی گردن سے اسلام کا پٹہ اتار دیا۔جو بھی امام کی بالشت برابر طاعت سے نکلا اور جماعت سے الگ ہوا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔میری امت ہمیشہ حق پر رہے گی یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ جائے۔تین چیزیں ایسی ہیں کہ مومن کے دل کو پاک صاف کر دیتی ہیں: اللہ کے لیے عمل کو خالص کرنا' مسلمان حکمرانوں کی خیر خواہی اور جماعت کے ساتھ منسلک رہنا،اس لیے کہ ان کی دعا انھیں احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔جس شخص کو اس بات سے خوشی ہو کہ جنت کے وسط میں اس کا ٹھکانا ہو تو وہ جماعت سے منسلک رہے اس لیے کہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے بہت دور ہوتا ہے۔میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا،اسے مخالفین کی مخالفت نقصان نہیں پہنچائے گی یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے۔ان کے علاوہ اور اتنی احادیث ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔یہ ہمیشہ سے ظاہر اور مشہور رہی ہیں۔صحابہ و تابعین کے دور سے لے کر آج تک سلف اور خلف میں سے ناقلینِ روایات چاہے جماعت کے موافق ہوں یا مخالف کسی نے انھیں مسترد نہیں کیا اور امت ہمیشہ سے اصول و فروعِ دین میں ان سے استدلال کرتی رہی ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

تَظَاهَرَتِ الرِّوَايَاتُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِالْفَاظٍ مُّخْتَلِفَةٍ مَّعَ اِتِّفَاقِ الْمَعْنٰى فِىْ عَصْمَةِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ عَنِ الْخَطَأِ وَ اشْتَهَرَ عَلٰى لِسَانِ الْمَرْمُوْقِيْنَ وَالثِّقَاتِ مِنَ الصَّحَابَةِ.......... وَ غَيْرِهِمْ مِمَّنْ يَّطُوْلُ ذِكْرُهٗ[1] رسول اللہ صلی اللہ وسلم سے بے شمار روایات لفظاً مختلف ہونے کے باوجود معناً اس بات پر متفق ہیں کہ یہ امت خطا سے معصوم ہے یہ روایات صحابہ،تابعین،تبع تابعین اور ائمہ،جن کی طرف نظریں اٹھتی ہیں اور ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے،کی زبانوں پر مشہور و معروف ہیں۔

۱- المستصفیٰ،ج۱،ص۱۷۵۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

وَ اَمَّا اِجْمَاعُ الْاُمَّةِ فَهُوَ فِیْ نَفْسِهٖ حَقٌّ لَّاتَجْتَمِعُ الْاُمَّةُ عَلٰی ضَلَالَةٍ[1] اجماعِ امت فی نفسہٖ حق ہے۔ امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

وَ اَمَّا اِجْمَاعُ الْاُمَّةِ فَهُوَ حَقٌّ لَاتَجْتَمِعُ الْاُمَّةُ...... وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ...... عَلٰی ضَلَالَةٍ كَمَا وَصَفَهَا اللّٰهُ فِی الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ فَقَالَ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ [آلِ عمران ۳:۱۱۰] وَ هٰذَا وَصْفٌ لَّهُمْ بِاَنَّهُمْ يَأْمُرُوْنَ بِكُلِّ مَعْرُوْفٍ وَّ يَنْهَوْنَ عَنْ كُلِّ مُنْكَرٍ كَمَا وَصَفَ نَبِيَّهُمْ بِذٰلِكَ فِیْ قَوْلِهٖ: اَلَّذِیْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْباً عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ [الاعراف ۷:۱۵۷] فَلَوْ قَامَتِ الْاُمَّةُ فِی الدِّيْنِ بِمَاهُوَ ضَلَالٌ لَّكَانَتْ لَمْ تَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ فِی ذٰلِكَ وَ لَمْ تَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ فِيْهِ وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً [البقرۃ ۲:۱۴۳] وَالْوَسَطُ اَلْعَدْلُ الْخِيَارُ وَ قَدْ جَعَلَهُمْ شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ قَامَ شَهَادَتَهُمْ مَقَامَ شَهَادَةِ الرَّسُوْلِ۔ وَ قَدْ ثَبَتَ فِی الصَّحِيْحِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ مَرَّ بِجَنَازَةٍ فَاَثْنَوْا عَلَيْهِ خَيْراً فَقَالَ: وَ جَبَتْ وَجَبَتْ ثُمَّ مَرَّ بِجَنَازَةٍ فَاَثْنَوْا عَلَيْهِ شَرًّا فَقَالَ: وَجَبَتْ وَجَبَتْ۔ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا قَوْلُكَ وَ جَبَتْ وَجَبَتْ؟ قَالَ: هٰذِهِ الْجَنَازَةُ اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ خَيْراً فَقُلْتُ وَجَبَتْ لَهَا الْجَنَّةُ وَ هٰذِهِ الْجَنَازَةُ اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ شَرًّا فَقُلْتُ وَجَبَتْ لَهَا النَّارُ۔ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ۔ فَاِذَا كَانَ الرَّبُّ قَدْ جَعَلَهُمْ شُهَدَآءَ لَمْ يَشْهَدُوْا بِبَاطِلٍ فَاِذَا شَهِدُوْا اَنَّ اللّٰهَ اَمَرَ بِشَیْءٍ فَقَدْ اَمَرَبِهٖ وَ اِذَا شَهِدُوْا اَنَّ اللّٰهَ نَهٰی عَنْ شَیْءٍ فَقَدْ نَهٰی عَنْهُ وَلَوْ كَانُوْا يَشْهَدُوْنَ بِبَاطِلٍ اَوْ خَطَأٍ لَمْ يَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ بَلْ زَكّٰاهُمُ اللّٰهُ فِیْ شَهَادَتِهِمْ كَمَا زَكّٰی الْاَنْبِيَآءَ فِيْمَا يُبَلِّغُوْنَ عَنْهُ فَهُمْ لَايَقُوْلُوْنَ عَلَيْهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ كَذَالِكَ الْاُمَّةُ لَاتَشْهَدُ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا بِحَقٍّ[2] اجماعِ امت حق ہے اس لیے کہ اللہ کے فضل سے امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی یہ شان بیان کی ہے اور سنت میں بھی اس کی یہی صفت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے

۱- فتاویٰ، ج ۱۹، ص ۱۷۶۔

۲- فتاویٰ، ص ۱۷۶-۱۷۷۔

میدان میں لایا گیا ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو
اس آیت میں ان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر معروف کا حکم دیتے ہیں اور ہر منکر سے روکتے ہیں، جیسے کہ ان کے نبی کی بھی یہی صفت بیان کی گئی ہے۔ اب اگر امت دین میں کسی ایسی بات کو اختیار کرے جو گمراہی ہو تو لازم آئے گا کہ اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کیا (اس لیے کہ اس نے معروف کی بجائے منکر کو اختیار کرلیا) پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو امتِ وسط بنایا اور ان کی شہادت کو رسول کی شہادت کا قائم مقام قرار دیا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ لے کر گذرے۔ لوگوں نے اس کی تعریف کی تو آپؐ نے فرمایا: واجب ہوگئی واجب ہوگئی۔ پھر لوگ ایک دوسرے جنازے کو لے کر گذرے لوگوں نے اس کی برائی بیان کی تو آپؐ نے فرمایا: لازم ہوگئی لازم ہوگئی۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! 'وجبت وجبت' کے کیا معنی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ایک جنازے کی تم نے تعریف کی تو میں نے کہا کہ اس پر جنت واجب ہوگئی۔ دوسرے کی تم نے برائی بیان کی تو میں نے کہا: اس کے لیے جہنم واجب ہوگئی۔ تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ پس جب ربِّ کریم نے انھیں گواہ قرار دیا ہے تو وہ باطل کی گواہی نہیں دیں گے۔ جب وہ گواہی دیں کہ اللہ نے یوں فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے فی الواقع ایسا ہی فرمایا اور جب یہ گواہی دیں کہ اللہ نے روکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ اگر وہ باطل کی گواہی یا غلط شہادت دیں تو پھر وہ زمین میں اللہ کے گواہ نہیں ہوسکتے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی گواہی کا اس طرح تزکیہ کیا ہے جس طرح اس نے اپنے انبیا کے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں تزکیہ کیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف صرف سچ اور حق کی نسبت کریں گے۔ اسی طرح امت بھی اللہ کے متعلق نہیں کہے گی مگر وہ بات جو حق اور سچ ہو۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

وَكَانَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِيْزِ يَقُوْلُ بِكَلِمَاتٍ كَانَ مَالِكٌ يَّأْثِرُهَا عَنْهُ كَثِيْراً قَالَ: سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ وُلَاةُ الْاَمْرِ مِنْ بَعْدِهٖ سُنَناً، اَلْاَخْذُبِهَا تَصْدِيْقٌ لِكِتَابِ اللّٰهِ وَ اسْتِعْمَالٌ لِطَاعَةِ اللّٰهِ وَ مَعُوْنَةٌ عَلٰى دِيْنِ اللّٰهِ لَيْسَ لِاَحَدٍ تَغْيِيْرَهَا وَ لَا النَّظَرَ فِىْ رَأْيِ مَنْ خَالَفَهَا فَمَنْ خَالَفَهَا وَ اتَّبَعَ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَّاهُ اللّٰهُ مَا تَوَلّٰى وَ صَلَّاهُ جَهَنَّمَ. سَاءَتْ مَصِيْراً [1] عمر بن عبدالعزیزؒ یہ کلمات کہا کرتے تھے جنھیں اکثر امام مالک نقل کرتے تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد ذمہ دارانِ دین

۱- فتاوی، ج۱۹، ص۱۷۸۔

نے کچھ چیزوں کو رواج دیا انھیں اپنانا اللہ کی کتاب کی تصدیق، اللہ کی طاعت، اور اللہ کے دین کی امداد کرنا ہے۔ کسی کو ان میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہے، نہ اس کے مخالفین کی رائے قابل التفات ہے۔ جس نے ان کی مخالفت کی اور مومنین کی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ کی پیروی کی اللہ اسے ادھر پھیر دے گا جس طرف وہ پھرا۔ اور اسے جہنم میں داخل کرے گا جو بدترین جگہ ہے۔

امام شافعیؒ نے جب اصولِ فقہ میں کتاب لکھی تو انھوں نے دوسرے لوگوں کی طرح اجماعِ امت پر اس آیت سے استدلال کیا اور امام مالکؒ نے عمر بن عبدالعزیزؒ سے ان کلمات کو نقل کیا ہے۔[1]

امام شافعیؒ کی کتاب الام کے مقدمے میں کہا گیا ہے کہ بَنَى الْإِمَامُ الشَّافِعِيُّ مَذْهَبَهُ عَلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَالْإِجْمَاعِ وَالْقِيَاسِ[2] امام شافعی نے اپنے مسلک کی بنیاد کتاب و سنت، اجماع اور قیاس پر رکھی۔

علامہ محب اللہ بہاریؒ فرماتے ہیں: اَلْإِجْمَاعُ حُجَّةٌ قَطْعاً عِنْدَ الْجَمِيعِ اجماعِ امت سب کے نزدیک حجت قطعی ہے۔

علامہ عبدالعلی محمد بن نظام الدین انصاری اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَ يُفِيدُ الْعِلْمَ الْجَازِمَ عِنْدَالْجَمِيعِ مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ وَ لَا يُعْتَدُّ بِشِرْذِمَةٍ مِّنَ الْحُمْقَى الْخَوَارِجِ وَالشِّيْعَةِ لِأَنَّهُمْ حَادِثُوْنَ بَعْدَ الْإِتِّفَاقِ يُشَكِّكُوْنَ فِيْ ضَرُوْرِيَاتِ الدِّيْنِ مِثْلَ السُّوْفِسْطَائِيَّةِ فِي الضَّرُوْرِيَاتِ الْعَقْلِيَّةِ[3] تمام اہلِ قبلہ کے نزدیک یہ مفیدِ علم ویقین ہے۔ خوارج اور شیعہ کے چھوٹے سے احمق گروہ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے کہ یہ اس مسئلے پر اتفاق کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور بدیہیاتِ دین میں اس طرح شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں جس طرح سوفسطائیہ عقلی چیزوں میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔

امتیازی نام

اجماع کی حجیت تو اس قدر واضح ہے کہ اہلِ حق کا نام ہی اہلِ سنت والجماعت پڑ گیا۔

۱- فتاوی، ج۱۹،ص۱۷۸۔

۲- مقدمۃ کتاب الام، تحت عنوان: اصول مذہبہ، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۹۸۳ء۔

۳- فواتح الرحموت بذیل المستصفیٰ للغزالی، ج۲،ص۲۱۳، المطبعۃ الامیریۃ، ۱۳۲۴ھ۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ حق کا امتیازی نام 'اہلِ سنت والجماعت' اس لیے پڑا ہے کہ وہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماعِ امت کی حجیت کے قائل ہیں:

اِمْتَازَ اَهْلُ الْحَقِّ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِالسُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ عَنْ اَهْلِ الْبَاطِلِ الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ يَتَّبِعُوْنَ الْكِتَابَ وَ يُعْرِضُوْنَ عَنْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ عَمَّا مَضَتْ عَلَيْهِ جَمَاعَةُ الْمُسْلِمِيْنَ[1] اس امت کے اہلِ حق اهل السنة والجماعة کے نام سے ان اہلِ باطل سے ممتاز ہوئے جو سمجھتے ہیں کہ وہ کتاب وسنت کی پیروی کرتے ہیں اور سنت اور مسلمانوں کی جماعت کی پیروی سے منہ موڑنے والے ہیں۔

جدید دور کے محقق عبدالوہاب خلاف فرماتے ہیں:

اِذَا تَحَقَّقَتْ اَرْكَانُ الْاِجْمَاعِ.......... كَانَ هٰذَا الْحُكْمُ الْمُتَّفَقُ عَلَيْهِ قَانُوْناً شَرْعِيًّا وَّاجِباً اِتِّبَاعُهُ وَلَا تَجُوْزُ مُخَالَفَتُهُ[2] جب ارکانِ اجماع موجود ہوگئے تو یہ حکم متفق علیہ شرعی قانون بن گیا جس کا اتباع واجب ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو لکھا:

اِقْضِ بِمَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فَبِمَا فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فَبِمَا بِهٖ قَضَى الصَّالِحُوْنَ قَبْلَكَ۔ وَ فِيْ رِوَايَةٍ۔ فَبِمَا اَجْمَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ[3] کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو، اس میں نہ پاؤ تو سنت رسول اللہ سے، اس میں نہ پاؤ تو اپنے سے پہلے صالحین کے فیصلوں کے مطابق۔ اور ایک روایت میں ہے کہ لوگوں کے اجماع کے مطابق۔

وَهُوَ حُجَّةٌ قَاطِعَةٌ عِنْدَ الْاَكْثَرِ خِلَافاً لِّلنِّظَامِ فِيْ آخَرِيْنَ نظام اور کچھ دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر اکثر کے نزدیک یہ حجت قطعی ہے۔

مشہور مصری محقق عبدالفتاح طبارہ فرماتے ہیں:

فَمَتَى اتَّفَقَ هٰؤُلَاءِ عَلَى اَمْرٍ وَجَبَ عَلَى الْاُمَّةِ الطَّاعَةُ وَ عَلَى الْحَاكِمِ التَّنْفِيْذُ فَاِنْ اَبٰى اَسْقَطُوْهُ[4] جب اہلِ حل وعقد (یعنی اولی الامر) ایک بات پر متفق ہو جائیں تو امت پر

۱- تفسیر قاسمی، ج ۱، ص ۴۸۷۔

۲- علم اصول الفقہ، ص ۴۶۔

۳- فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۱۹، ص ۲۰۱۔

۴- (المختصر فی اصول الفقه علی مذهب الامام احمد بن حنبلؒ) روح الدین الاسلامی، ص ۲۳۸۔

طاعت اور حکمران پر اس کی تنفیذ لازم ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کردے تو اسے منصبِ حکومت سے الگ کردیں۔

علامہ جمال الدین افغانیؒ فرماتے ہیں:

وَ اَخْبَرَ الصَّادِقُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ یَدَ اللّٰہِ مَعَ الْجَمَاعَۃِ وَ کَفٰی بِالْقُدْرَۃِ الْاِلٰھِیَّۃِ اِذَا صَحَّ الْاِجْتِمَاعُ وَ صَدَقَتِ الْاِلْفَۃُ وَ قَدْ بَلَغَتْ مَکَانَۃُ الْاِتِّفَاقِ فِی الشَّرِیْعَۃِ اَسْمٰی دَرَجَۃٍ فِی الرِّعَایَۃِ الدِّیْنِیَّۃِ حَتّٰی جَعَلَ اِجْمَاعَ الْاُمَّۃِ وَ اِتِّفَاقَھَا عَلٰی اَمْرٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ کَاشِفاً عَنْ حُکْمِ اللّٰہِ وَمَا فِیْ عِلْمِہٖ وَ اَوْجَبَ الشَّرْعُ الْاَخْذَ بِہٖ عَلٰی عُمُوْمِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ عَدَّجُحُوْدَہٗ مُرُوْقاً مِّنَ الدِّیْنِ وَانْسِلَاخاً عَنِ الْاِیْمَانِ[1] صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جب صحیح معنی میں اجتماعیت قائم ہوجائے اور الفت پیدا ہوجائے تو اللہ کی قدرت کافی ہوجاتی ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں اتفاق کی رعایت نہایت اونچے درجے پر رکھی گئی ہے حتیٰ کہ اجماعِ امت کو اللہ کے حکم اور علم کے لیے 'کاشف' کے مقام پر رکھا گیا ہے۔ شریعت نے اسے قبول کرنے کا تمام مسلمانوں کو پابند کیا ہے۔ اس کے انکار کو دین سے خروج اور ایمان کو چھوڑ دینے کے مترادف قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید سلیمان فرماتے ہیں:

وَ نَتَائِجُ نِظَامِ الشُّوْرٰی فِیْ نِظَامِ الدَّوْلَۃِ الْاِسْلَامِیَّۃِ ھُوَ الْفِکْرُ وَالْقَنَاعَۃُ وَالْفَھْمُ الْجَمَاعِیْ .... فَیَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ یَداً وَّاحِدَۃً وَ جَسَداً صَحِیْحاً وَ نَسِیْجاً قَوِیًّا مُتَمَاسِکاً[2] اسلامی حکومت میں مشاورت کے نظام کے نتائج میں سے ایک، سوچ بچار، اطمینان اور اجتماعی فہم پیدا کرنا ہے تاکہ مسلمان متحدہ قوت، صحت مند جسم اور باہم مربوط اور مضبوط لڑی بن جائیں۔

مولانا اسحاق سندیلوی صاحب لکھتے ہیں:

اجماع کے معنی ہیں ایک زمانے کے کل مجتہدینِ اہلِ سنت والجماعۃ کا کسی مسئلے پر متفق الرائے ہوجانا۔ ایسی صورت میں وہ مسئلہ قطعی الثبوت ہوجاتا ہے اور اس کو صحیح سمجھنا واجب ہوجاتا

۱- العروۃ الوثقیٰ، ص ۱۱۷۔

۲- قضایا الفکر الاسلامی المعاصر، ص ۳۷۱۔

ہے۔اجماع احکامِ شرعیہ کے لیے مُثبِت ہے نہ کہ قیاس کی طرح محض مُظہِر۔لیکن اس کے مُثبِت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب وسنت کے کسی حکم سے ماخوذ ہو۔اب اجماع اس میں قطعیت پیدا کر دیتا ہے یا اس کی قطعیت کی تاکید و تائید کر دیتا ہے۔اول الذکر حکم اسی صورت میں ثابت ہوتا ہے جب کہ کتاب یا سنت سے جو حکم ثابت ہوا ہے وہ ظنی ہو۔ایسی حالت میں اجماع اسے قطع ویقین کے درجے پر پہنچا دے گا۔مؤخر الذکر حکم اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کہ مجمع علیہ حکم پہلے سے قطعی ہو۔اجماع کا فائدہ اس صورت میں بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کی قطعیت کی تاکید کر دیتا ہے۔[1]

مزید لکھتے ہیں:

اجماع کو حجت قرار دینا اجتماعیت ونظم کے بقاواستحکام کے لیے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔کسی مُجمع علیہ مسئلے میں بھی اگر زمانے کے بعد اختلاف کی گنجایش رہے تو اس سے جماعت میں انتشار وتشتُّت اور فرقہ بندی وتحزب کا مرض پھیلنے کا شدید اندیشہ ہے،جو قطعی طور پر نظامِ عمران اور تمدن کے لیے مہلک ہے۔اجماع کی حجیت بھی سلف صالحین سے ثابت ہے اور اس بارے میں ان میں سے کسی کو بھی اختلاف نہیں البتہ اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ کن لوگوں کا اجماع معتبر ہے۔اکثر کا مسلک تو وہی ہے جو ہم نے شروعِ مبحث میں ذکر کیا ہے،یعنی ایک زمانے کے کل مجتہدین کا اجماع۔[2]

مولانا حامد انصاری فرماتے ہیں:

اسلامی حکومت کے اصحابِ علم وتدبر کی رائے کا کسی قانونی معاملے میں متحد ہو جانا اجماع ہے اس کی نمایاں علامت یہ ہے کہ اس اتحاد کے بعد اسلامی معاشرے کی پوری رائے عامہ اس فیصلے پر جمع ہو جاتی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جب امت کے صالح مدبرین اور ارجمند عوام کسی فیصلے پر جمع ہو جاتے ہیں تو وہ قانون کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔علامہ ابوالبقاء حنفی لکھتے ہیں:

امتِ محمدیہ کے اربابِ اجتہاد (درجہ اوّل کے مفکرین ومدبّرین) کا قانونی حکم پر جمع ہو جانا اجماع ہے اور اس کو قانونی طور پر حجت سمجھا جاتا ہے۔قانونی قیاس اور قانونی تقلید بھی اسی سلسلے کے ماتحت ہیں۔قانونِ اجماع کے جو نظائر تواتر اور تسلسل کے ساتھ باقی ہیں...... ان کو قطعی قانون کا درجہ حاصل ہے۔قانونِ اجماع کی خلاف ورزی ناجائز ہے۔[کلیات العلوم، ابوالبقاء حنفی، ص ۲۴-۲۵،

۱- اسلام کا سیاسی نظام، ص ۴۸-۴۹۔

۲- اسلام کا سیاسی نظام، ص ۵۱-۵۲۔

طبع آستانہ،تعریفات سیّد شریف]

امت کی اکثریت بھی اجماع کا فائدہ دیتی ہے اکثریت کا فیصلہ سواد اعظم کا فیصلہ ہے اس لیے اس کو قانون میں مناسب اہمیت حاصل ہے۔[فاروقِ اعظمؓ نے سات اصحاب کی شوریٰ کونسل میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو اکثریت کے فیصلے کو قبول کرنے کی ہدایت کی تھی۔]

حجۃ الاسلام علامہ ابوبکر جصاص حنفی (متوفیٰ ۳۷۰ھ) اپنی فیصلہ کن رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: خداوند عالم نے امت اسلامیہ کو امتِ وسطیٰ (بہترین قوم) کا خطاب دیا ہے اور اس کو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے حجت قرار دیا ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس امت کا اجماع اصولاً صحیح اور قابلِ قبول ہے۔ چونکہ اس امت کے افراد بہترین کردار کے مالک ہیں اس لیے ان کا اجماع کسی غلط عقیدے اور غلط مقصد پر نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی خداداد ذمہ داری پر جو فیصلہ کریں گے اس میں عدل اور عام بہتری کا ضروری لحاظ ہوگا۔ عہدِ نبوت سے لے کر قیامت تک صالح مسلمانوں کی رائے عامہ کا اجماع قابلِ تقلید ہے۔ اجماع کا ہر فیصلہ اس زمانے کے مسلمانوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے واجب التعمیل ہے البتہ اجماع کے لیے شرط یہ ہے کہ صحیح طرز پر بروئے کار آئے۔ مسلمان جس فیصلے پر جمع ہوں وہ قانونِ الٰہی کے خلاف نہ ہو، جمع ہونے والے اپنے زمانے کے بہترین انسان ہوں اور ان کو یقین ہو کہ وہ انسانی بہتری کے لیے بے غرضی کے ساتھ اپنا فیصلہ دے رہے ہیں۔ فاسق اور بدکار اشخاص مسلمانوں کی شکل میں مجتمع ہو کر اگر کسی رائے پر جمع ہو جائیں اور وہ رائے اصولِ دین کے خلاف ہو تو اس کو قانونِ اجماع کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔[1] [احکام القرآن، جلد ۱، ص ۱۰۲-۱۰۳۔]

اقسام

[اجماع کو کئی لحاظ سے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔]

(الف) محلِ اجماع کے لحاظ سے

۱۔ منصوص پر اجماع: محلِ اجماع کے لحاظ سے اجماع کی ایک قسم کتاب و سنت کے نصوص (یعنی مسموع کے نقل) پر اجماع ہے۔ اس کی حجیت میں کسی کو کلام نہیں۔

۱۔ اسلام کا نظامِ حکومت، ص ۱۸۵۔

۲- غیر منصوص اور غیر مسموع پر اجماع: اس اجماع کی بنیاد دراصل نص یا قیاسِ صحیح ہوتا ہے اور زیرِ بحث اجماع کی یہی قسم ہے۔ اس کے متعلق علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

لَایُوجَدُ مَسْئَلَةٌ یَّتَّفِقُ الْاِجْمَاعُ عَلَیْهَا اِلَّا وَ فِیْهَا نَصٌّ[1] جتنے بھی متفق علیہ مسائل ہیں ان میں سے کوئی نہیں ایسا بھی جس میں نص نہ ہو۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

لَایُوجَدُ قَطُّ مَسْئَلَةٌ مُجْمَعٌ عَلَیْهَا اِلَّا وَ فِیْهَا بَیَانٌ مِّنَ الرَّسُوْلِ وَلٰكِنْ قَدْ یَخْفٰی عَلٰی بَعْضِ النَّاسِ وَ یَعْلَمُ الْاِجْمَاعَ وَ یَسْتَدِلُّ بِهٖ[2] کوئی بھی مجمع علیہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں نص نہ ہو۔ بعض لوگوں سے وہ نص مخفی ہوتی ہے لیکن اس پر اجماع کا انھیں علم ہوتا ہے اس لیے وہ اس پر اجماع سے استدلال کرتے ہیں۔

مزید فرماتے ہیں:

لٰكِنِ اسْتَقْرَأْنَا مَوَارِدَ الْاِجْمَاعِ فَوَجَدْنَا كُلَّهَا مَنْصُوْصَةً[3] ہم نے اجماعی مسائل کا جائزہ لیا تو سب کو منصوص پایا۔

(ب): بدیہی اور نظری کے لحاظ سے

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، ایک اجماع وہ ہے جس میں امتِ مسلمہ کے ہر عام و خاص کا اتفاق ضروری ہے اور دوسرا وہ ہے جس میں پہلے مرحلے میں مجتہدینِ صالحین کا اجماع ہوتا ہے اور دوسرے مرحلے میں امت کا۔ اس اجماع کو اس وقت بھی اجماع قرار دیا جائے گا جب کہ اس امت کے بعض افراد شریک نہ ہوں اور یہ بھی حجت ہوگا:

فَمَا اَجْمَعَ عَلَیْهِ الْخَوَاصُّ فَالْعَوَامُّ مُتَّفِقُوْنَ عَلٰی اَنَّ الْحَقَّ فِیْهِ مَا اَجْمَعَ عَلَیْهِ اَهْلُ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ لَایُضْمِرُوْنَ فِیْهِ خِلَافاً اَصْلاً .... اِنَّ الْعَصْرَ الْاَوَّلَ مِنَ الصَّحَابَةِ قَدْ اَجْمَعُوْا عَلٰی اَنَّهٗ لَا عِبْرَةَ لِلْعَوَامِّ فِیْ هٰذَا الْبَابِ[4] جن باتوں پر خواص کا اجماع

۱- فتاویٰ، ج۱۹، ص۱۹۵۔

۲- ایضاً۔

۳- فتاویٰ، ج۱۹، ص۱۹۵۔

۴- المستصفیٰ، ج۱، ص۱۸۲۔

ہو جائے تو عوام اس بات پر متفق ہیں کہ جس بات پر اہلِ حل وعقد نے اتفاق کیا ہے۔ اس میں ہم کوئی اختلاف نہیں کرتے .... صحابہؓ کرام کے عصرِ اوّل کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس باب میں عوام کی بات معتبر نہیں ہے]

(ج): ثبوت کے لحاظ سے

۱- اجماعِ تصریحی: اصل اجماع، اجماعِ تصریحی ہے اس لیے اسے اجماعِ عزیمت یعنی اصل اجماع قرار دیا گیا ہے اور اجماعِ سکوتی کو اجماعِ رخصت کا نام دیا گیا ہے:

اَمَّا الْعَزِيْمَةُ فَالتَّكَلُّمُ بِمَا يُوْجِبُ الْاِتِّفَاقَ مِنْهُمْ اَوْ شُرُوْعَهُمْ فِى الْفِعْلِ فِيْمَا يَكُوْنُ مِنْ بَابِ الْفِعْلِ عَلٰى وَجْهٍ يَّكُوْنُ ذَالِكَ مَوْجُوْداً عَنِ الْخَاصِّ وَالْعَامِّ فِيْمَا يَسْتَوِى الْكُلُّ فِى الْحَاجَةِ اِلٰى مَعْرِفَتِهٖ لِعُمُوْمِ الْبَلْوٰى الْعَامِ فِيْهِ كَتَحْرِيْمِ الزِّنَا وَ الرِّبٰو وَ تَحْرِيْمِ الْاُمَّهَاتِ وَ اَشْبَاهِ ذَالِكَ وَ يَشْتَرِكُ فِيْهِ جَمِيْعُ عُلَمَاءِ الْعَصْرِ فِيْمَا لَايَحْتَاجُ الْعَامُّ اِلٰى مَعْرِفَتِهٖ لِعَدَمِ الْبَلْوٰى الْعَامِّ لَهُمْ فِيْهِ كَحُرْمَةِ نِكَاحِ الْمَرْأَةِ عَلٰى عَمَّتِهَا وَ خَالَتِهَا وَ فَرَائِضِ الصَّدَقَاتِ مَا يَجِبُ فِى الزُّرُوْعِ وَالثِّمَارِ وَمَا اَشْبَهَ ذَالِكَ[1] [عزیمت کا مطلب ہے] ایسی بات کرنا جس سے اس کا اتفاق ثابت ہو یا اگر وہ کرنے کی چیز ہو تو سب کا اسے کرنا ثابت ہو، اس طرح سے کہ اگر عوام وخواص سب کو اس کی معرفت کی ضرورت ہے تو سب کا اتفاق ثابت ہو [جیسے حرمتِ ربوٰ، ماں کے ساتھ نکاح کی حرمت وغیرہ] اور اگر خواص وعوام کو اس کی معرفت کی ضرورت نہیں تو جمیع اہلِ عصر علما کا اتفاق ثابت ہو۔ [جیسے پھوپھی یا خالہ پر اس کی بھتیجی یا بھانجی کا نکاح اور زرعی پیداوار اور پھلوں میں زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ]

۲- اجماعِ رخصت یا اجماعِ سکوتی: صُوْرَةُ الْمَسْئَلَةِ مَا اِذَا ذَهَبَ وَاحِدٌ مِنْ اَهْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ فِىْ عَصْرٍ اِلٰى حُكْمٍ فِىْ مَسْئَلَةٍ قَبْلَ اِسْتِقْرَارِ الْمَذَاهِبِ عَلٰى حُكْمِ تِلْكَ الْمَسْئَلَةِ وَانْتَشَرَ ذَالِكَ بَيْنَ اَهْلِ عَصْرِهٖ وَ مَضٰى مُدَّةُ التَّأَمُّلِ فِيْهِ وَ لَمْ يَظْهَرْ لَهٗ مُخَالِفٌ كَانَ ذَالِكَ اِجْمَاعًا مَقْطُوْعاً بِهٖ عِنْدَ اَكْثَرِ اَصْحَابِنَا وَ كَذَا الْفِعْلُ[2] اجماعِ سکوتی کی

۱- المستصفی، ج۱، ص۱۸۲۔

۲- کشف الاسرار، ج۳، ص۲۲۸-۲۲۹۔

صورت یہ ہے کہ اہلِ حل وعقد (مجتہدین) میں سے کوئی [شخص] کسی ایک زمانے میں کسی ایک مسئلے میں ایک حکم کو اختیار کرے، اس سے پہلے کہ اس مسئلے میں مذاہب قائم ہو چکے ہوں اور یہ چیز زمانے کے علما میں پھیل جائے اور اس میں غور وفکر کی مدت گزر جائے اور کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا ہو تو یہ احناف کے نزدیک قطعی اجماع ہوگا۔ قول (بلانکیر) کی طرح فعل (بلانکیر) کا بھی یہی حکم ہے۔

اجماع کی پہلی صورت کو عزیمت اور اصل اجماع قرار دیا جاتا ہے اس لیے کہ اس کا اجماع ہونا نطق اور صراحت سے ثابت ہوتا ہے اور دوسرے اجماع کو اس ضرورت کی بنا پر اجماع قرار دیا جاتا ہے کہ سکوت کو اتفاق نہ قرار دیا جائے تو سکوت عن الحق لازم آئے گا اور یہ فسق ہے جو عصمتِ امت کے منافی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَ اَمَّا اَقْوَالُ الصَّحَابَةِ فَاِنِ انْتَشَرَتْ وَ لَمْ تُنْكَرْ فِی زَمَانِهِمْ فَهِیَ حُجَّةٌ عِنْدَ جَمَاهِیرِ الْعُلَمَاءِ وَاِنْ تَنَازَعُوا رُدَّمَا تَنَازَعُوا فِیهِ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُولِ وَلَمْ یَكُنْ قَوْلُ بَعْضِهِمْ حُجَّةً مَّعَ مُخَالَفَةِ بَعْضِهِمْ لَهٗ بِاتِّفَاقِ الْعُلَمَاءِ وَاِنْ قَالَ بَعْضُهُمْ قَوْلًا وَّ لَمْ یَقُلْ بَعْضُهُمْ بِخِلَافِهٖ وَلَمْ یَنْتَشِرْ فَهٰذَا فِیهِ نِزَاعٌ وَّ جُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ یَحْتَجُّونَ بِهٖ كَاَبِی حَنِیفَةَ وَ مَالِكٍ وَّ اَحْمَدَ فِی الْمَشْهُورِ عَنْهُ وَالشَّافِعِیِّ فِی اَحَدِ قَوْلَیْهِ وَ فِی كُتُبِهِ الْجَدِیدَةِ الْاِحْتِجَاجُ بِمِثْلِ ذَالِكَ فِی غَیْرِ مَوْضِعٍ لَكِنْ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُولُ هٰذَا هُوَ الْقَوْلُ الْقَدِیمُ اقوالِ صحابہ پھیل جائیں اور ان کے زمانے میں ان پر انکار نہ کیا جائے تو یہ علما کے مختلف طبقوں کے جمہور کے نزدیک حجت ہیں اور اگر ان میں باہمی اختلاف ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اور اگر ایک نے بات کی ہو اور دوسرے نے اس سے اختلاف نہ کیا ہو درآں حالیکہ وہ قول پھیلا نہ ہو تو اس میں نزاع ہے۔ جمہور علما اس سے احتجاج [یعنی استدلال] کرتے ہیں، جیسے ابوحنیفہ، مالک اور امام احمد (مشہور قول کے مطابق) اور امام شافعیؒ (ایک قول کے مطابق)۔ ان کی جدید کتابوں میں اس طرح کے قول سے متعدد مقامات میں احتجاج کیا گیا ہے لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کا قدیم قول ہے۔

صاحبِ کشف الاسرار لکھتے ہیں:

وَ یُحْكٰی عَنِ الشَّافِعِیِّ اَنَّهٗ كَانَ یَقُولُ اِنْ ظَهَرَ الْقَوْلُ مِنْ اَكْثَرِ الْعُلَمَاءِ وَالسَّاكِتُونَ

نَفَرٌ یَسِیْرٌ یَثْبُتُ الْاِجْمَاعُ[1] امام شافعی سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں: اکثر علما سے اتفاق ثابت ہو اور سکوت اختیار کرنے والے تھوڑے سے افراد ہوں تو اس سے اس کا اجماع ہونا ثابت ہو جائے گا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے آخر میں فیصلہ کن بات فرماتے ہیں:

مذکورۂ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نصِ شرعی کی کسی تعبیر یا کسی قیاس یا استنباط پر یا کسی تدبیر و مصلحت پر اب بھی اہلِ حل وعقد کا اجماع یا ان کی اکثریت کا فیصلہ فی الواقع ہو جائے تو وہ حجت ہوگا اور قانون قرار پائے گا، اس طرح کا فیصلہ اگر تمام دنیاے اسلام کے اہلِ حل وعقد کریں تو وہ تمام دنیاے اسلام کے لیے قانون ہوگا اور کسی ایک اسلامی مملکت کے اہلِ حل وعقد کریں تو وہ کم از کم اس مملکت کے لیے قانون ہونا چاہیے۔[2]

بہر حال کسی مسئلے کے بارے میں بحث ہو سکتی ہے کہ اس پر اجماع ہے یا نہیں اور اجماع ہے تو وہ کون سا اجماع ہے، اجماعِ منطوقی یا اجماعِ سکوتی۔ اور اس مسئلے کا تعلق ضروریات اور متواتراتِ دین سے ہے یا نظری یا علمی دائرے سے ہے۔ اور اس کے اجماع کے انکار سے تکذیبِ رسول ہوتی ہے یا نہیں۔ لیکن ثبوتِ اجماع کے بعد وہ حجت ہے۔ پھر جن دلائل اور وجوہ کی بنا پر اجماعِ صحابہ حجت بنتا ہے وہی ہر دور کی امت کے اجماع کی حجیت کا تقاضا کرتے ہیں اس لیے اس لحاظ سے اجماعِ صحابہ کے ساتھ تابعین، تبع تابعین اور بعد کے ادوار کا اجماع بھی حجت قرار پاتا ہے۔

علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

وَ فِیْہِ دَلِیْلٌ عَلٰی صِحَّۃِ الْاِجْمَاعِ وَ وُجُوْبُ الْحُکْمِ بِہٖ لِاَنَّھُمْ اِذَا کَانُوْا عُدُوْلاً شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ کَانَ کُلُّ عَصْرٍ شَھِیْداً عَلٰی مَنْ بَعْدَہٗ فَقَوْلُ الصَّحَابَۃِ حُجَّۃٌ وَّ شَاھِدٌ عَلَی التَّابِعِیْنَ وَ قَوْلُ التَّابِعِیْنَ عَلٰی مَنْ بَعْدَھُمْ وَ اِذَا جُعِلَتِ الْاُمَّۃُ شُھَدَاءَ فَقَدْ وَجَبَ قَبُوْلُ قَوْلِھِمْ وَلَا مَعْنٰی لِقَوْلِ مَنْ قَالَ اُرِیْدَ بِہٖ جَمِیْعُ الْاُمَّۃِ لِاَنَّہٗ حِیْنَئِذٍ لَّا یَثْبُتُ

۱۔ کشف الاسرار، ج۳، ص۲۲۹۔

۲۔ اسلامی ریاست، اشاعت اوّل، ص۲۶۰۔

مُجۡمَعٌ عَلَيۡهِ اِلٰی قِيَامِ السَّاعَةِ[1] اس میں اجماع کی صحت اور اس کے مطابق فیصلہ دینے پر دلیل ہے اس لیے کہ جب وہ لوگوں پر عادل اور گواہ ہیں تو ہر دور اپنے بعد والوں کے لیے گواہ ہوگا۔ صحابہ کا قول دلیل اور گواہ ہے تابعین پر اور تابعین کا قول بعد والوں پر۔ اور جب امت گواہ ہے تو اس کا قول قبول کرنا واجب ہو گیا۔ جو شخص کہتا ہے کہ اس سے ساری امت مراد ہے اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں قیامِ قیامت تک کوئی بھی مسئلہ مجمع علیہ نہیں بن سکے گا۔

علامہ ابنِ عابدین شامیؒ منکرِ اجماع کے حکم پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَ مِثۡلُهٗ فِیۡ نُوۡرِ الۡعَيۡنِ عَنۡ شَرۡحِ الۡعُمۡدَةِ اَطۡلَقَ بَعۡضُهُمۡ اَنَّ مُنۡكِرَ الۡاِجۡمَاعِ يُكَفَّرُ وَالۡحَقُّ اَنَّ الۡمَسَائِلَ الۡاِجۡمَاعِيَّةَ تَارَةً يَصۡحَبُهَا التَّوَاتُرُ عَنۡ صَاحِبِ الشَّرۡعِ كَوُجُوۡبِ الۡخُمۡسِ وَ قَدۡ لَايَصۡحَبُهَا فَالۡاَوَّلُ يُكَفَّرُ جَاحِدُهٗ لِمُخَالَفَتِهِ التَّوَاتُرَ لَا لِمُخَالَفَةِ الۡاِجۡمَاعِ ثُمَّ نُقِلَ فِیۡ نُوۡرِ الۡعَيۡنِ عَنۡ رِسَالَةِ الۡفَاضِلِ الشَّهِيۡرِ حُسَّامِ جَلَبِیۡ مِنۡ عُظَمَآءِ الۡبُسۡطَامِ السَّلِيۡمِ بۡنِ بَايَزِيۡد خَانۡ مَا نَصَّهٗ. وَ اِذَا لَمۡ تَكُنِ الۡاٰيَةُ اَوِ الۡخَبَرُ الۡمُتَوَاتِرُ قَطۡعِیَّ الدَّلَالَةِ اَوۡ لَمۡ يَكُنِ الۡخَبَرُ مُتَوَاتِراً وَّ كَانَ قَطۡعِيًّا لٰكِنۡ فِيۡهِ شُبۡهَةٌ اَوۡ لَمۡ يَكُنِ الۡاِجۡمَاعُ اِجۡمَاعَ الۡجَمِيۡعِ اَوۡ كَانَ وَلَمۡ يَكُنۡ اِجۡمَاعَ جَمِيۡعِ الصَّحَابَةِ اَوۡ كَانَ اِجۡمَاعَ جَمِيۡعِ الصَّحَابَةِ وَلَمۡ يَكُنۡ قَطۡعِيًّا بِاَنۡ لَمۡ يَثۡبُتۡ بِطَرِيۡقِ التَّوَاتُرِ اَوۡ كَانَ قَطۡعِيًّا لٰكِنۡ كَانَ اِجۡمَاعاً سُكُوۡتِيًّا فَفِیۡ كُلٍّ مِنۡ هٰذِهِ الصُّوَرِ لَايَكُوۡنُ الۡجُحُوۡدُ كُفۡرًا[2] شرحِ عمدہ کے حوالے سے نور العین میں اسی طرح لکھا ہے کہ بعض نے مطلقاً اجماع کے منکر کو کافر قرار دیا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ اجماعی مسائل کے ساتھ کبھی تواتر ہوتا ہے جیسے پانچ ارکان اور کبھی نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کا منکر کافر ہے، تواتر کے انکار کی وجہ سے، نہ کہ اجماع کی مخالفت کی وجہ سے۔ اس کے بعد فاضل چلپی کے رسالے سے نقل کیا گیا ہے کہ جب آیت اور خبرِ متواتر قطعی الدلالۃ نہ ہو یا خبرِ متواتر ہی نہ ہو یا قطعی ہو لیکن اس میں شبہ ہو یا اجماع تمام کا اجماع نہ ہو یا تمام کا اجماع ہو لیکن تمام صحابہ کا اجماع نہ ہو یا تمام صحابہ کا اجماع ہو لیکن قطعی نہ ہو کہ بطریق تواتر ثابت نہ ہو یا قطعی ہو لیکن اجماع سکوتی ہو تو ان ساری صورتوں میں انکار کفر نہ ہوگا۔

۱- تفسیر قرطبی، ج ۲، ص ۱۵۶۔ تفسیر مظہری، تفسیر آیت: و کذالک جعلنکم امۃ وسطا [البقرۃ ۲: ۱۴۳]

۲- الدُّرّ المختار، ج ۴، ص ۲۲۳۔

اجماع کے مسئلے کی تہہ تک پہنچنے اور اس کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لیے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق سارے لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بعض مصنفین کے کلام کے اصل مقصد کو نہ سمجھنے کی بنا پر کچھ لوگ اس کو سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں اور اس انداز سے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں گویا کہ اجماع کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ کچھ اس قسم کا تاثر امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے متعلق دیا جاتا ہے حالانکہ ابن تیمیہؒ تو اس بات کی تصریح کر چکے ہیں کہ 'اہلِ سنت والجماعت' کا فِرَقِ ضالہ سے امتیاز ہی سنت اور اجماع کو تسلیم کرنے کی بنا پر ہے۔

اس سلسلے میں غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ دورِ اختلاف میں ہر فرقے نے اپنے اپنے مسائل پر اجماع کا دعویٰ شروع کیا اور ایسے لوگوں نے بھی اس کا سہارا لیا جنھیں اسلاف کے واقعات، حالات اور اقوال پر نظر نہیں تھی ان لوگوں کے حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے امام احمد نے یہ کہہ دیا کہ 'اس طرح کے مدعیان اجماع کذاب ہیں'۔ مطلقاً دعواے اجماع کو انھوں نے غلط نہیں کہا۔[1]

دوسری چیز اس نکتے کو ذہن نشین کرنا ہے کہ فقہاے اسلام اور مجتہدین نے ہمیشہ اپنی علمی آرا پر کسی دباؤ کو قبول نہیں کیا، نہ انھوں نے اس سلسلے میں دلائل سے قطعِ نظر کسی اور رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے کسی سے اتفاق یا اختلاف کیا ہے۔ اس طرح ان کا اتفاق و اختلاف خالص للٰہیت کے ساتھ ہوا اور ہم تک پہنچ گیا۔ اب تک جو اجماعی مسائل ہم تک پہنچے ہیں وہ ہر طرح کی مصنوعیت، مداخلت اور نفسانیت سے پاک ہیں۔ ان پر اجماع منعقد کرنے کے لیے کسی نے کسی پر دباؤ نہیں ڈالا۔ کوئی اجتماع منعقد نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ ان پر خالصتاً اپنی علمی رائے دی ہے اور ایسا ہی شریعت میں مطلوب بھی ہے۔ مسئلے کی حقیقت سے ناواقف لوگ اس طرح کی صورتِ حال کو ناقص قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ کسی حکومت کو اس بات سے دلچسپی نہ تھی کہ دنیا بھر کے مجتہدین کو ایک جگہ جمع کر کے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں رائے لیتی اس لیے مسائل پر اجماع کا سلسلہ رکا رہا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ کن مسائل پر اجماع ہے اور کن پر نہیں۔ اس سلسلے میں اصل صورتِ حال ہم نے آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اس کی روشنی میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: اصول مذہب الامام احمد بن حنبلؒ۔

ایسی کسی مصنوعیت کے نہ ہوتے ہوئے آزادانہ طور پر جو اجماع ہوا ہوگا وہ اپنے اندر کس قدر وزن رکھتا ہے۔ اس بات کو صرف اس حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ چونکہ خلافتِ راشدہ کے بعد جماعتی نظام درہم برہم ہو گیا تھا، اس لیے اب بلا تحقیق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں مسئلے میں اجماع ہے۔ جبکہ خلافتِ راشدہ کے بارے میں آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں مسائل پر اجماع ہے۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے مصنفین لکھتے ہیں: چونکہ یہ اتفاقِ رائے کسی مجلسِ شوریٰ یا اجتماعِ علما میں نہیں ہوتا بلکہ غیر شعوری طور پر از خود ظہور میں آتا ہے اس لیے کسی مسئلے میں اس کے وجود کا علم گذشتہ حالات و واقعات پر نظر ڈالنے سے ہی ہو سکتا ہے۔[1]

تیسری چیز یہ ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے ہماری علمی تاریخ کا پورا سرمایہ موجود ہے۔ کسی بھی ملک اور کسی بھی علاقے کے کسی مجتہد یا غیر مجتہد نے کسی مسئلے کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ محفوظ ہے حتیٰ کہ ہمارے علما نے اپنے مخالف فرقوں اور ان کے ایسے علما، جن کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، ان کے اقوال و آرا کو بھی اپنی کتابوں میں بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اہلِ سنت و الجماعت [کی کتابوں] سے آپ کو شیعہ کی جملہ اقسام اور خوارج، معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کے عقائد و نظریات سے لے کر فقہی آرا تک ملتی ہیں۔ آج کے اس دور میں جب کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتا یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جو ہمارے اسلاف نے انجام دیا ہے اس کی روشنی میں آج ہم آسانی سے مجمع علیہ مسائل کی ایک طویل فہرست تیار کر سکتے ہیں جو کئی مجلدات پر مشتمل ہو۔

آپ کو امت کے مختلف فرقوں میں وسیع تر اختلافات کے باوجود جو مشترک چیزیں ملتی ہیں، ان کی بنیاد اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ قدرِ مشترک مجمع علیہ ہے۔ آپ اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر بھی اجماعی مسائل کی ایک فہرست تیار کر سکتے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اب اس دور میں اجماع کیسے منعقد ہوگا اور اس کی کیا صورت ہوگی تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اس دور میں اولاً تو یہ ہونا چاہیے کہ پہلے سے مجمع علیہ

۱- اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لفظ اجماع، ص ۱۰۰۹۔

مسائل کو سامنے لایا جائے۔ مثلاً ختمِ نبوت کا مسئلہ پہلے سے مجمع علیہ چلا آ رہا ہے اس لیے اس پر کسی اسمبلی سے قرارداد پاس ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس مسئلے پر اجماع ہو رہا ہے بلکہ یہ معنی رکھتا ہے کہ پہلے سے مجمع علیہ مسئلے پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

دوسرے مرحلے پر یہ کام ہوگا کہ نئے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں دنیا بھر کے ماہرینِ شریعت اسی طرح سے آزادانہ اور علمی رائے دیں جس طرح اسلاف دیتے آئے ہیں۔ کسی ایک ملک کے ماہرینِ شریعت کی قرارداد سے مسئلہ مطلقاً اجماعی نہیں بنے گا اور پھر آج کل اسمبلیاں تو اس سلسلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اس لیے کہ ان کے ممبران 'اہلِ اجماع' نہیں ہیں۔ اہلِ اجماع یا اہلِ حل وعقد علما اور فقہا ہیں۔

اس کی بجائے رابطۂ عالم اسلامی جیسے آزاد علمی ادارے اس سلسلے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۵ء)

مختلف مسالک پر عمل

اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نظام کتاب وسنت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا کِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّةَ نَبِیِّهٖ (مؤطا) میں نے تمھارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم انھیں پکڑے رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت۔

کتاب وسنت ہی کا نام دین ہے اور کتاب وسنت ہی 'حبل اللہ' ہے، جس کو مضبوطی سے پکڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ فرمایا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعاً وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۳) اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور اس سے الگ نہ ہو جاؤ۔

اس لیے جو شخص کتاب وسنت پر عمل کرتا ہے وہ دین پر عمل کرتا ہے۔ کتاب وسنت سے ہٹ کر کسی بھی مسلک کو اللہ تعالیٰ نے اتباع اور اطاعت کے لیے مقرر نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطاعت کے لیے نامزد اور متعین، اللہ کے نبی اور وہ دین ہے جو کتاب وسنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ قرآن وسنت نے اولوا الامر فقہا کی اطاعت کو بھی لازم کیا ہے لیکن وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کتاب وسنت کے تابع ہو، اس سے متعارض یا متصادم نہ ہو۔ اگر کتاب وسنت سے متعارض ہو تو پھر فقہا کی نہیں بلکہ کتاب وسنت کی اطاعت کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (النساء۴:۵۹) اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسولؐ کی اور اپنے صاحبِ امر لوگوں کی۔ پھر اگر تم کسی معاملے پر جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر اور اچھا ہے انجام کے لحاظ سے۔

اس آیت سے واضح ہوگیا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ، اولوا الامر کی اطاعت بھی لازم ہے لیکن یہ غیر مستقل اطاعت ہے۔ اس سے کتاب وسنت کی روشنی میں اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ آخری فیصلہ کتاب وسنت کا ہوگا۔ کتاب وسنت ہی سپریم لا ہے۔ جہاں تک فقہ اور مسلکوں کا تعلق ہے تو یہ کتاب وسنت کی تفسیر، تشریح اور ان سے استنباط کا نام ہے۔ فقہوں میں سے کسی فقہ اور مسلکوں میں سے کسی مسلک کے بارے میں کوئی آیت یا حدیث نہیں آئی۔ مختلف مسلکوں کے ساتھ جو لوگ وابستہ ہوئے وہ اس بنا پر نہیں کہ کسی آیت یا حدیث نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے بلکہ فقہا کی تحقیق اور ان کے علم وعمل اور کردار سے متاثر ہو کر لوگ ان کے ساتھ وابستہ ہوئے ہیں۔ گویا مخصوص مسلک یا فقہ سے وابستگی کی اساس کوئی حکمِ الٰہی نہیں بلکہ فقہا کے دلائل اور عمل سے متاثر ہونا ہے۔

اگر اس بنیاد پر ایک شخص پورے مسلک سے متاثر ہو کر اس سے وابستہ ہوسکتا ہے تو اسی طرح مختلف مسلکوں کے مختلف مسائل کو اسی بنیاد پر اختیار کرسکتا ہے۔ لہٰذا کسی ایک یا چند مسائل میں ایک شخص ایک فقیہ کے دلائل سے متاثر ہو کر ان مسائل میں اس کے ساتھ ہو تو دوسرے مسائل میں دوسرے سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس لیے صاحبِ علم آدمی کے لیے اس بات کا دروازہ کھلا ہے کہ وہ تحقیق کرے، مختلف تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لے اور ان میں سے کسی ایک مسئلے میں ایک عالم اور کسی دوسرے مسئلے میں دوسرے عالم کی تحقیق کو ترجیح دے۔ اس لیے کہ ایک عالم کے لیے حکم یہی ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل کرے، یہ حکم نہیں ہے کہ وہ اپنے علم کی بجائے دوسرے شخص اور محقق کے علم پر عمل کرے۔

لیکن ایک عام آدمی کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ صاحبِ علم آدمی سے پوچھ کر اس کی رہنمائی اور تعلیم کے مطابق عمل کرے۔ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل ۱۶:۴۳) پس تم ذکر والوں (علما) سے پوچھو اگر خود نہیں جانتے۔

لیکن اس کے لیے بھی کسی خاص مسلک کے عالم سے رجوع کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ

جس عالم پر اعتماد رکھتا ہو اس سے رجوع کرے۔ اس لیے عالم کی طرح ایک عام آدمی بھی اپنے شہر کے مختلف مسالک کے علما سے متاثر ہو سکتا ہے اور مختلف مسائل میں ان کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور نیک نیتی سے ان سے استفتا کر کے ان کے فتویٰ پر عمل کر سکتا ہے۔ اصولی بات یہی ہے اور عمل بھی اسی اصول پر ہو رہا ہے۔ لوگ جس عالم کے علم سے متاثر ہوتے ہیں اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اگر کوئی عالم کسی مسئلے میں تحقیق کرتا ہے یا کسی کی تحقیق سے متاثر ہو جاتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی تحقیق اور اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے علم و عمل سے صرف ان کے تلامذہ ہی نہیں بلکہ وہ علاقے بھی متاثر ہوئے جن میں یہ ائمہ اور ان کے شاگرد رہتے تھے۔ پورا مشرق امام ابوحنیفہؒ پورا مغرب (شمالی افریقہ) امام مالکؒ، مصر و شام امام شافعیؒ اور حجاز امام احمدؒ بن حنبل سے متاثر ہو گیا اور اسی لیے ان ممالک میں ان کی فقہیں رائج ہو گئیں۔ ایسا قدرتی طور پر ہوا ہے۔ علما اور فقہا کے کسی فیصلے کی وجہ سے نہیں ہوا، نہ کسی میٹنگ میں یہ چیز طے ہوئی ہے کہ ان علاقوں کے سارے لوگ ان کی فقہ کی تقلید کریں اور نہ کسی میٹنگ سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے جس بنیاد پر لوگ ایک فقہ اور ایک مسلک سے وابستہ ہوئے اور ہوتے ہیں اسی بنیاد پر وہ اس مسلک کی کسی بات کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کی بات کو اپنا سکتے ہیں۔ کسی خاص مسلک کی ایک بات کو کسی بھی صورت میں نہ چھوڑنا، اگرچہ اس کے مقابلے میں دوسری بات پر کتاب و سنت سے واضح دلائل موجود ہوں، کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے۔ یہ بات کہ کوئی شخص یا مسلک اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لیے مقرر کردہ نہیں ہے، بالکل واضح ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے چار یا پانچ مسلک طے شدہ اور مقرر نہیں ہیں کہ ان سے باہر کوئی نہ جائے۔ ائمۂ اربعہ اور امام ابوحنیفہؒ کی تقلید لوگوں نے اپنی آزاد مرضی سے ان کے علم سے متاثر ہو کر اس بنا پر کی ہے کہ یہ اولوا الامر کا مصداق ہیں جن کی مشروط اطاعت کا حکم ہے۔ یہ تاثر عارضی نہیں مستقل ہے۔

دنیا بھر کے مسلمان ان چاروں ائمہ کے ساتھ اپنی عقیدت کی وجہ سے وابستہ ہو گئے ہیں، چاروں کے علاوہ باقی ائمہ سے وابستہ لوگوں کی تعداد تھوڑی ہے اور ان چاروں میں سے امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ وابستہ مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً ایسے محققین سامنے آتے رہتے ہیں جو حنفی ہوتے ہوئے ایک مسئلے میں تحقیق کرتے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑ کر اس مسئلے میں کسی دوسرے مسلک یا اپنی تحقیق پر عمل کرتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کے جواز پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ علامہ ابنِ عابدین شامی، علامہ ابنِ ہمامؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی کسی معین مسلک کو اختیار کرے تو کیا وہ مسلک اس کے لیے لازم ہو جاتا ہے؟ اس کے جواب میں بعض نے کہا لازم ہو جاتا ہے اور بعض نے کہا کہ لازم نہیں ہوتا اور یہی بات زیادہ صحیح ہے۔[1]

اس میں جو چیز منع ہے وہ خواہشِ نفس کی پیروی ہے کہ جو چیز خواہشِ نفس کے مطابق ہو یا من پسند ہو اس پر عمل کرے۔ علامہ ابنِ عابدین شامیؒ نے تاتار خانیہ کے حوالے سے ابوبکرؒ جوزجانی کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے جو مذکورۂ بالا اصول کے بارے میں مضبوط دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں علامہ شامیؒ کی عبارت کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

تاتارخانیہ میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ابوبکرؒ جوزجانی کے زمانے میں ایک حنفی المذہب شخص نے ایک اہلِ حدیث آدمی کو اس کی لڑکی کے بارے میں نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس نے پیغام کو منظور نہ کیا اور کہا کہ اگر تم اپنا حنفی مسلک چھوڑ کر اہلِ حدیث کا مسلک قبول کرو گے تو پیغام منظور ہے، چاہو تو قراءت خلف الامام اور رفع یدین پر عمل کرو۔ چنانچہ حنفی نے ایسا کر لیا اور نکاح ہو گیا۔ ابوبکرؒ جوزجانی سے جب اس واقعے کے متعلق سوال کیا گیا تو تھوڑی دیر تک خاموشی اختیار کرنے کے بعد فرمایا کہ نکاح تو جائز ہے مگر مجھے اس شخص کے بارے میں خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں نزع کے وقت اس کا ایمان سلب نہ ہو جائے، کیونکہ اس نے اس مسلک اور مذہب کو چھوڑا جو اس کے نزدیک حق تھا اور مردار گندی دنیا کی خاطر اس نے حق مذہب کی توہین کر ڈالی۔ البتہ کوئی شخص اگر اپنے اختیار کیے ہوئے مسلک کو اجتہادِ صحیح کی بنا پر چھوڑ دے تو یہ ایک نیک اقدام ہے اور ایسا کرنے والا اللہ کے پاس

۱- ردالمحتار، ج۱، ص۱۱۹، طبع دار المعرفۃ، بیروت۔

سے اجر کا مستحق ہوگا۔ لیکن دلیل کے بغیر محض دنیوی لالچ اور نفسانی خواہش کی خاطر کوئی شخص ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف منتقل ہو تو یہ یقیناً بری چیز، گناہ کا کام اور لائق تعزیر جرم ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسے امر کا ارتکاب ہے جو دین میں منکر ہے اور اس میں دین کا استخفاف اور مذہب کے ساتھ کھلا مذاق ہے۔[1]

علامہ شرنبلانیؒ ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف منتقل ہونے کے جواز کی مثالیں بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ہم نے جو مثالیں دی ہیں ان سے درج ذیل حقیقتیں واضح ہوتی ہیں:

۱- انسان پر متعین مسلک کو اختیار کرنا لازم نہیں ہے۔

۲- آدمی اپنے مسلک کے خلاف دوسرے مسلک کی تقلید میں اس کے مسائل پر عمل کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس مسلک کی تمام شرطوں کی رعایت کرے۔

۳- وہ دو مختلف واقعات میں دو مختلف متضاد احکام پر عمل کرسکتا ہے، ایک واقعے میں ایک مسلک اور دوسرے واقعے میں دوسرے مسلک کے۔

۴- جو عمل اس نے سابق امام کی تقلید میں کیا ہے اسے دوسرے امام کی تقلید کے بعد باطل نہیں کیا جاسکتا۔ جو نماز شافعی مسلک کے مطابق پڑھی حنفی مسلک اختیار کرنے کے بعد اس کی قضا نہیں کرے گا۔

۵- عمل کرنے کے بعد دوسرے مسلک کی تقلید کی جاسکتی ہے، مثلاً ایک شخص نے اس خیال سے نماز پڑھی کہ میرے اپنے مسلک و مذہب میں صحیح ہے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ مجھے غلطی لگی ہے، یہ نماز میرے مذہب و مسلک میں صحیح نہیں ہے۔ البتہ ایک دوسرے مذہب کے مطابق صحیح ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ دوسرے مسلک و مذہب کی تقلید کرتے ہوئے اسے صحیح سمجھے اور اسی پر اکتفا کرے اور نماز کا اعادہ نہ کرے۔ چنانچہ بزازیہ میں امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ حمام کے پانی سے غسل کر کے جمعہ کی نماز

۱- ردالمحتار، ج۶، ص۱۲۸ مطلب فیمن ارتحل الی غیر مذھبه، باب فی التعزیر، کتاب الحدود۔

پڑھی۔ بعد میں ان کو بتایا گیا کہ حمام کے کنویں میں چوہا گر کر مر گیا تھا۔ آپ نے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اپنے مدنی بھائیوں کے قول پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو مٹکوں تک پہنچے تو نجس نہیں ہوتا۔[1]

علامہ شرنبلانیؒ کے قول سے [دو] باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ لازم صرف یہ ہے کہ عمل کسی مجتہد امام کی پیروی میں کیا جائے، خواہ کوئی بھی ہو۔ دوسرا یہ کہ جس طرح کلی طور پر ایک مذہب و مسلک سے دوسرے مذہب و مسلک میں انتقال جائز ہے۔ اسی طرح جزوی طور پر بھی بعض مسائل میں انتقال کی شرائط کو ملحوظ رکھ کر جائز ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

اگر کوئی شخص ایک متعین مذہب کو اختیار کرے خواہ وہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہو یا کسی دوسرے کا، تو آیا ہمیشہ اس پر قائم رہنا بھی واجب ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ واجب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں، کیونکہ واجب وہی چیز ہوتی ہے جو خدا نے واجب کی ہو اور خدا نے کسی شخص پر یہ واجب نہیں کیا کہ وہ کسی مذہب کے ساتھ ہمیشہ لازم رہے گا۔ ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ میرا رجحان بھی اسی کی طرف ہے کہ استمرار لازم نہیں ہے کیونکہ لزوم کے لیے شرعی دلیل کوئی نہیں۔[2]

صاحبِ مسلّم الثبوت علامہ محبّ اللہ بہاری کا بھی یہی مسلک ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اَشْبَہ یہ ہے کہ اگر مذہب کے کسی مسئلے پر اس نے فکر و تامل اور اطمینانِ قلب سے عمل کیا ہو تو جب تک یہ اطمینان باقی ہو اس سے رجوع نہ کرے۔ دوسرے مسائل میں دوسرے امام کی تقلید جائز ہے اور یہ مختار قول ہے۔ کیونکہ دینی مسائل میں سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ کبھی ایک عالم اور کبھی دوسرے عالم سے استفتا کر کے اس پر عمل کیا کرتے تھے۔[3]

فقہا نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر دلیل اور شرعی غرض کی بنیاد پر ایسا ہو تو جائز ہے، اور اگر اپنی اغراض کی خاطر یا مذاہب کے استخفاف اور ان کے ساتھ استہزا کے طور پر ایسا کیا

۱۔ ردالمحتار، ج ۱، ص ۷۔

۲۔ مسلّم الثبوت، ص ۲۹۲۔

۳۔ مسلّم الثبوت، ص ۲۹۲۔

جائے تو ناجائز اور موجبِ تعزیر ہوگا۔اسی طرح کی صورتوں کے بارے میں فقہا نے فرمایا: اِنِ ارْتَحَلَ اِلٰی مَذْهَبِ الشَّافِعِیِّ یُعَزَّرُ[1] (اگر حنفیت سے شافعیت کی طرف منتقل ہوا تو اسے تعزیری سزادی جائے گی۔) اسی طرح: اَلرُّجُوْعُ عَنِ التَّقْلِیْدِ بَعْدَ الْعَمَلِ بَاطِلٌ اِتِّفَاقاً وَّهُوَ الْمُخْتَارُ فِی الْمَذَاهِبِ (ایک بات پر عمل کرنے کے بعد ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کیا تو یہ باطل ہے) کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسئلے میں ایک امام کے مسلک کے مطابق عمل کر لیا ہو، اس کے بعد اس مسئلے میں دوسرے مسلک کو اختیار کر لیا ہو تو سابقہ مسلک کے مطابق جو عمل ہوا ہے اسے دوسرے مسلک کے مطابق دہرانے کی ضرورت نہیں۔ماضی میں جو سابق مسلک کے مطابق کیا ہے وہ ادا ہو گیا، آیندہ کے لیے نئے مسلک کے مطابق عمل کرے۔ابوبکرؒ جوز جانی فرماتے ہیں: لَوْ اَنَّ رَجُلًا بَرِیَٔ مِنْ مَّذْهَبِهٖ بِاِجْتِهَادٍ وُّضِّحَ لَهٗ مَحْمُوْدًا مَّاجُوْرًا[2] اگر کسی شخص پر اجتہاد کی بنا پر ایک بات واضح ہوئی ہو اور وہ اس وجہ سے اپنے فقہی مذہب سے تعلق ختم کرے تو یہ نیک اقدام ہے اور موجبِ اجر کام ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: اِذَا کَانَ ارْتِحَالُهٗ لَا لِغَرَضٍ مَحْمُوْدٍ شَرْعاً یعنی انتقال موجبِ تعزیر جرم اس وقت ہوگا، جب کہ وہ اچھی دینی غرض کے لیے نہ کیا گیا ہو۔

اسی طرح ایک ہی عمل میں دو ایسی چیزیں جمع ہو جائیں کہ اس کے نتیجے میں وہ عمل کسی کے نزدیک بھی صحیح نہ ہو، تلفیق کہلاتا ہے۔اگر ایک آدمی نے پورے سر کا مسح نہیں کیا بلکہ اس کے ایک حصے کا کیا، اور اس مسئلے میں امام شافعیؒ کے مسلک کو لیا اور وضو کتے کے جھوٹے پانی سے کیا اور اس مسئلے میں امام مالکؒ کے مسلک کی پیروی کی۔اسی طرح وضو دونوں اماموں میں سے کسی امام کے مسلک پر بھی صحیح نہ ہوا۔امام مالکؒ کے مسلک پر اس لیے نہیں کہ پورے سر کا مسح نہیں ہوا اور امام شافعیؒ کے مسلک پر اس لیے نہیں کہ کتے کے جھوٹے سے وضو اور مسح کیا جو ناپاک ہے۔اس وضو کو

۱- ردالمحتار، ص ۱۲۸، کتاب الحدود، باب فی التعزیر۔

۲- ایضاً۔

جائز کرنے کے لیے سر کی مقدار کے مسئلے میں امام شافعیؒ کی، اور پانی کی طہارت ونجاست کے معاملے میں امام مالکؒ کی رائے کو اپنا لیا۔ اس کو فقہی اصطلاح میں تلفیق کہتے ہیں۔ اس لیے ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف وہ انتقال جو ایک ہی عمل میں تلفیق اور کئی مسلکوں کے جوڑنے کو مستلزم ہو، ناجائز اور موجبِ تعزیر ہے۔

اسی طرح ایسے لوگ جن میں اجتہاد کی اہلیت سرے سے نہ ہو، وہ کتاب وسنت کا گہرا اور وسیع علم نہ رکھتے ہوں، ایک مسئلے کی پوری تحقیق نہ کر سکتے ہوں تو ان کے لیے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ شریعت اور احکامِ شرعیہ کو اپنی من مانی آرا کا بازیچہ بنائیں۔ یہ کام صرف ایسے ماہرینِ شریعت کا ہے جنھوں نے علومِ عربیہ اسلامیہ میں اہلِ علم مفسرین ومحدثین اور فقہا کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے ہوں اور علم وفقہ کے ساتھ طویل وابستگی کے نتیجے میں ان میں ملکۂ علمیہ اور ذوقِ تحقیق پیدا ہو گیا ہو۔ وہ محض فنی عالم نہ ہوں بلکہ ان میں للّٰہیت اور تقویٰ کی صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہوں، جو استدلال واستنباط کی صلاحیت رکھنے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

> جو شخص استدلال کی قدرت رکھتا ہو بعض علما کہتے ہیں کہ اس پر تقلید مطلقاً حرام ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ مطلقاً جائز ہے، اور بعض کے نزدیک صرف بوقتِ ضرورت جائز ہے، مثلاً وقت میں اتنی گنجایش نہ ہو کہ تحقیق کر کے دلیل سے مسئلہ نکال سکے۔ یہی قول سب سے زیادہ معتمد ہے۔[1]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر تحقیق کی بنیاد پر دوسرے مسلک کی بات کو کوئی آدمی اختیار کرنا چاہے تو اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ کہ وہ تحقیق کا اہل ہو۔ عام آدمی کسی بھی محقق عالم سے، جس کے علم پر اسے اعتماد ہو، پوچھ کر عمل کر سکتا ہے اگرچہ وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتا ہو، جب کہ وہ اپنے علم کے مطابق فتویٰ دے۔ لیکن خواہشِ نفس کی بنا پر مذاہب کی آسان آسان باتوں کو منتخب کر کے ان کو مسلک بنانا، یا ایک مسلک کو یا مسلک کے کسی مسئلے کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کو اختیار کرنا، یا ایک ہی عمل کے بعض مسائل میں کسی ایک فقیہ اور کسی میں دوسرے فقیہ کے مسلک کی آڑ

۱- فتاویٰ ابن تیمیہ۔

لینا، کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، جون ۲۰۰۲ء)

سوال: ہم اپنے معاشرے میں اپنے آپ کو فخریہ طور پر سنی، حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی، اہلِ حدیث، شیعہ اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہی سیدھے راستے پر ہے۔ لیکن کوئی اپنے آپ کو صرف مسلم کہلوانا پسند نہیں کرتا حالانکہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں مسلم یا مومن کہا ہے۔ موجودہ حالات کو مدنظر رکھ کر قرآن و حدیث کا صحیح فیصلہ مرحمت فرمائیں۔ کیا ہم مسلم ہی اچھے لگتے ہیں یا پیوندی مسلم؟ مجھے امید ہے کہ آپ مدلل جواب دیں گے۔

جواب: یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ فرقہ واریت سے بالاتر رہ کر ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ حنفی، شافعی وغیرہ فرقے نہیں ہیں بلکہ علمی حلقے ہیں۔ انھیں 'علمی حلقوں' کی سطح تک رکھنے میں تو کوئی حرج نہیں، جیسے علی گڑھ کے فارغ التحصیل کا اپنے آپ کو 'علیگ' لکھنا 'ندوہ' کے فارغ التحصیل کا اپنے آپ کو 'ندوی' لکھنا قابلِ اعتراض نہیں ہے، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے علمی مدرسہ سے منسلک ہونے والا اپنے آپ کو حنفی کہہ سکتا ہے۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کر تحزب اور تعصب میں مبتلا ہونا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ [الحج ۲۲:۷۸] (اس نے تمھارا نام مسلمان رکھا ہے) کے بھی منافی ہے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۸۵ء)

خلافت کا استحقاق

سوال: شیعہ وسنی کے مسائل پر جو بحث ہوتی رہی ہے اس سے متاثر ہو کر میرے ایک دوست نے شیعیت قبول کر لی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے چند سوالات کیے، بقول ان کے اگر کوئی صاحب ان کے جوابات دے کر مطمئن کر دیں تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ سوالات حسبِ ذیل ہیں:

۱- حضرت علیؓ کے ہوتے ہوئے دوسرے صاحبان کس طرح خلیفہ قرار پائے؟

۲- مشاورت میں علیؓ کے مقابل کس طرح دوسرے صاحبان اپنے آپ کو علیؓ کے ہوتے ہوئے خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟

۳- خُم غدیر کا خطبہ جس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی شان میں یہ فرمایا کہ علیؓ کو مجھ سے ایسی ہی محبت ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ہارون سے تھی، فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس کے باوجود علیؓ دوسروں کے ہم پلہ قرار دیے جا رہے ہیں کیوں؟

۴- حضرت عثمان غنیؓ جیسے صاحبوں کے ہوتے ہوئے بھی آلِ نبیؐ کے گھر میں فقر وفاقہ کیوں ہوا؟

۵- اعلیٰ کے ہوتے ہوئے ادنیٰ کی روایات کو کیوں لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے طریقۂ عبادت ہر دو فرقوں میں مختلف ہے؟

یہاں جب میں نے ادنیٰ او اعلیٰ کی تشریح چاہی تو ہمارے دوست نے کہا کہ حدیث کے معاملے میں غلام پر کیوں اعتماد کیا جائے۔ حضرت علیؓ کی اولاد وغیرہ سے کیوں نہ پوچھا جائے؟ اسی طرح ایک بحث کے دوران ان ہی صاحب نے مولانا مودودیؒ پر ایک بہتان لگایا کہ مولانا نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں (خاکم بدہن) گستاخانہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں انھوں نے حوالہ خلافت وملوکیت کا دیا لیکن وہ اپنی بات ثابت نہیں کر سکے۔

جواب: حضرت علیؓ کے بجاے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، کو کیوں خلیفہ بنایا گیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے خلیفہ بنانا تھا انھوں نے بنادیا، ان کے ساتھ تعاون کیا اور اس طرح انھوں نے اپنا دور گذار لیا۔ یہ سوال کسی کو کرنا تھا یا اس سوال کی ضرورت تھی تو آج نہیں، بلکہ اُس وقت تھی تاکہ غلطی کی صورت میں اس کا ازالہ ہوتا اور لوگ مذکورہ حضرات کے بجاے کسی اور کو ان کی جگہ منتخب کر لیتے لیکن اس وقت تو یہ سوال نہ اٹھایا گیا۔ حضرت علیؓ نے بھی عوام کے سامنے یہ مسئلہ نہیں رکھا اور نہیں کہا کہ ان سے غلطی ہوئی ہے، بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایسی متفق علیہ خلافتیں یا حکومتیں شاید ہی کبھی وجود میں آئی ہوں۔ اب یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اس دور کے لوگوں کو، جن کے سامنے خلفاے ثلاثہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود تھے جو انھیں ہم سے زیادہ جانتے تھے اور اس بات کے زیادہ ضرورت مند بھی تھے کہ انھیں اچھے حکمران ملیں، غلطی لگ گئی اور انھوں نے صحیح انتخاب نہیں کیا تھا۔ اگر بالفرض انھوں نے صحیح انتخاب نہیں بھی کیا تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ نقصان جو بھی تھا انھی کا تھا۔ جب رعیت خود ایسے حکمرانوں پر راضی ہو تو کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ کیا وہ ان لوگوں کا خود ان سے زیادہ خیر خواہ ہونے کا مدعی ہے اور ان سے زیادہ ان کے حکمرانوں کے متعلق معلومات رکھتا ہے ان دونوں دعووں کو کوئی بھی ذی عقل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس کی بہ نسبت یہ بات زیادہ معقول ہوگی کہ بعد میں آنے والے اپنے دور کی فکر کریں اور ان مرحومین کی فکر میں نہ گھلیں جن کو اب ان کی فکرمندی کا نہ تو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ان کی فکرمندی کا فریضہ انھیں سپرد کیا گیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ لوگ خلفاے ثلاثہ کی خلافت پر راضی نہ تھے لیکن یہ حضرات قوت کے بل بوتے پر مسلط ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ اولاً تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔ ثانیاً اگر ایسا ہوتا تو ان خلافتوں کے خلاف بغاوت ہوتی۔ اور نہیں تو کم از کم حضرت علیؓ جو بقولِ شیعہ خلیفہ بلافصل تھے، ناحق خلفا کے خلاف میدان میں نکلتے۔ بلکہ جب اس کا موقع آیا اور حضرت علیؓ کی برحق خلافت (جو خلفاے ثلاثہ کی خلافت کے بعد انھیں ملی اور انھی لوگوں نے انھیں خلیفہ منتخب کیا جنھوں نے خلفاے ثلاثہ کو

منتخب کیا تھا) کو امیر معاویہؓ نے چیلنج کیا تو وہ ان کے خلاف میدان میں نکلے اور دو مشہور جنگیں برپا ہوئیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں دونوں طرف سے مسلمان مارے گئے۔ اگر خلفاے ثلاثہ کی خلافتیں حضرت علیؓ کے لیے چیلنج ہوتیں اور ان خلافتوں نے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل غصب کی ہوتی تو حضرت علیؓ ان کے خلاف میدان میں نکلتے۔ اگر غاصبین کے خلاف نکلنا ضروری تھا پھر خلفاے ثلاثہ کے خلاف خروج کیوں نہ کیا؟ اور نکلنا ضروری نہیں تھا تو امیر معاویہؓ کے خلاف خروج کیوں کیا۔ اس سوال کا یہ جواب اس وقت ہے جب شیعہ حضرات خلافت کو ایک انتخابی منصب قرار دیں اور امتِ مسلمہ کے لیے یہ حق تسلیم کریں کہ وہ جسے اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہے مقرر کر سکتی ہے جیسے کہ اہل سنت والجماعت کا یہی نظریہ ہے اور قرآن پاک، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور تاریخِ اسلام سے اسی نظریہ خلافت کی تائید ہوتی ہے۔

قرآنِ پاک صاف اور صریح الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی فرد کو اپنا نائب مقرر نہیں کیا بلکہ پوری امت آپؐ کی نائب ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا [البقرۃ ۲:۱۴۳] اور اس طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو امتِ وسط (اعلیٰ امت) بنایا ہے تاکہ تم دنیا بھر کے انسانوں پر حق کے گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ [آل عمران ۳:۱۱۰] اب تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِىْ وَلَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا [النور ۲۴:۵۵] اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں اسی طرح خلافت دے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور وہ ان کے لیے اس کے پسند کردہ دین کی بنیادوں کو مضبوط کر دے گا اور ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا وہ میری

بندگی کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

جب خلافت اور جانشینی امت کے لیے ہے اس کے کسی فرد کے لیے نہیں تو اس سے خود بخود یہ لازم آتا ہے کہ امت اپنی خلافت چلانے کے لیے اپنے میں سے کسی فرد کا انتخاب کرے۔ وہ فرد جو اس طرح سے منتخب ہو کر آگے آئے گا وہ برحق خلیفہ ہوگا اور جو خود بخود لوگوں پر مسلط ہو جائے وہ خلیفہ نہیں بلکہ امت کے حقِ خلافت کو غصب کرنے والا ہوگا اور وہ اس بات کا اہل نہیں ہوگا کہ اسے خلیفۃ المسلمین کہا جائے بلکہ وہ مَلِک اور بادشاہ قرار پائے گا۔ خلفاے ثلاثہ اور حضرت علی اور حضرت حسن رضوان اللہ علیہم اجمعین چونکہ منتخب تھے اس لیے یہ سب خلفاے راشدین کہلائے اور بنو امیہ اور بنو عباس اور بنو عثمان منتخب نہ تھے اس لیے بادشاہ کہلائے اور ان کا دور دورِ ملوکیت کہلایا۔

یہ نظریۂ خلافت حکومت کے ہم معنی ہے یعنی مسلمان اسلام کی بنیاد پر دوسری قوموں سے علیحدہ قوم ہیں ان کا اپنا معاشرہ، اپنی سوسائٹی، اپنی حکومت اور اپنا نظام ہے لہٰذا ایک معاشرہ جس کی ضرورت حکومت ہے اسے مسلمان خود قائم کریں۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ایسی ہی خلافت کا وعدہ کیا ہے جس میں ایسی حکومت ہو جو دین کو اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ امن و امان قائم کرے اور خود بھی اسے دشمن کا ڈر نہ رہے اور وہ اللہ کی بندگی کرنے والی اور شرک و کفر سے محفوظ ہو۔

لیکن شیعہ اس طرح کی خلافت کے قائل نہیں ان کے نزدیک اصل خلیفہ امتِ مسلمہ نہیں، بلکہ حضرت علیؓ اور بارہ ائمۂ معصومین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں خلیفہ بنایا ہے اس لیے امت کا کام خلیفہ منتخب کرنا نہیں بلکہ اللہ کے منتخب کردہ خلیفہ کو ماننا ہے۔

شیعہ حضرات نے یہ نظریہ اس لیے اختراع کیا ہے کہ پہلے نظریے کے مطابق وہ خلفاے ثلاثہؓ کی خلافت پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ اس کے مطابق امت کو خلیفہ منتخب کرنے کا حق تھا اور اس نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے خلفاے ثلاثہ کو منتخب کیا اور چوتھے نمبر پر حضرت علیؓ کو بھی منتخب کیا۔ تاریخ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ یہ خلافتیں عوام کی رضامندی سے قائم ہوئیں اور رضامندی سے چلیں اور تمام مسلمانوں نے اہلِ بیت سمیت ان سے تعاون کیا اس لیے

مجبوراً شیعہ حضرات نے یہ نظریہ نکالا کہ خلافت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ اور ائمۂ معصومین کو خلیفہ بنایا تھا لیکن مسلمانوں نے اللہ کے فیصلے کے بجاے اپنا فیصلہ نافذ کیا اور اللہ کے مقرر کردہ خلفا کو مسترد کردیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو خلافت دی تھی وہ قائم نہ ہوسکی اس طرح اللہ تعالی نے جس خلافت کا وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ [النور۲۴:۵۵] کے الفاظ سے وعدہ کیا تھا وجود میں نہ آسکی۔

شیعہ حضرات کا یہ نظریہ اولاً تو ان مذکورہ آیات کے خلاف ہے۔

ثانیاً جس خلافت کی مسلمانوں کو ضرورت تھی اور جس کا اللہ تعالیٰ نے اُن سے وعدہ کیا تھا، شیعہ نظریے کے مطابق وہ ضرورت ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

ثالثاً اس نظریے کی رو سے پوری امتِ مسلمہ اہلِ بیت سمیت خدا کی باغی بن جاتی ہے۔

رابعاً یہ نظریہ درست ہوتا تو حضرت علیؓ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، اپنے دور میں امت سے کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خلیفہ بنایا ہے اس لیے امت کو خلافت کے مسئلے پر غور وفکر کرنے اور مشاورت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت خدا کی طرف سے تقرری کی علامتوں کو جاننے کی ہے اور یہ ہیں وہ علامات جن کی بنا پر ہم خلافت کے مدعی ہیں۔ لیکن شیعہ سنی لٹریچر اس بات پر متفق ہے کہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ نے اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ شیعہ سنی روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے آپؓ کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی تو آپؓ نے فرمایا کہ یہ کام مہاجرین اور انصار، جو اہلِ حل وعقد ہیں جنھوں نے ابوبکرؓ وعمرؓ کو خلیفہ بنایا تھا، کی صوابدید پر ہے وہ جسے خلیفہ بنائیں وہی خلیفہ ہوگا۔ آپؓ کے الفاظ یہ ہیں: اِنَّ ھٰذَا اَمۡرُکُمۡ لَیۡسَ لِاَحَدٍ فِیۡہِ حَقٌّ اِلَّا اَنۡ اَمَّرۡتُمۡ یہ تمھارا کام ہے اس میں کسی کا کوئی حق نہیں الا یہ کہ تم اسے امیر بنادو[1]۔

خامساً اس طرح کی خلافت جو بلا اقتدار ہو اس وعدے کا مصداق نہیں بنتی جس طرح کی خلافت کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایسی خلافت کا وعدہ کیا ہے جو با اقتدار ہو جس کا

۱- تاریخ طبری، ص۱۵۵-۱۵۷۔

وجود شیعہ نظریے کے مطابق ابھی تک نہیں ہوا۔ اگر حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے بعد خلیفہ بنے ہیں تو ان کی یہ خلافت مسلمانوں کے انتخاب سے قائم ہوئی ہے، اللہ کی طرف سے تقرر کی بنا پر نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (شیعہ مذہب کے مطابق)، حضرت علیؓ کا خلافت پر تقرر پہلے سے تھا۔ اس بنیاد پر انھیں خلیفہ بنایا گیا ہوتا تو شروع سے انھیں خلافت مل گئی ہوتی یا وہ اس بنیاد پر خلافت کا دعویٰ کرتے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور نہ تاریخ میں حضرت علیؓ کی خلافت کے بارے میں تواتر سے تصریح ہوتی کہ انھوں نے اللہ کی طرف سے تقرری کا دعویٰ کیا اور لوگوں نے اس بنا پر ان کی خلافت تسلیم کی۔ اور اگر خلافت بلا اقتدار پر ان حضرات کو فائز کیا گیا تھا نہ کہ خلافت با اقتدار پر تو پھر یہ ایک روحانی اور علمی قسم کی خلافت ہوئی جیسے کہ شیعہ علما نے لکھا ہے، تو ایسی صورت میں یہ سوال لغو ہو جاتا ہے کہ ان کے بجائے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو کیوں خلافت دی گئی۔ اس لیے کہ انھیں جو خلافت دی گئی وہ خلافت بمعنی حکومت کے ہے اور یہ خلافت حضرت علیؓ کے پاس نہ تھی جسے چھینا گیا ہو۔ ان کے پاس تو روحانی اور علمی خلافت تھی (بقول شیعہ) اور یہ چھیننے کی چیز نہیں ہے۔ پھر یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضرت علیؓ کو روحانی علمی فیض پہنچانے سے روکا گیا تھا اور ان پر اس میدان میں کوئی پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس کے برعکس اس سلسلے میں حضرت علیؓ سے مشورے ہوتے تھے اور ان کی قدر کی جاتی تھی۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ہے تو یہ روحانی اور علمی خلافت، لیکن لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں اور حکومت انھیں سپرد کریں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے نفع کے بجائے نقصان ہے کہ امت کو ہمیشہ کے لیے خلیفہ کی پہچان کی آزمایش سے دوچار کر دیا جائے اور ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے بجائے اس مشکل میں ڈال دیا جائے تاکہ وہ کبھی بھی اس میں کامیاب نہ ہوں۔ جیسے اس نظریے کے مطابق امت ہمیشہ سے اب تک اس میں ناکام ہے اور اپنی ضرورت دوسرے طریقوں سے پوری کر رہی ہے، اس لیے کہ حکومت کے بغیر تو گزارہ نہیں۔ گویا خدا کی دی ہوئی خلافت تو بے کار گئی اور کام اس کی بجائے دوسری طرح کی حکومت سے چلایا گیا۔ اس طرح تو یہ

خلافت رحمت کی جگہ زحمت بن گئی کہ کام بھی نہ آئی اور امت اس کی معرفت میں ناکام ہوکر گناہ گار بھی ہوگئی۔ اس طرح کی خلافت تو نبوت کی طرح کی آزمائش ہے۔ اگر ایسی خلافت جاری کرنی تھی تو اس کی بجائے سلسلۂ نبوت ہی جاری کر دیا جاتا۔

۲- آپ کے دوست کی دوسری بات کہ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ وَ اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَانَبِیَّ بَعْدِیْ [جو مجھے دوست رکھے اس کا علی بھی دوست ہے۔ اور آپ کا میرے ساتھ وہی تعلق ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھا، لیکن بات یہ ہے کہ میرے بعد نبی نہیں۔] سے حضرت علیؓ کی خلافت ثابت ہوتی ہے درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینے میں نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے لیکن منافقین جو بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے انھوں نے حضرت علیؓ کو بھی اپنے زمرے میں شامل کرتے ہوئے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ وہ بھی بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے۔ اس طرح ان منافقین نے حضرت علیؓ کے اخلاصِ ایمان کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رد میں فرمایا کہ جو مجھ سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہے وہ حضرت علیؓ سے بھی دوستی کرے اس لیے کہ وہ مخلص مومن ہیں اور اہلِ ایمان ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (التوبہ۹:۷۱) اور آپؐ نے فرمایا کہ میرا اسے وقتی طور پر مدینے میں اپنا نائب بنا کر چھوڑنے سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مستقل خلیفہ ہیں اس لیے کہ مستقل اور نامزد خلیفہ تو نبی ہوسکتا ہے اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ جب نبوت کا دروازہ بند ہو جائے تو افراد کی بجائے امت خلیفہ ہوتی ہے۔ اس روایت سے تو الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ خلیفہ نہیں ہوں گے اس لیے کہ فرد کی خلافت کا سلسلہ بایں معنی کہ اللہ اسے نامزد کرے، ختمِ نبوت کے ساتھ ختم ہوگیا۔

۳- آپ کے دوست کا تیسرا سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر چولہا نہیں جلتا تھا درآں حالیکہ حضرت عثمانؓ لاکھوں کے مالک تھے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آپؐ کا فقر اختیاری

تھا۔ آپؐ کے پاس حضرت عثمانؓ اور دیگر اصحاب اپنا مال لاتے تھے لیکن آپؐ اسے اپنے اوپر خرچ کرنے کے بجائے فی سبیل اللہ خرچ کر دیتے تھے اور آپؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دوسرے صاحبِ مال لوگ بھی اپنا مال فی سبیل اللہ قربان کرتے تھے۔

۴- چوتھا سوال کہ اعلیٰ کی بجائے ادنیٰ کی روایت کیوں لیتے ہیں تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت خلافت وامامت کے مسئلے میں اعلیٰ کی روایات بلکہ متواتر روایات کو بنیاد بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت علیؓ کی روایات ہم نقل کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے دوست اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق نسب اور نسل کی بنیاد پر کرتے ہیں تو یہ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ [مسند احمد، ج ۵، ص ۴۱۱] اگر نیکی میں اعلیٰ اور ادنیٰ ہونا مراد ہو تو اس لحاظ سے اہلِ سنت اعلیٰ کی روایت لیتے ہیں اور ان کے نزدیک سارے صحابہ اعلیٰ ہیں اور اس لیے ان سب کی روایات مقبول ہیں۔

آخر میں گذارش ہے کہ آپ کے دوست کے غور وفکر کے لیے چند اشارات پیش کر دیے ہیں۔ اگر وہ خالی الذہن ہو کر آخرت میں جواب دہی کے احساس سے ان کی روشنی میں سوچ بچار کریں گے تو ان شاء اللہ انھیں اطمینان ہو جائے گا۔ اللہ کرے وہ مطمئن ہو جائیں اور گوہرِ مقصود کو پا لینے کی سعادت سے سرفراز ہوں۔ (آمین)

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۸۵ء)

جہاد

جہاد کے اساسیات

سوال: گذشتہ دنوں ایک کیسٹ سننے کو ملی جس میں کہا گیا ہے کہ جہاد بغیر اقتدار کے نہیں ہوسکتا۔ جہاد کے لیے اقتدار لازمی شرط ہے۔ اقتدار کے بغیر جہاد نہیں فساد ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح دی گئی کہ مکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کے ساتھیوں پر ظلم ہوتے رہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کا حکم نہیں دیا۔ البتہ مدینے جا کر جب حکومت بنالی اور اقتدار مل گیا تب جہاد کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پوری قوم تھی لیکن انھوں نے فرعون کے خلاف جہاد کا اعلان نہیں کیا بلکہ سیاسی طور پر اپنے مطالبات اس کے سامنے رکھے اور منوائے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا دیا گیا لیکن انھوں نے جہاد کے لیے نہیں پکارا۔ موجودہ دور میں افغانستان کی مثال ہے کہ جب تک حکومتِ پاکستان اس جہاد کی پشت پناہی کرتی رہی، اس کے ثمرات اچھے تھے لیکن جب حکومتِ پاکستان نے اس کی پشت پناہی چھوڑ دی تو وہ فساد بن گیا۔ اسی طرح جہادِ کشمیر اور جہادِ فلسطین ہے۔ وہاں جو اتنے لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے، عورتوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، یہ سب اسی وجہ سے ہے کہ جہاد کی پہلی شرط یعنی 'اقتدار' پوری نہیں کی گئی۔ آپ سے گزارش ہے کہ رہنمائی فرمائیں تاکہ ذہن مطمئن ہو سکے۔

جواب: اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ان بنیادوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن پر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا مدار ہے۔ اگر وہ بنیادیں پائی جائیں تو جہاد نہ صرف جائز بلکہ فرض شمار ہوتا ہے اور نہ پائی جائیں تو جہاد شرائط پورا کرنے تک ملتوی ہوتا ہے۔ وہ بنیادیں درج ذیل ہیں:

۱- جہاد اور قتال فی سبیل اللہ بلاشبہ اس لیے ہوتا ہے کہ انسانوں کے 'تشریعی اقتدار' کو ختم

کر کے اللہ تعالیٰ کا تشریعی اقتدار قائم کیا جائے۔لہٰذا یہ جہاد اور قتال فی سبیل اللہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ساری رُوے زمین پر اللہ تعالیٰ کا اقتدار قائم نہ کر دیا جائے۔

۲- جہاد کا مقصد جب اللہ کا تشریعی اقتدار قائم کرنا ہے تو پھر ضروری ہے کہ یہ جہاد وقتال وہ شخص یا گروہ کرے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے تشریعی اقتدار کو قائم کرنے کے لیے نامزد کیا ہو اور اس کے اقتدار کو اپنا اقتدار قرار دیا ہو۔

۳- وہ شخص نبی اور اس کے امتی ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اپنا اقتدار زمین پر قائم کرتا ہے۔وہ اپنا حکم نہیں بلکہ اللہ کا حکم چلاتے ہیں اور کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کرتے اور نہ کوئی ایسا قدم اٹھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف ہو۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی، رسول اور حکمران ہیں اور آپؐ کے بعد آپ کی امت آپ کی نائب ہے۔اس امت کو آپؐ کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔یہ امت جہاد کرے گی تا آں کہ ساری رُوے زمین پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو سمیٹا تو میں نے اس کے مشرقوں اور مغربوں کو دیکھا اور میری امت کا اقتدار ان تمام حصوں تک پہنچے گا جو مجھے سمیٹ کر دکھائے گئے (یعنی ساری رُوے زمین تک، کہ سب آپ کو دکھائی گئی)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جوامع الکلم (کتاب وسنت) کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور میری مدد رعب سے کی گئی ہے۔میں سویا تھا کہ اس دوران میں مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے اور تم لوگ (یعنی مسلمان) ان خزانوں کو نکال رہے ہو۔(بخاری)

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کا جو اقتدار دیا گیا ہے حضرت ابو ہریرہؓ کے دور میں صحابۂ کرامؓ کے ذریعے منزل کی طرف بڑھنا شروع ہوا تھا اور قیامت سے پہلے نزولِ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے دور میں پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔

ان اصولوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ جہاد فرض ہے اور اس فرض کو عملی جامہ پہنایا جائے گا تاکہ اس کے نتیجے میں کفر اور کفار کا اقتدار ختم ہو اور اسلام اور مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، چاہے جہاد کرنے والے حکمران ہوں یا نہ ہوں۔ لہٰذا نہ صرف کشمیر و فلسطین کی آزادی بلکہ ساری دنیا کو عملاً اسلام کے لیے مسخر کرنے کی خاطر جہاد فرض ہے۔ یہ کہنا کہ جہاد کے لیے جہاد کرنے والے کا برسر اقتدار ہونا ضروری ہے، ایک لغو، لایعنی اور تاریخِ اسلام سے ناواقفیت پر مبنی بات ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مقابلے میں اس لیے قتال نہیں کیا کہ بنی اسرائیل ابھی قتال کے قابل نہ ہوئے تھے بلکہ انھیں جب قتال کا حکم دیا گیا تو انھوں نے جواب دیا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (المائدہ ۵:۲۴) [آپ اور آپ کا رب جا کر لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔]

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو رَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ (آل عمران ۳:۴۹) [یعنی بنی اسرائیل کی طرف بھیجے جانے والے رسول] تھے [جو درحقیقت بگڑے ہوئے مسلمان تھے] اور مسلمانوں کے لیے آنے والا رسول گمراہ مسلمانوں سے قتال نہیں کیا کرتا، جیسے کہ آج کل مسلمان ممالک میں۔ مسلمانوں میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے انقلاب برپا کیا جائے گا، قتال کے ذریعے نہیں، الا یہ کہ الجزائر کی طرح لوگوں پر تلوار سونت لی جائے تو پھر انھیں دفاع کا حق حاصل ہوگا اور وہ جواباً اپنی حفاظت کی خاطر ظالم گروہ کے خلاف تلوار اٹھا سکیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ کہنا کہ انھیں سولی پر چڑھایا گیا۔ قرآن پاک کی نصِ صریح وَمَا صَلَبُوْهُ (النساء ۴:۱۵۷) [انھوں نے اسے سولی پر نہیں لٹکایا] کے خلاف ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کے علاوہ یہودیوں کی تائید ہے۔ اللہ اس قسم کی ناپاک جسارت سے اپنی پناہ میں رکھے۔

مکہ میں جہاد و قتال اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہاں معاشرہ مخلوط تھا، مسلمانوں اور کفار کی آبادی علیحدہ نہ تھی۔ ایک ہی گھر میں ایک شخص مسلمان اور دوسرا کافر تھا، ایسی صورت میں اگر جنگ کا حکم

ہوتا تو تحریک کو کچل کر رکھ دیا جاتا، اس کا نام ونشان ختم ہو جاتا اور اسلام اور مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ ختم ہو کر رہ جاتی۔ وہ اخلاقی خوبیاں جن کی بنا پر کسی تحریک، جماعت اور قوم کی قدر و منزلت قائم ہوتی ہے وہ بھی پامال ہوتیں اور تحریک میں کشش باقی نہ رہتی۔ وہ بنیادی اخلاق اور خوبیاں، جن کی وجہ سے تحریک میں کشش تھی، یہ تھیں کہ انسانوں کو ان کا حقیقی مقام دلوایا جائے، ظلم کا خاتمہ ہو، یتیموں کی خدمت، بیواؤں کی اعانت اور مسکینوں کی دیکھ بھال کی جاسکے، بے سہارا لوگوں کو سہارا ملے اور صلہ رحمی، مہمان نوازی، سچائی، پاک دامنی اور عدل وانصاف کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مکہ میں اگر جنگ برپا ہوتی تو پھر دنیا کے سامنے تحریک کا جو نقشہ آتا وہ کیا ہوتا؟ ہرقل کے دربار میں جب ابوسفیانؓ سے پوچھا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا: یَـاْمُـرُنَـا بِالصِّدْقِ وَالصَّلٰوةِ وَالْعَفَافِ (وہ ہمیں سچائی، نماز اور پاک دامنی کا حکم دیتے ہیں) مکہ میں اگر جنگ ہوتی تو پھر یہ جواب ہوسکتا تھا؟

اگر معاشرہ مخلوط نہ ہو تو بغیر اقتدار کے بھی جہاد کیا جائے گا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بغیر اقتدار کے لوگوں نے جہاد کیا لیکن آپ نے اسے فساد قرار نہیں دیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ابوبصیر اور ان کے ساتھی اس نوع کی آزمایش سے دوچار ہوئے کہ وہ نہ مکہ میں رہ سکتے تھے اور نہ مدینہ کی اسلامی حکومت انھیں قبول کرسکتی تھی۔ ایسی صورت میں انھوں نے ساحل سمندر کے کنارے اپنا الگ مرکز قائم کیا جہاں سے وہ جہاد کرتے رہے تا آں کہ مشرکینِ قریش صلحِ حدیبیہ میں عائد کردہ اس شرط کو واپس لینے پر مجبور ہوگئے، جس میں یہ ذکر تھا کہ جو مسلمان ہو کر مدینے جائے گا اسے ہمارے پاس واپس بھیجیں گے۔

ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں نے جو جہاد کیا اس کے جائز ہونے میں تو کوئی شبہہ نہیں۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا ان کے پاس حکومت تھی؟ کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ قریش کے مقابلے میں ایک تیسری حکومت قائم کر رہے تھے؟ اگر نہیں تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جہاد کو فساد قرار دیا؟ ظاہر ہے کہ ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

اور صحابہ کرامؓ کی دلی ہمدردیاں ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ تھیں لیکن صلحِ حدیبیہ کی رُو سے آپ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں نے جہاد کا سلسلہ جاری رکھا کیونکہ وہ کفار کو اس طرح نشانہ بنانے کی پوزیشن میں تھے کہ اس کی زد میں کوئی بے گناہ مسلمان نہ آئے، کفار کو نقصان پہنچے اور وہ پریشان اور کمزور ہوں۔ ان کا یہ مقصد پورا ہو گیا اور کفارِ قریش نے مجبور ہو کر صلحِ حدیبیہ کی اس شرط کو، جو انھوں نے لگائی تھی، از خود ختم کرنے کی درخواست کی۔ اس سے ہمیشہ کے لیے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسلمان کفار کی طرف سے کسی مشکل میں پھنس جائیں اور مسلمان حکومتیں ان کی مدد نہ کر سکیں تو وہ اپنی مشکل کو حل کرنے کے لیے کفار کے خلاف وقت اور حالات کی مناسبت سے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں حتیٰ کہ مسلح جہاد بھی کر سکتے ہیں۔ اس جہاد میں صرف ایک ہی شرط ہے کہ اس کے نتیجے میں ایسے لوگوں کی خونریزی نہ ہو جو کفار کے ظلم و جبر میں شریک اور ان کے حامی و مددگار نہ ہوں۔ صادق الایمان لوگوں کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ سورۂ فتح میں ہے: لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (الفتح ۴۸: ۲۵) اور اگر مکہ میں اہل ایمان نہ ہوتے تو کافروں کو ہم دردناک سزا دیتے۔

افغانستان، کشمیر، فلسطین، بوسنیا، اراکان میں جو جہاد ہوا ہے یا ہو رہا ہے، اس کے بارے میں مذکورہ تمام بنیادیں تقاضا کرتی ہیں کہ کفار کے زیرِ قبضہ ممالک میں جاری جہاد صحیح ہو۔

نفیرِ عام

اللہ تعالیٰ ہمارے فقہا کو جزائے خیر دے۔ انھوں نے کسی بھی معاملے میں خلا نہیں چھوڑا۔ تمام فقہائے اسلام نے بالاتفاق فتویٰ جاری کر دیا ہے کہ جو علاقہ ایک مرتبہ دارالاسلام بن گیا ہو اور اس کے بعد کفار اس پر چڑھائی کر لیں تو علاقے کے تمام لوگوں، مردوں اور عورتوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مقابلے کے لیے کافی نہ ہوں تو پھر ساتھ والوں پر بھی یہ جہاد فرض ہو جاتا ہے اور اس طرح سے اگر سارے عالم اسلام کی فوج اور افراد اور مادی قوت کے بغیر دفاع ممکن نہ ہو تو سارے عالم اسلام پر اس ملک کا دفاع فرض ہو جاتا ہے۔ اگر کفار کسی مسلم علاقے پر غاصبانہ قبضہ کر لیں تو پھر

آزادی حاصل کرنے کے لیے اسی ترتیب سے جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ قرآن وحدیث اور فقہی مصادر کے حوالے سے ارشاد فرماتے ہیں:

یہ حفاظتِ دین اور مدافعتِ دیارِ اسلام کا حکم ایسا سخت ہے کہ جب کوئی حاکمِ وقت اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لیے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر فرضِ عین ہو جاتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلے میں نکل آئیں اور جب تک اسلام اور اسلامی نظام کو اس خطرے سے محفوظ نہ کرلیں اس وقت تک چین نہ لیں۔ چنانچہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن دارالاسلام پر حملہ آور ہو تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فرض ایسی قطعیت کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے جیسے نماز اور روزہ۔ فقہ کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں لکھا ہے: مگر جب اعلان عام ہو جائے کہ دشمن نے ایک اسلامی ملک پر حملہ کر دیا ہے تو پھر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو فرداً فرداً اس کی فرضیت عائد ہوتی ہے۔ نفیرِ عام ہونے کے بعد تو ادائے فرض کا حق بغیر اس کے پورا ہوتا ہی نہیں کہ سب کے سب جہاد کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت وہ سب مسلمانوں پر فرضِ عین ہو جاتا ہے جیسے روزہ اور نماز۔ پس غلام کو بغیر آقا کی اجازت کے اور عورت کو بغیر اپنے شوہر کی اجازت کے نکلنا چاہیے کیونکہ ان عبادات میں جو فرضِ عین ہیں، غلام اور بیوی، آقا اور شوہر کی خدمات سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح بیٹے کے لیے مباح ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر والدین کی اجازت کے نکل کھڑا ہو کیونکہ نماز جیسی فرض عبادات میں ان پر والدین کا حق اثر انداز نہیں ہو سکتا۔[1]

بدائع الصنائع کی عبارت میں بِأَنْ هَجَمَ الْعَدُوُّ عَلٰى بَلَدٍ کے الفاظ صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ یہ فرضیتِ عینیہ صرف اسی صورت پر موقوف نہیں ہے کہ خاص مذہبی جذبے سے متاثر ہو کر کوئی قوم اسلام کو مٹا دینے پر آمادہ ہو جائے بلکہ حکومتِ اسلامیہ اور دیارِ اسلام پر غاصبانہ حملے کے مقابلے میں مدافعت اسی قطعیت کے ساتھ فرض ہے۔ اسلام میں مسلمانوں کی زندگی کے لیے حریت واستقلال سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ اپنی آزادی کھو دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں میں انسانیت کی اس اعلیٰ خدمت کو ادا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی جسے ادا کرنے کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں بلکہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم رکھنے کے قابل بھی نہیں رہتے

۱- تفہیم القرآن، جلد۲، ص۹۸۔

جس پر ان کی مذہبی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت اور اسلامی قومیت پر حملہ کرنا دراصل عینِ اسلام پر حملہ کرنا ہے اور خواہ کسی دشمن کا مقصد اسلام کو مٹانے کا نہ ہو، بلکہ محض مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی کو مٹانا ہو، تب بھی اس سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لیے ویسا ہی فرض ہوگا جیسا کہ اسلام کو مٹانے والے سے جنگ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے صرف اس شہر یا اس ملک ہی کے مسلمانوں پر دفاع کا فرض عائد نہیں کیا گیا جس پر حملہ کیا گیا ہو بلکہ اگر وہ اپنی مدافعت سے عاجز ہوں تو رُوے زمین کے تمام مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ ملک یا شہر کے مسلمانوں کو غلبۂ اعدا سے بچائیں، جیسا کہ صاحب بدائع الصنائع کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یَفْتَرِضُ عَلٰی کُلِّ وَاحِدٍ مِّنْ آحَادِ الْمُسْلِمِیْنَ اِذْ لَایَتَحَقَّقُ الْقِیَامُ بِہٖ اِلَّا بِالْکُلِّ یہ جہاد تمام مسلمانوں پر فرداً فرداً فرض ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا قیام تمام مسلمانوں کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں۔

صاحبِ نہایہ نے ذخیرہ سے اسی کی تفصیل ان الفاظ میں نقل کی ہے: پھر ان لوگوں پر جو اِن سے قریب ہوں، پھر ان پر جو اِن سے قریب ہوں یہاں تک کہ از شرق تا غرب تمام اہلِ اسلام پر اسی تدریج کے ساتھ فرض ہوتا چلا جاتا ہے۔

ان صورتوں کو نقل کرنے کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> اسلام میں دفاع کے اس اہم فرض کی جو حیثیت ہے اس کا اندازہ صرف اسی سے نہیں ہوتا کہ اسے ایک عبادت اور فرضِ عین کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کی فضیلت نماز روزے سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے بلکہ سورۂ توبہ کی ان آیات سے جو غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قوت اسلام اور مسلمانوں کے استقلالِ قومی کو مٹانے کے لیے حملہ آور ہو اور نفیرِ عام ہو جائے تو اس وقت یہ ایمان کے صدق و کذب کی کسوٹی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے متعلق جنھوں نے رومیوں کی زبردست طاقت و سلطنت کے مقابلے پر حفاظتِ اسلام کے لیے جنگ میں جانے سے جی چرایا تھا اور جن کی ایمانی کمزوری کو دیکھ کر آنحضرتؐ نے انھیں گھر بیٹھے رہنے کی اجازت دے دی تھی، یہ فرمایا گیا: اللہ تمھیں معاف کرے تم نے انھیں کیوں گھر بیٹھے رہنے کی اجازت دے دی، تمھیں چاہیے تھا کہ اجازت نہ دیتے تا کہ تم پر وہ لوگ بھی ظاہر ہو جاتے جو سچے ہیں اور ان کا حال بھی معلوم ہو جاتا جو جھوٹے ہیں، وہ لوگ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جنھیں یومِ قیامت کے آنے کا یقین ہے، تم

سے ہرگز رخصت نہ مانگیں گے کہ اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد نہ کریں۔ اللہ ان متقیوں سے خوب واقف ہے، یہ رخصت تو تم سے وہی لوگ طلب کریں گے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخرت کے آنے کا یقین، ان کے دلوں میں شک پڑ گیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔ (التوبہ ۹:۴۴-۵۴)[۱]

پس کشمیر اور دوسرے ممالک کو، جن پر کفار نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے، آزاد کروانا اولاً کشمیری مسلمانوں پر فرض ہے اس کے بعد پاکستان، اس کے بعد دوسرے ممالک اور ضرورت پڑے تو سارا عالمِ اسلام اس فریضے کا مکلّف ٹھہرتا ہے۔ اب اگر پاکستان اور عالمِ اسلام اپنی بزدلی، کمزوری، نااہلی اور حکمرانوں کی لادینیت کی وجہ سے کشمیر اور دوسرے مقبوضہ مسلمان ممالک کو آزاد کرانے کے لیے جہاد میں حصہ نہیں لیتے اور کشمیری مسلمان اپنے حالات کے مطابق جرات اور شجاعت اور شہادت کی داستانیں رقم کر رہے ہیں، تو لادین حکمرانوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر علم کے کچھ دعویدار لوگ ان کے جہاد کو فساد قرار دے رہے ہیں اور فقہاے اسلام کے مقابلے میں بلا علم و تحقیق جہاد کو فساد قرار دے کر مجاہدین کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہے ہیں۔

مسلمان ملک کی آزادی کے لیے جہاد کی ضرورت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی رہنمائی ملتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کیا گیا وہ بھی شہید ہے جو اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو گیا وہ بھی شہید ہے اور جو اپنے گھر کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کیا گیا تو وہ بھی شہید ہے۔ (کنز العمال)

جہادِ کشمیر کو فساد قرار دینے والوں سے پوچھیے کہ اگر ان کے گھر پر ڈاکو حملہ کر دیں، یا ان کے گھر پر غاصبانہ قبضہ کر لیں تو کیا گھر کے دفاع یا گھر کو ڈاکوؤں سے آزاد کرانے کے لیے طاقت استعمال کرنا فساد ہوگا؟ کیا صرف اسلام آباد کے قصرِ صدارت اور وزارت یا اسی طرح حکمرانی کے مناصب پر فائز لوگ ہی اپنے دفاع کا حق رکھتے ہیں یا ہر آدمی اپنے دفاع کا حق رکھتا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اپنے گھر کی حفاظت اور آزادی صرف اقتدار اور اہلِ اقتدار کا حق نہیں بلکہ ہر آدمی کا حق ہے۔ اس طرح ہر ملک کے باشندوں کا حق ہے کہ وہ اپنے ملک پر دوسروں کو قبضہ نہ کرنے دیں۔ کیا انگریزوں کے خلاف جہاد

۱- الجہاد فی الاسلام، ص ۶۱-۶۵۔

اور تحریکِ آزادی فساد تھا؟ برِّ صغیر کی تقسیم کی تو بنیاد ہی یہ اصول تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ مسلمانوں کے ہیں اور جن علاقوں کی اکثریت ہندو ہے، وہ ہندوؤں کے ہیں۔ بھارت نے اس اصول کو نظر انداز کر کے کشمیر پر طاقت کے ذریعے قبضہ کر لیا اور جب جہاد کے ذریعے اسے آزاد کرانے والے جہادی دستے سری نگر تک پہنچ گئے اور قریب تھا کہ کشمیر فتح ہو جاتا تو بھارت نے اقوامِ متحدہ کے ذریعے جنگ بند کروا دی۔ اقوامِ متحدہ نے قرارداد پاس کی کہ کشمیر میں اس کی زیرِ نگرانی رائے شماری ہو گی۔ بھارت نے اس قرارداد کو وقتی طور پر مان لیا، لیکن اس نے بتدریج اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھارت کا حصہ بنا لیا، اسے اٹوٹ انگ قرار دے دیا اور رائے شماری سے منکر ہو گیا۔ بھارت منکر ہے اور اقوامِ متحدہ منافقت کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے سوا کیا چارہ رَہ جاتا ہے کہ حق دار اپنے زور بازو سے اپنا حق حاصل کرے۔ ایسی صورت میں بھارت غاصب ممالک یا اقوامِ متحدہ کیا اخلاقی جواز رکھتے ہیں کہ وہ ان جہادی تحریکوں کی مخالفت کریں۔ اگر بھارت اور امریکہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر ناحق کو حق اور حق کو ناحق قرار دینے میں لگے ہوئے ہیں تو پھر مسلمانوں کے لیے اس کے سوا اور کون سی راہ ہے کہ وہ بھی طاقت کے استعمال کا راستہ اختیار کریں۔

حقِ آزادی کی حفاظت

اب تو ساری دنیا قوموں کے حق آزادی کو تسلیم کر رہی ہے اور اس کے لیے تحریک چلانے اور قوت استعمال کرنے کو جائز قرار دے رہی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ افغانستان نے روسی فوجوں کے غاصبانہ قبضے سے افغانستان کو آزاد کرانے کے لیے جہاد شروع کیا تو صرف دنیائے اسلام نہیں بلکہ ساری دنیا نے اس جہاد کو سراہا اور اس کی مالی اور اخلاقی مدد کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنی امت کے حق میں تین دعائیں کی ہیں جن میں سے دو قبول ہو گئیں اور ایک قبول نہ ہوئی۔ پہلی دعا یہ ہے کہ پروردگار! میری امت کو بھوک اور اسی طرح کی آفاتِ سماویہ کے ذریعے ہلاک نہ کرنا، اللہ نے میری یہ دعا قبول فرمائی۔ دوسری یہ کہ پروردگار! میری امت پر باہر کے دشمنوں کو مسلط نہ کرنا۔ میری یہ دعا بھی قبول ہوئی۔ تیسری دعا یہ کی

کہ پروردگار! وہ باہم دست وگریباں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے میری یہ دعا قبول نہ کی۔

جب آپ کی یہ دعا قبول ہوگئی کہ آپ کی امت پر ان کا دشمن مسلط نہ ہو، تو اس کی یہی صورت ہوگی کہ اولاً کفار مسلمان ملکوں پر قبضہ نہ کرسکیں گے۔ لیکن بالفرض قبضہ کرلیا تو اسے زیادہ عرصے تک قائم نہ رکھ سکیں گے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ مقبوضہ علاقوں کے مسلمان آزادی اور جہاد کی تحریکیں برپا کریں اور جان و مال کی قربانیاں دے کر آزادی حاصل کریں۔ اگر نیم ملا قسم کے لوگوں کے فتووں کی عمل داری ہوتی یا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا راج ہوتا تو پھر مسلمان انگریز اور ہندوؤں کے سایے تلے زندگی بسر کر رہے ہوتے اور غلامی کا طوق ان کی گردنوں کی زینت ہوتا۔ لیکن پہلے بھی اللہ کے فضل سے ایسا نہیں ہوا اور ان شاءاللہ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ پہلے بھی مسلمانوں نے جہاد کی آواز پر لبیک کہا اور آئندہ بھی لبیک کہتے رہیں گے تاآں کہ دنیا میں اسلام غالب ہوجائے اور اللہ کا دین ساری دنیا کا دین بن جائے۔

ان وجوہ سے جہاد کشمیر اور دوسری جہادی تحریکیں نہ صرف جائز ہیں بلکہ وہ اسلام اور اس دور کا تقاضا اور خصوصیت ہیں۔ اسے فساد قرار دینے والے لوگ اسلام اور اس تقاضے کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اپنی صلاحیتوں کو منفی کاموں کی بجائے مثبت طور پر استعمال کرنے کی توفیق دے اور کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی راہ سے ہٹ کر چلنے سے بچائے۔ (آمین)

(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۷ء)

عہدِ حاضر اور جہاد

سوال: موجودہ دور میں کفر کے ساتھ جنگ یعنی جہاد بالسیف کی کیا حیثیت ہے؟ کیا یہ ہر مسلمان پر فرض ہے؟ کیا جہاد اور قتال میں فرق ہے؟ کیا یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صرف غزوۂ تبوک کے موقع پر ہر فرد کے لیے نکلنا لازمی قرار دیا تھا؟ کیا عام حالات میں قتال فرضِ کفایہ ہے؟ کیا مقبوضہ کشمیر کا جہاد، جہاد فی سبیل اللہ ہے یا جہادِ حریت ہے؟

جواب: جن مسلمان ممالک پر کفار نے قبضہ کیا ہوا ہے، ان کو آزاد کرانے کے لیے قتال کی

ضرورت ہو، تو قتال فرض ہوگا۔ فقہا نے لکھا ہے کہ جو علاقہ ایک مرتبہ دارالاسلام بن چکا ہو، اگر کفار اس پر قبضہ کرلیں تو پھر اس کی آزادی کے لیے جتنی طاقت کی ضرورت ہو، اتنی فراہم کرنا فرض ہوگا۔ اگر مقامی لوگوں کی طاقت کافی نہ ہو تو ساتھ والوں پر فرض ہوگا کہ وہ اپنی طاقت اس میں شامل کریں۔ اگر وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے ساتھ والوں کے لیے طاقت فراہم کرنا ضروری ہوگا۔ علیٰ ہذاالقیاس، اگر دنیا بھر کے مسلمانوں کی طاقت کی ضرورت ہو تو سب پر فرض ہوگا کہ وہ اس جہاد میں اپنی طاقت کو شامل کریں۔ افرادی، مالی، زبانی، غرضیکہ جس قسم کی اعانت کی ضرورت ہو، اس کو فراہم کرنا فرض ہوگا۔

کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور اس طرح کے مسلمان ممالک کی آزادی کے لیے، جن پر کفار نے غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے، مذکورہ بالا اصول کے مطابق جہاد کرنا فرض ہے۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات تو واضح ہے کہ دنیا بھر کی مسلمان حکومتوں اور عوام پر فرض ہے کہ اس جہاد کو کامیاب بنانے کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں، کریں۔ اس جدوجہد کی حمایت، ان ممالک پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں سے تجارتی اور سفارتی تعلقات منقطع کرنا، مجاہدین کی مالی مدد کرنا، یہ صورتیں ایسی ہیں جن پر سب عمل کرسکتے ہیں۔ البتہ افرادی قوت، جو عملاً جہاد بالسیف کرے، اس کی ان ممالک کو ضرورت نہیں ہے۔ ان کی اپنی افرادی قوت اس کے لیے کافی ہے، اس لیے جسمانی طور پر اس جہاد میں شریک ہونا فرضِ عین نہیں ہے۔ لیکن جتنے افراد کی ان ممالک کو ضرورت ہو، اس قدر افرادان کو فراہم کرنا ضروری ہوگا۔ پس جسمانی طور پر شریک ہونا فرضِ کفایہ ہے۔ جس طرح غزوۂ تبوک میں تمام مسلمانوں کو شرکت کا حکم تھا اس طرح آج سب کو نکل کھڑا ہونے کا حکم نہیں ہے، نہ ہی اس پر عمل ممکن ہے۔ اس کی بجائے آج حکم یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو تنہا اور بے یارومددگار نہ چھوڑا جائے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم نہیں کرتا، اسے تنہا اور بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔ (بخاری، کتاب المظالم) جہاد باطل کو گرانے اور باطل کو مٹانے کے لیے تلوار اور اسلحے کے استعمال کا نام ہے۔ کشمیر اور چیچنیا کا جہاد، جہادِ حریت بھی ہے اور قتال فی سبیل اللہ بھی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان ان جہادوں کی حمایت کر کے اس جہاد میں شریک ہیں، لیکن قتال میں شریک نہیں ہیں۔ قتال میں صرف وہ لوگ

شریک ہیں جو محاذ پر پہنچ جائیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(ترجمان القرآن، اپریل ۲۰۰۰ء)

رکنِ اسلام

سوال: مسئلہ یہ درپیش ہے کہ دین اسلام کے ارکان پانچ ہیں یا چھے، دوسرے الفاظ میں جہاد دیگر ارکان کی مانند مستقل رکن ہے یا نہیں؟

جواب: حدیث شریف میں اسلام کے ارکان پانچ ذکر کیے گئے ہیں:

۱- اقرارِ شہادتین، ۲- اقامت صلوٰۃ، ۳- ایتاء زکوٰۃ، ۴- صوم رمضان اور ۵- حج بیت اللہ۔

ان پانچ کو اسلام کی بنیادیں قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اہم بنیادیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جہاد اور اسی طرح کے دوسرے اعمال اسلام کی بنا میں شامل نہیں ہیں۔ وہ بھی اسلام کی عمارت کا حصہ ہیں لیکن ان کی وہ حیثیت نہیں ہے جو ان پانچ ارکان کی ہے۔ جہاد میں وہ وسعت نہیں ہے جو اِن پانچوں کے اندر ہے۔ یہ پانچ اپنے ساتھ سارے دین کو مع جہاد شامل ہیں اور جہاد ان سب کو یا ان سب کی طرح دین کے تمام شعبوں پر حاوی نہیں ہے۔

البتہ اس پہلو سے جہاد اہم ہے کہ جہاد کے ذریعے ان تمام کو قائم کیا جاتا ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں ایمان کے بعد جہاد کو سب سے افضل قرار دیا گیا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بخاری کی کتاب الایمان میں موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ایمان باللہ۔ سوال کیا گیا کہ اس کے بعد کون سا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔ سوال کیا گیا کہ اس کے بعد کون سا؟ آپؐ نے فرمایا: حج مبرور۔

اسی طرح ایک حدیث میں اسلام کے آٹھ حصے شمار کیے گئے ہیں۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۹۲ء)

☆......☆......☆

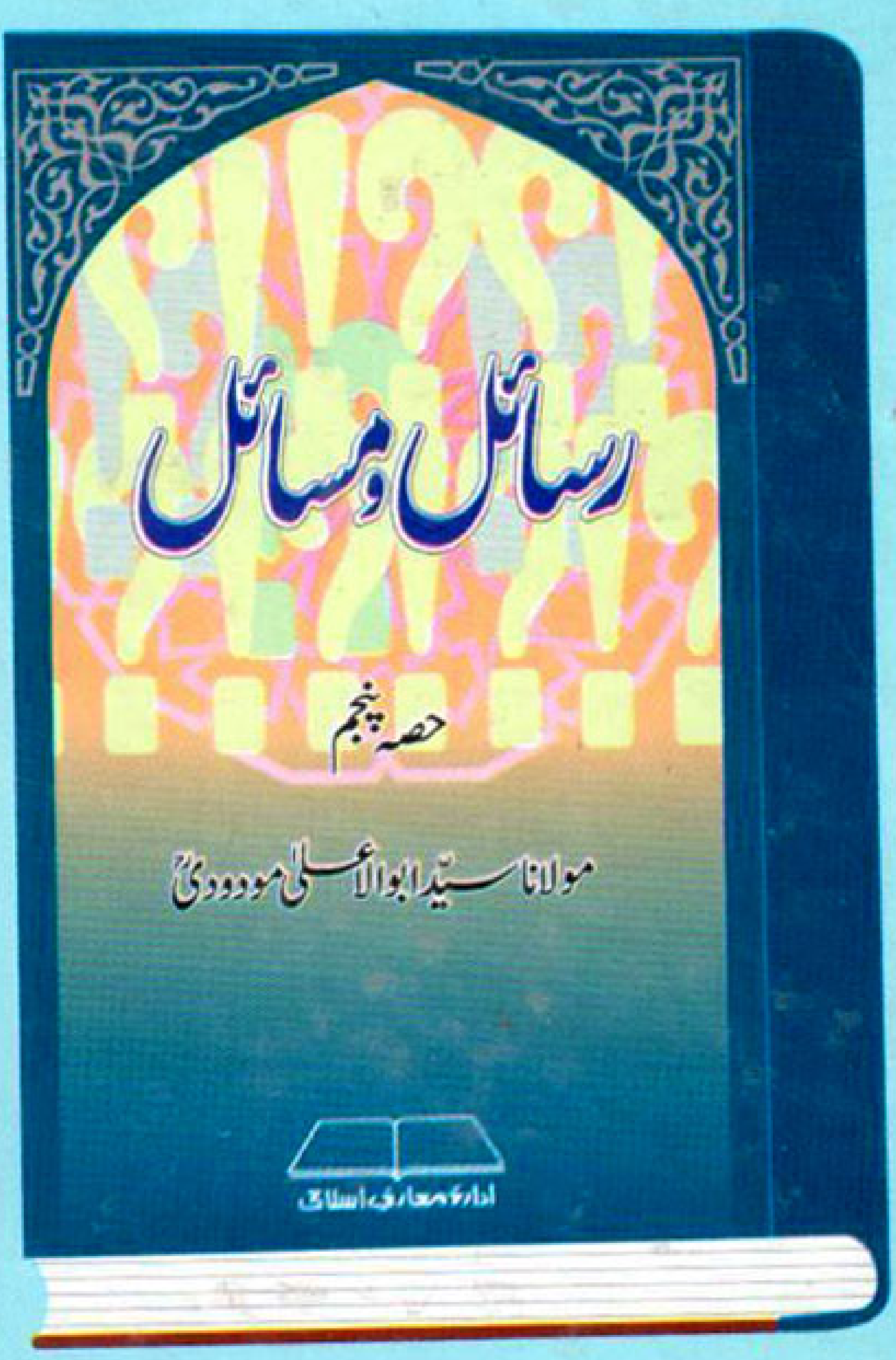

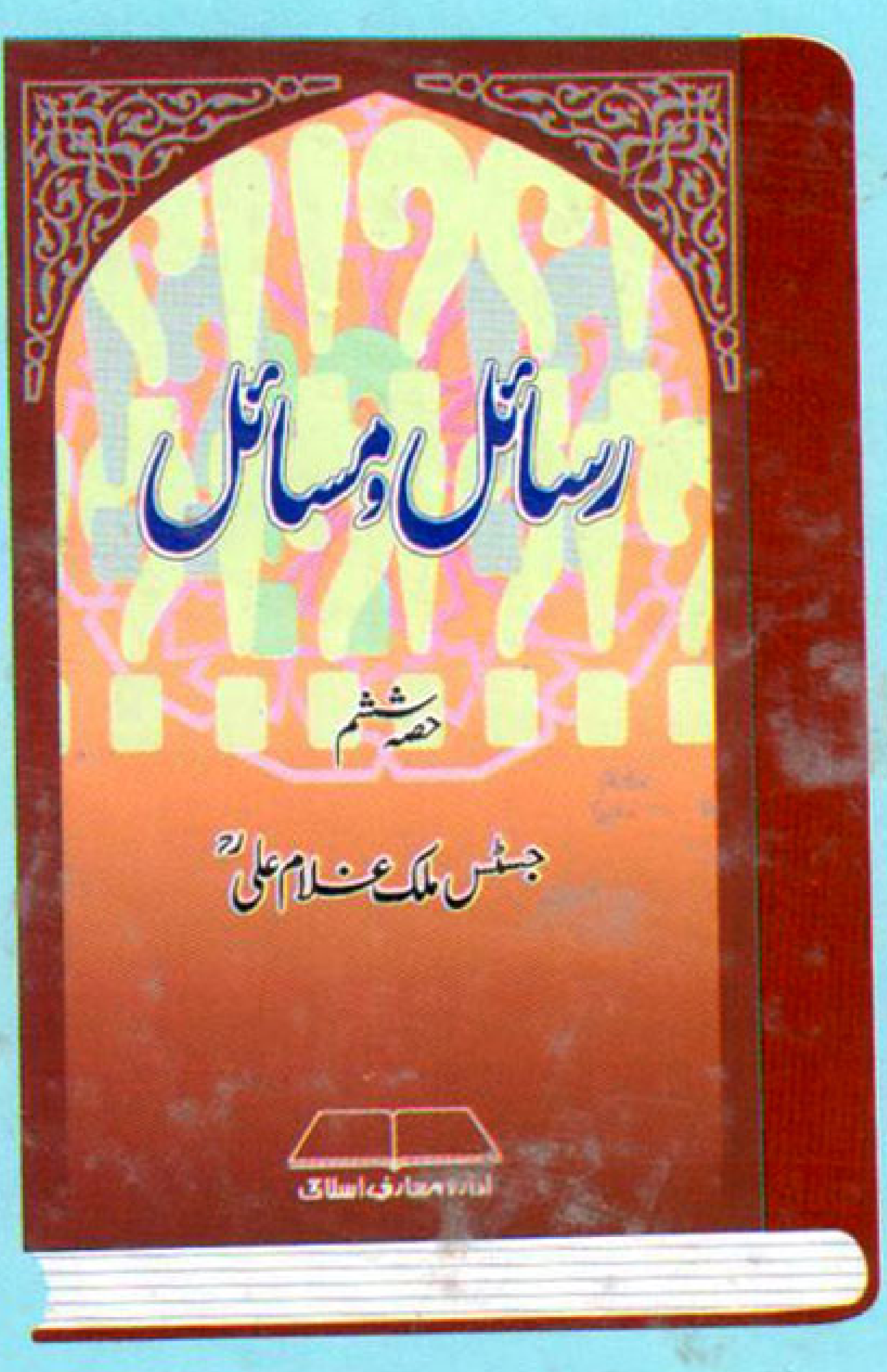

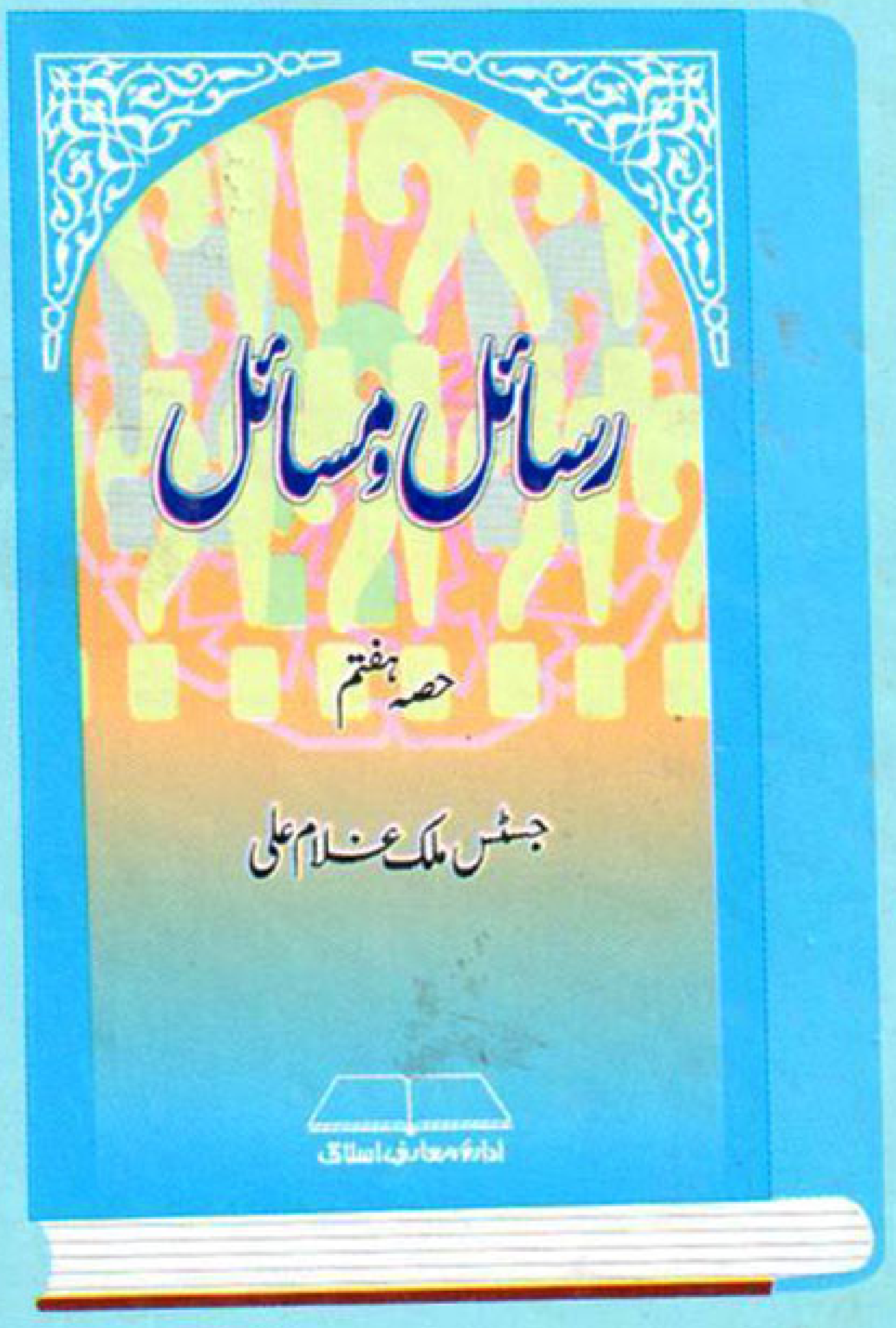

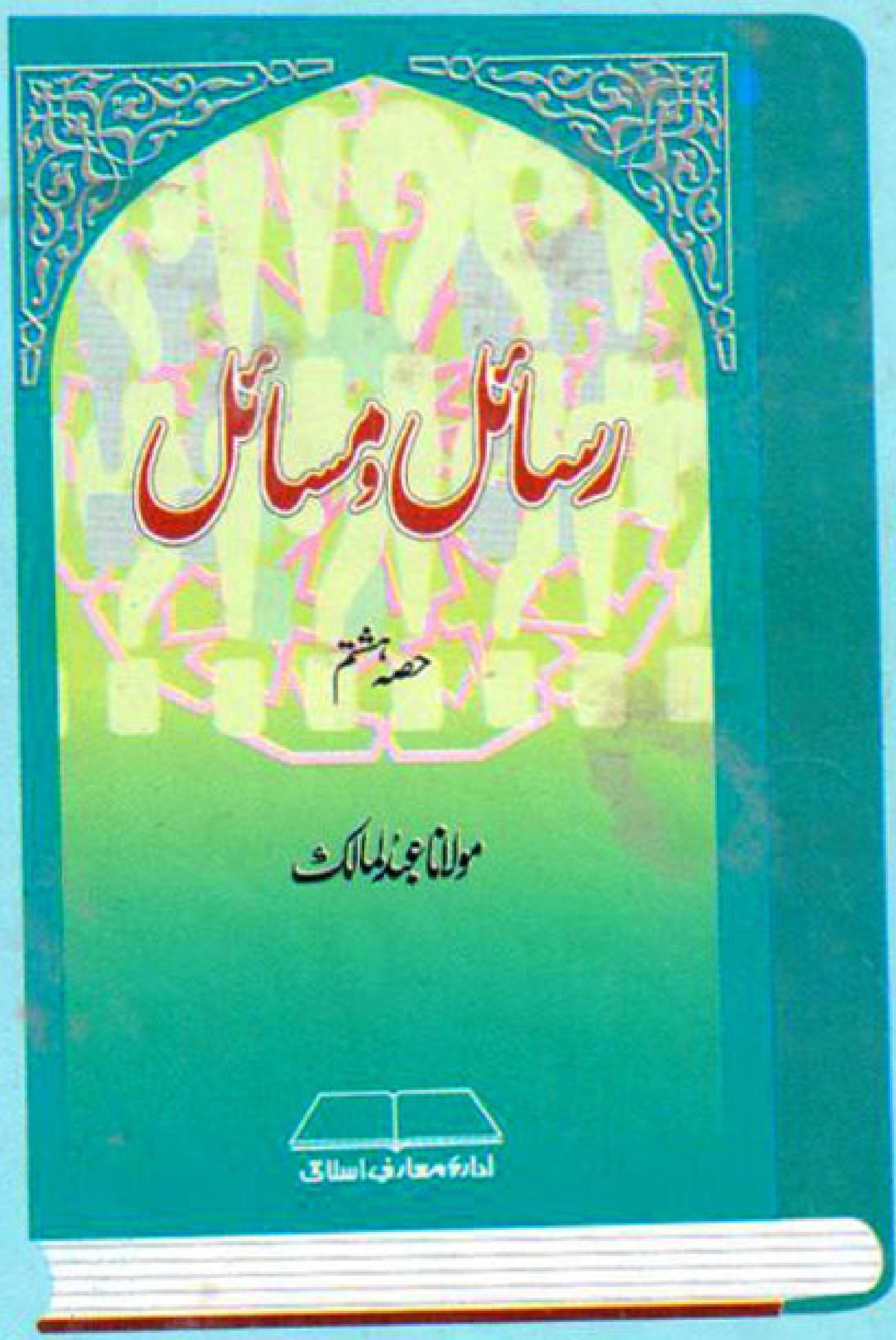

ادارہ معارف اسلامی
ادارہ معارف اسلامی
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور
فون: 35419520-4,35432476
www.imislami.org, e-mail: imislami1979@gmail.com